منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

(غالبؔ)

اقبالی بیان

اپریل ۱۹۷۱ء میں ''اقبال درونِ خانہ'' کی جلد اول حیات اقبال کے خانگی پہلو کی مستند تفصیلات کے ساتھ اشاعت پذیر ہوئی ...... ایک طویل وقفے کے بعد ''جلد دوم'' نذر قارئین کرتے ہوئے کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں کیونکہ میری دانست میں اس کا اہتمام یقیناً بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کوتاہی میں میرا قصور شاید اتنا نہیں جتنا کہ سمجھا جائے گا کیونکہ اس تمام عرصہ میں میری یہ دلی خواہش رہی کہ ان تمام واقعات کو جو ''جلد اول'' کے بعد میرے علم میں آئے جتنی جلد ممکن ہو آپ تک پہنچانے کا اہتمام کروں مگر یہ کسی طور بھی ممکن نہ ہو سکا اور یہ طویل عرصہ ریشمی دھاگوں کی مانند ہاتھوں سے پھسلتا ہی چلا گیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ نظام قدرت میں ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور اس وقت مقررہ سے پیشتر کسی بھی کام کو پایہ ٔ تکمیل تک پہنچانا کسی کے بس میں نہیں ......!

بہر کیف یہ امر باعث اطمینان ہے کہ آخر کار میں اپنی دیرینہ خواہش کو پایہ ٔ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو رہا ہوں اور ''اقبال درونِ خانہ'' کی جلد دوم آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔ یہاں یہ صراحت شاید ضروری ہو کہ اس حصہ میں وہ تمام واقعات بھی شامل کیے جا رہے ہیں جو میرے علم میں تو تھے مگر بوجوہ جلد اول میں ان کو شامل کرنا کسی طور ممکن نہ ہو سکا اور میرے خیال میں اتنا طویل عرصہ گزرنے کی اصل وجہ بھی شاید یہی ہو کہ ان میں سے بعض حقائق کے اظہار کا درست وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ دوسرے شاید اس وقت ان تمام واقعات اور انکشافات کو اس قدر ضروری بھی نہ سمجھا جاتا جو اس زیر نظر کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ کئی مفروضوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کریں گے جنہیں بڑے مکروہ انداز میں ہر جانب مشتہر کیا گیا ہے۔ ''اقبال درونِ خانہ'' کا پہلا حصہ جن دنوں ترتیب دیا گیا ان کج فہمیوں میں سے بیشتر کا وجود تک نہیں تھا مگر گزشتہ تیس برسوں میں اگر شناسان اور فدایان اقبالؒ نے بہت کام کیا ہے تو بد خواہان اقبال بھی کسی طور پیچھے نہیں رہے۔ اس لیے ایک لحاظ سے ''اقبال درونِ خانہ'' کے دوسرے حصہ کے منصۂ شہود پر آنے کا یہ درست ترین وقت ہے اور یقیناً اسی لیے قدرت نے ایسا انتظام فرمایا کہ اس سے پہلے اس کی

اشاعت کسی طرح ممکن نہ ہوئی۔

زیرِنظر کتاب میں مختلف مقامات پر آپ کو جو انکشافات پڑھنے کو ملیں گے' ان کے متعلق شاید اعتراض کیا جائے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد ایسے معاملات کو کیوں چھیڑا گیا جو طے شدہ تھے[1]۔ اس سے پیشتر بھی اس قسم کے اعتراضات

''اقبال درونِ خانہ'' کے حصہ اول میں شامل انکشافات کے ضمن میں کیے جا چکے ہیں کہ..... آخر اتنی دیر بعد کیوں ان امور کو چھیڑا گیا جو اب تک طے تھے اور ان کو اب خواہ مخواہ الجھا دیا گیا ہے[2]۔ میں اس قبیل کے اصحاب فہم کی خدمت

میں اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ایک غلط بات ایک طویل عرصے تک دہرائی جاتی رہے اور کوئی اس کی اصلاح کے لیے میسر نہ آئے تو کیا اسے ہمیشہ کے لیے سچ تسلیم کر لیا جانا چاہیے؟ یہاں ایک بار پھر وہی بات دہرانی پڑے گی کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اور اس وقت مقررہ سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جیسے ہی کسی غلط بیانی کی اصلیت کے اظہار کا وقت آتا ہے تو خداوند تعالیٰ کے اذن سے خود بخود ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں اور سچ کہنے کی ہمت اور توفیق ارزاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بے شمار نظریات و حکایات کی اصلاح صدیوں بعد عمل میں لائی گئی۔ اگر یہی سوچ لیا جاتا کہ چونکہ یہ امور ایک طویل عرصہ سے طے شدہ ہیں اس لیے ان کو نہیں چھیڑنا چاہیے تو بہت سے ایسے واقعات اور معاملات جن کی اصلاح مختلف ادوار میں ہوتی رہی' اپنی ابتدائی اور غلط صورت میں ہم پر مسلط ہوتے۔ جھوٹ خواہ کتنا ہی طویل عرصہ سچ کے چولے میں پوشیدہ رہنے کی سعی کرے' آخر کار اس کی اصلیت ظاہر ہو کر رہتی ہے کیونکہ یہی قانون قدرت ہے۔ قرآن حکیم میں اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ: ''اللہ باطل کو مٹاتا ہے اور اپنے اقوال کے ذریعے حق کو حق کر دکھاتا ہے''۔

(۲۴:۴۲)

اس لیے خدارا آنکھوں پر بندھی تعصب کی سیاہ پٹیاں کھولیے اور مثبت تحقیق کے راستے میں رکاوٹ بننا اب چھوڑ دیجیے کیونکہ آج کا کوئی معاشرہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر بند باندھنا ہی منتہائے نظر ہے تو اس تخریبی اور منفی سوچ کے سامنے بند باندھیے جو دینی' دنیاوی اور ادبی اقدار کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

روایتاً یہاں چند کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کیا جانا چاہیے' مثلاً زیرِنظر کتاب میں کئی ایک اقتباسات دوسری کتابوں سے شامل کیے گئے ہیں۔ ان کے مصنفین کا شکریہ' یا اپنے ان تمام دوست و احباب کا جو میرے لیے باعث تقویت

ہوئے...... مگر میری یہ تحریر نہ تو پیش لفظ کے زمرے میں آ رہی ہے اور نہ حرف آغاز ہی کے' چنانچہ اس فرض کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

البتہ آخر میں اس ذات گرامی قدر کا شکر ادا کرنا لازم جانتا ہوں جس نے دوسری بار مجھ ناچیز کو اپنے عظیم بزرگوں کے خلاف پھیلائے گئے غلط اور بے بنیاد الزامات کے رد کے لیے منتخب فرمایا۔ میں یقیناً اس قابل تو نہیں مگر اس کی نگاہ کرم میں کون کس مقام پر ہے' شاید کسی کے علم میں نہیں ......!

در رہِ عشق فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست
یدِ بیضائے کلیمے بسیا ہے بخشند
گاہ شاہی بجگر گوشہ سلطاں ندہند
گاہ باشد کہ بزندانیء چاہے بخشند!

(پیام مشرق)

خالد

صوفی منزل' سیالکوٹ

باب اول:

احوالِ روز و شب

(الف) اندرونِ خانہ

(ب) بیرونِ خانہ

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ!

(بالِ جبریل)

(الف) درونِ خانہ

۱۔ محترمہ وسیمہ مبارک دختر خواندۂ اقبال

۲۔ محترمہ کریم بی بی خواہر خورد

۳۔ محترم شیخ عطا محمد برادر بزرگ

۴۔ محترم نظیر احمد صوفی داماد برادر بزرگ و پور زادۂ خواہر بزرگ

۵۔ محترم عبدالغنی راٹھور بھاوجہ اقبال کے جڑواں بھائی

غلام نبی راٹھور (مرحوم) کے صاحبزادے

محترمہ وسیمہ مبارک ا۔ دخترِ خواندہ

"درونِ خانہ" کا حصہ اول جو اپریل ۱۹۷۱ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا زیادہ تر میری والدہ مرحومہ وسیمہ مبارک کی یادداشتوں پر مشتمل تھا۔ گو انہوں نے اپنی سی پوری کوشش فرمائی کہ لوحِ ذہن پر رقم تمام تر یادوں کو مجھ تک منتقل کر دیں مگر انسانی فطرت کے عین مطابق کچھ نہ کچھ باقی رہ ہی گیا۔ چنانچہ حصہ اول کی اشاعت کے بعد بھی اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی بات انہیں یاد آتی رہی ......شاید یادوں کے بحرِ زخار میں جو ہل چل ایک دفعہ پیدا ہوگئی تھی یہ اس کا فطری ردعمل تھا۔ چنانچہ اسے خوش قسمتی سے ہی تعبیر کیا جانا چاہئے کہ تہہ در تہہ پڑی ہوئی بے شمار یادوں میں سے کوئی فراموش کردہ واقعہ سر اٹھاتا یا کوئی ذو معنی بات یاد آ جاتی ......وقتاً فوقتاً یادوں کی گہرائیوں سے ابھرنے والے ان انمول موتیوں کو محفوظ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی گئی اور آج اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد جب ان جواہر پاروں کو یکجا کر رہا ہوں تو احساس ہو رہا ہے کہ ان کا محفوظ کیا جانا واقعتاً کس قدر ضروری تھا۔

میری والدہ ماجدہ ۲ فروری ۱۹۹۳ء میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ چنانچہ وہ "گنجینہ بے بہا" جس کی سنہری یادوں سے رو پہلے موتی چن چن کر آپ کی نذر کر تا رہا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھن گیا ......اور اب کوئی ایسا ذریعہ باقی نہیں رہا جو مجھے اس سعادت کے مزید قابل بنا سکے کہ اپنے عظیم بزرگوں کی یاد تازہ کر سکوں۔

اور

"پیامِ مشرق" میں "ساقی نامہ" کے درج ذیل شعر:

سرت گردم اے ساقی ماہ سیما

بیار از نیا گان ما یادگارے

جسے جلد اول کے انتساب میں اپنی والدہ ماجدہ کی نذر کیا تھا' آئندہ کبھی اپنے کسی بزرگ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکوں۔ اپنی اس تہی دامنی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ آخری ذخیرہ آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ اس کے بعد

شاید ہی کوئی ایسا واقعہ جو حضرت علامہ علیہ رحمۃ کی درون خانہ زندگی کے متعلق کسی نئے رخ سے روشنی ڈالتا ہو میرے علم میں آ سکے۔

مسجد اور کلیسا

حضرت علامہ علیہ رحمۃ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد (مرحوم) بڑی وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ ہمیشہ بڑا قیمتی اور جدید فیشن کے مطابق لباس زیب تن فرماتے۔ والدہ محترمہ بتاتی ہیں کہ "ایک دفعہ ابا جان (شیخ عطا محمد) نے اپنی کچھ پرانی پتلونیں، اقبال منزل کے بالمقابل ایک درزی خانہ میں مرمت وغیرہ کے لیے دے رکھی تھیں۔ یہ درزی خانہ خواجہ عبدالعزیز بٹ صاحب کا تھا جو کوچہ حسام الدین میں رہائش رکھتے تھے اور ابا جان کے ان کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ ہر روز بازار میں آتے جاتے بٹ صاحب کو یاد دہانی کرائی جاتی مگر بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود عدیم الفرصتی کی بنا پر یہ کام کافی عرصہ تک پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور بات آج کل پر اٹھتی رہی۔

"حسب معمول ایک روز بازار سے گزرتے ہوئے ابا جان نے بٹ صاحب کو یاد دہانی کروانے کی غرض سے دریافت فرمایا کہ ...... "بٹ صاحب! ان پتلونوں کا کچھ بنا؟" ان دنوں چچا جان (علامہ صاحب) بھی سیالکوٹ آئے ہوئے تھے اور اتفاق سے دونوں بھائی اس وقت اکٹھے کہیں سے آ رہے تھے۔ چچا جان نے ازراہ تجسس ابا جان سے پوچھا ...... "بھائی صاحب! کیا نئی پتلونیں سلوا رہے ہیں؟" ابا جان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ......

"نہیں نئی نہیں، چند استعمال شدہ بٹ صاحب کے حوالے کر رکھی ہیں کہ کاٹ چھانٹ کر ان کے پاجامے بنا دیں کہ سردیوں میں گھر پر استعمال ہو سکیں۔ مگر ایک طویل عرصہ گزر گیا ان کو فرصت ہی نصیب نہیں ہو رہی"۔

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے مزاج میں بذلہ سنجی کا عنصر چونکہ ہمیشہ سے ہی خاصا غالب تھا اور بات سے بات نکالنا ان پر ختم تھا۔ بعض اوقات تو بالکل معمولی سی بات کو ایسا بامعنی اور منفرد بنا دیتے کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے۔ چنانچہ بڑے بھائی سے پتلونوں کی مندرجہ بالا کیفیت سن کر ان کی رگ ظرافت پھڑکی اور انہوں نے مسکراتے ہوئے پتلونوں سے پاجامہ بنانے کے عمل کو تاریخی حیثیت دیتے ہوئے فرمایا۔

"بھائی صاحب! اس تاخیر میں دراصل بٹ صاحب کا قصور اتنا زیادہ نہیں جتنا آپ خیال فرما رہے ہیں۔ آپ نے انہیں کام ہی بڑا مشکل سپرد کیا ہے کہ اس میں وقت تو یقیناً کچھ زیادہ ہی صرف ہونا چاہئے ...... آخر "کلیسا" کو "مسجد"

میں تبدیل کرنا ہے''۔

توکل باللہ اور سیاہ صندوق

نانا جان قبلہ (حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ) انتہائی سادہ طبیعت کے مالک تھے اور انہیں دنیاداری اور ریاکاری سے بالکل سروکار نہیں تھا۔ بعض اوقات تو ان کی سادگی کی وجہ سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی کہ دوسرے گھبرا جاتے کہ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ مگر ان کا ایمان اس قدر پختہ تھا کہ ہمیشہ یہی فرماتے کہ جھوٹ کے کمزور اور بے بنیاد سہارے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان سچ کا مضبوط ہاتھ تھام لے اور انجام اللہ پر چھوڑ دے۔ کیونکہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے ہزار جھوٹ مزید گھڑنے پڑتے ہیں اور لازماً کہیں نہ کہیں چوک ہو جاتی ہے اور بیچ چوراہے میں بھانڈا پھوٹ جاتا ہے مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ آج جو حقیقت ہے وہ سو برس بعد بھی وہی ہے۔

اس سلسلے میں والدہ مرحومہ نانا جان قبلہ (علامہ صاحب) کی سادگی کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ کچھ اس طرح سنایا کرتی تھیں:

''ایک دفعہ موسم گرما کی تعطیلات میں ہم سب لاہور سے سیالکوٹ کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ سردار چچی جان نے جو سامان ساتھ لے جانے کے لیے تیار کیا' اس میں ایک سیاہ رنگ کا لوہے کا ٹرنک (صندوق) بھی تھا۔ اس میں چونکہ کچھ زیورات اور دوسری قیمتی اشیاء تھیں' اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر چچی جان نے چچا جان (علامہ صاحب) سے اس سیاہ صندوق کے متعلق تھوڑی احتیاط برتنے کے لیے کہہ دیا۔ بس اتنا بتانا غضب ہو گیا۔ چچا جان کو تو بس سیاہ صندوق کے سوا کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن کے لیے روانگی سے قبل ہی انہوں نے تمام ملازمین کو اس سیاہ صندوق کو بحفاظت سامان میں شامل کرنے کے متعلق خصوصی ہدایات جاری فرما دیں۔ جس وقت ہم لوگ ریلوے سٹیشن پہنچے' امتیاز بھائی سامان وغیرہ ریل میں رکھوا رہے تھے۔ چچا جان تھوڑے فاصلے پر کسی سے محو گفتگو تھے مگر ان کا دھیان یقیناً سیاہ صندوق میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی قلی نے متذکرہ صندوق ریل کے ڈبے میں رکھنے کے لیے اٹھایا' چچا جان نے وہیں سے امتیاز بھائی کو ہدایت دی...... ''امتیاز! اس صندوق کو ذرا احتیاط کے ساتھ نظروں کے سامنے رکھوانا''۔

ہم سب ایک دم گھبرا گئے۔ چچی جان کا رنگ تو مارے خوف کے بالکل فق ہو گیا اور ان کے لبوں سے ایک دم صرف اتنا

ہی نکلا کہ..... ''خدا خیر کرے یہ صندوق بخیریت منزل تک پہنچتا نظر نہیں آتا''۔ سارا راستہ سردار چچی جان زیر لب دعائیں مانگتی ہوئی آئیں۔ خدا خدا کرکے ہم بخیر و عافیت سیالکوٹ پہنچے۔ چچی جان نے گھر پہنچتے ہی شکرانے کے نوافل ادا کیے اور نیاز دلوائی۔

کچھ عرصہ بعد چچا جان سے اس واقعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے ہم سب کی اس وقت کی گھبراہٹ کو کوئی اہمیت ہی نہ دی اور بڑے اطمینان سے فرمایا کہ میں نے تو اسی وقت جب آپ نے مجھے سیاہ صندوق کا خیال رکھنے کے لیے کہا تھا' اسے اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور اس میں موجود تمام چیزیں چوروں پر حلال کر دی تھیں۔ اس کے بعد میری ذمہ داری ختم ہوگئی اور میں پوری طرح مطمئن رہا۔ اس کا خاص خیال رکھنے کے لیے ہدایات تو میں صرف آپ کی تسلی کے لیے دیتا رہا۔ ایک مسلمان کو تو بس یہی حکم ہے۔ ع

''بر توکل زانوئے اشتر بہ بند''

اور قرآن پاک میں تو یہاں تک ارشاد ہوتا ہے:

''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ٥'' (آل عمران' آیت ۱۵۹)

چنانچہ یہ عقدہ یوں کھلا کہ اس روز جسے ہم چچا جان کی سادگی سمجھ کر پورا راستہ ہلکان ہوتے رہے' وہ حقیقتاً ان کا توکل باللہ تھا جس کی بنا پر وہ دوران سفر رائی برابر پریشان و مضطرب نظر نہیں آئے۔

ہفت اقلیم کی دولت

نانا جان قبلہ (حضرت علامہ صاحب) اکثر و بیشتر سیالکوٹ کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ مگر موسم گرما کی تعطیلات میں جب عدالتیں وغیرہ بند ہو جاتیں تو سیالکوٹ تشریف لانا ان کا ہمیشہ کا معمول تھا۔ موسم گرما کی شدت سے بچنے کے لیے حسب معمول دوپہر کے وقت اقبال منزل کی منزل زیریں میں واقع دالان اور اس سے متصل وہ کوٹھری استعمال کی جاتی جو ان (علامہ صاحب) کی جائے پیدائش ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ شدید گرمی میں بھی وہ جگہ خاصی خنک ہوا کرتی تھی اور چھت سے لٹکتے ہوئے دستی پنکھوں کی ہلکی ہلکی ہوا گرمی سے جھلسے ہوئے انسانوں کے لیے واقعتاً جنت کا حکم رکھا کرتی تھی۔ ذاتی طور پر راقم الحروف خود اس کا بڑا خوشگوار تجربہ رکھتا ہے..... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب شدید گرمی سے بچنے کے لیے' دوپہر کے کھانے کے بعد سب ان خنک کمروں میں قیلولہ کے لیے یکجا ہوا کرتے تھے' تو

منزل بالا (یعنی اقبال منزل کی بالائی یا دوسری منزل) میں بجلی کے پنکھوں کی تیز اور گرم ہوا کے مقابلے میں یہ جگہ اس قدر خنک ہوا کرتی تھی کہ چھت گیر دستی پنکھوں کی ضرورت بھی کم ہی محسوس ہوا کرتی تھی۔

دراصل بڑے نانا جان (شیخ عطا محمد صاحب) نے اقبال منزل کے اس حصہ کو خاص مہارت سے تعمیر کروایا تھا کہ پچھلی طرف والی پرائیویٹ گلی کی جانب سے ہر وقت بڑی خنک اور تیز ہوا ان کمروں میں داخل ہوتی رہتی تھی اور گھٹن یا گرمی کا احساس بالکل نہیں ہوتا تھا۔ بچپن میں جون جولائی کی جھلسا دینے والی گرمی میں ہم سب بچوں کو اس جنت ارضی کا ادراک بالکل نہیں ہوتا تھا اور ہم سب کی یہی کوشش اور دلی خواہش ہوا کرتی تھی کہ خاص طور پر گرما کی طویل دوپہروں میں اقبال منزل کی دوسری منزل پر بازار کی جانب طویل راہداری میں اودھم مچاتے رہیں۔ گرم لو کے تھپیڑوں سے لبریز ان طویل دوپہروں میں جب سب لوگ زیریں منزل کے ان خنک کمروں میں قیلولہ فرمانے چلے جاتے اور صرف ''بڑے بھابھی جی[1]'' بالائی منزل میں تنہا ہوا کرتیں ...... گھٹنوں میں درد کی وجہ سے روزانہ سیڑھیاں اترنا چڑھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا ...... تو ہم سب بچے جب اکٹھے ہو کر دھما چوکڑی مچاتے تو ان کی مسلسل جھڑکیاں سننا پڑتیں کیونکہ ایک تو وہ بے چاری شدید گرمی کی وجہ سے پہلے ہی بے حد پریشان ہو رہی ہوتیں، دوسرے بچوں کا بے ہنگم شور ...... ان کا قیلولہ وغیرہ بالکل برباد ہو جاتا ...... اس وقت ہم سب بچے خاص طور پر ان کی ''میٹھی سونف'' پر حملہ آور ہوتے تھے، جو وہ بڑے اہتمام سے بنواتی تھیں اور شاید ہاضمہ کی درستی کے لیے تقریباً ہر کھانے کے بعد استعمال فرمایا کرتی تھیں۔ اس ''مٹھائی'' یعنی ''میٹھی سونف'' کو اڑانا ہم سب کا محبوب مشغلہ ہوا کرتا اور اسے بچوں کی دست برد سے محفوظ رکھنا بھابھی جی کے لیے بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتا۔ اس کے علاوہ وہ گلے کی خرابی کے لیے ''نوشادر'' کی چھوٹی چھوٹی گول ٹکیاں بھی اپنے پاس رکھا کرتی تھیں اور اکثر و بیشتر انہیں اپنی زبان پر گھستی رہتی تھیں۔ تمام بچوں کو بڑا تجسس رہتا کہ یہ کیا چیز ہے جسے بھابھی جی اس قدر رغبت سے چوستی ہیں۔ مگر وہ انہیں ہماری دسترس سے بہت دور اپنے خزانے والے سیاہ صندوق میں تالا لگا کر رکھتیں۔ مگر کبھی نہ کبھی ان پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل ہی جاتا۔ وہ اس قدر تیز قسم کی چیز ہوتی ہے کہ منہ میں ڈالتے ہی زبان جل جاتی ہے۔ مگر تجسس کے مارے ہوئے ہم سب بچے انہیں بتاشوں کی طرح چباتے اور بھابھی جی شور مچاتی رہ جاتیں۔ بھابھی جی کو شاید نمک کی کمی کی شکایت تھی کیونکہ وہ ان انتہائی تیز اور نمکین ٹکیوں کے علاوہ کھانے میں بھی بہت تیز نمک استعمال کرنے کی عادی تھیں۔ سالن

میں پورا نمک ہونے کے باوجود وہ مزید نمک اس میں شامل کیا کرتی تھیں۔ میں نے انہیں ہر لقمے میں باریک پسا ہوا نمک ملا ملا کر استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کے کھانے کے ساتھ ایک چھوٹی پیالی میں پسا ہوا نمک ضرور رکھا ہوتا تھا اور وہ خاص طور پر چاولوں کے ہر لقمے سے پہلے ایک چٹکی نمک اس پیالی سے ضرور شامل کیا کرتی تھیں۔

ان دنوں لوگ کھلی چھتوں پر گرما کی راتیں گزارا کرتے تھے۔ اقبال منزل کی کھلی چھت تیسری منزل پر تھی جو پورے علاقے میں سب سے بلند تھی۔ گو اس سے بھی اوپر چوباروں کی چھتیں بھی تھیں جو اس چھت سے بھی اونچائی پر تھیں مگر تقریباً سبھی لوگ یعنی پورا خاندان بڑی چھت پر شب باش ہونے ہی کو فوقیت دیتا...... تمام بستر بڑی ترتیب سے بہ لحاظ مراتب لگائے جاتے اور بازار کی جانب سے ایسی خوشگوار ہوا آیا کرتی کہ دل خوش ہو اٹھتا اور گرمی کا تمام احساس ختم ہو جاتا۔ خاص طور پر صبح کے وقت جب ''نسیم سحری'' چلتی تو سارے بدن میں گدگدی کا سا کیف و سرور بھر جاتا اور کس کافر کا جی بیدار ہونے کو چاہتا...... مجھے یاد ہے کہ جب تک سورج سوا نیزے پر نہ آ جاتا' اس فرحت بخش فضا کو چھوڑنے کو بالکل جی نہ کرتا۔

میری والدہ روایت کرتی ہیں کہ...... ''میاں جی (والد اقبال) اور ابا جی (برادر اقبال) کے بستر ہمیشہ بازار کی طرف والی چھت پر لگائے جاتے۔ موسم گرما کی تعطیلات میں جب چچا جان (علامہ صاحب) بھی تشریف لے آتے تو ان کا بستر بھی اسی چھت پر' میاں جی اور ابا جی کے درمیان بچھایا جاتا...... رات گئے تک وہ دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے...... مذہب' سیاست' گھریلو مسائل' بچوں کی شادی بیاہ کے فیصلے' اڑوس پڑوس کا ذکر' گلی محلے کی باتیں...... فجر کی نماز سے فراغت کے بعد' بازار کی طرف کے جنگلوں (جالیوں) میں سے آتی ہوئی فرحت بخش ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ پھر انہی سادہ اور دقیق مسائل پر گفتگو کیا کرتے...... میاں جی دنیا جہان کی باتیں چچا جان سے دریافت کیا کرتے اور وہ ہر بات کا تسلی بخش جواب دینے کی پوری کوشش کرتے۔ کسی وقت کوئی دینی مسئلہ اگر چچا جان' میاں جی سے پوچھتے تو وہ ہر بات وضاحت سے بیان فرماتے۔

موسم گرما کی ایک ایسی ہی شام کا ذکر ہے کہ چھت پر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا اور بستر بچھا دیئے گئے تھے لیکن تمام افراد خانہ ابھی نچلی منزل میں ہی تھے۔ البتہ چچا جان (علامہ صاحب) کسی کام کی وجہ سے ذرا جلد ہی چھت پر چلے آئے تھے اور ایک چارپائی پر نیم دراز آسمان میں محو پرواز کبوتروں اور ارد گرد اڑتی ہوئی رنگ برنگ پتنگوں کا نظارہ کر

رہے تھے۔اس وقت امتیاز بھائی جان! بھی جو پتنگ بازی کے بڑے شوقین تھے وہیں موجود تھے اور چچا جان کے

پاؤں داب رہے تھے۔امتیاز بھائی بتاتے ہیں کہ ...... "تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ ایک کٹی ہوئی پتنگ ہماری چھت پر سے ہچکولے کھاتی گزرتی ہوئی نظر آئی۔اب میں تو ہچکچا رہا تھا کہ چچا جان کی موجودگی میں اور پھر ان کے پاؤں چھوڑ کر کس طرح پتنگ پکڑنے کی کوشش کروں؟ شاید چچا جان نے میری بے بسی کو بھانپ لیا۔چنانچہ وہ ایک دم اچھل کر بستر سے اٹھے اور پتنگ کو پکڑنے کی کوشش کی مگر اتفاقاً پتنگ ذرا بلندی پر تھی اس لیے ہاتھ نہ آئی ......مگر آگے چوبارے کی چھت پر سے اسے یقیناً پکڑا جا سکتا تھا۔میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ چچا جان نے دوڑ لگا دی اور ایک ہی سانس میں چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ گئے ...... عام حالات میں وہ یقیناً یہ سیڑھیاں اتنی تیزی سے کبھی بھی نہیں چڑھ سکتے تھے کیونکہ یہ سیڑھیاں بے حد تنگ اور بالکل چھوٹی ہیں۔اوپر پہنچ کر چچا جان نے جھپٹ کر پتنگ پکڑ لی' چونکہ وہ کافی اونچائی پر تھی اس لیے اسے سیدھا کرنے لگے۔اتنے میں میں بھی اوپر پہنچ گیا اور انہوں نے ہنستے ہوئے ڈوری میرے ہاتھ میں تھما دی ......اس وقت میں نے محسوس کیا کہ چچا جان کی آنکھوں میں چمک اور ان کا خوشی اور جوش سے دمکتا چہرہ اس کا غماز تھا کہ جیسے 'ہفت اقلیم کی دولت' ان کے ہاتھ لگ گئی ہو"۔

کتنی عجیب بات ہے کہ معمولی سی خوشی اس عظیم انسان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی کہ جس کو چھپانا شاید ممکن نہ رہا اور اس کے برملا اظہار نے یہ ثابت کر دیا کہ علم کے بام عروج اور دنیاوی سربلندیوں پر پہنچ کر بھی کبھی نہ کبھی انسان ان اوج گاہوں سے نیچے اترنے کی سعی ضرور کرتا ہے کیونکہ جو سکون اور راحت' سادگی اور بے تکلفی کی فضا میں میسر آتی ہے وہ ملمع زدہ بناوٹی ماحول میں کہاں' جس میں سانس تک گھٹ جانے کا خوف ہو۔حکیم الامت علامہ علیہ الرحمۃ نے یقیناً اسی سے متاثر ہو کر فرمایا ہو گا ؎

علم کی سنجیدہ گفتاری' بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت' جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں' فکر سے آزاد ہیں

پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

(بانگ درا)

حکیم الامت بننے کا نسخہ

بعض لوگ ہر بات کی وجہ تسمیہ جاننے کے لاعلاج مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسروں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے راز جاننا اپنا پیدائشی حق تصور کرتے ہوئے ہر وقت اسی کھوج میں لگے رہتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے دوسروں کو مسرت ہو رہی ہے یا وہ کوفت کا شکار ہو رہے ہیں' انہیں کچھ اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو اس قبیل کے لوگ اس قدر باعث زحمت ثابت ہوتے ہیں کہ ان کی کم عقلی کے ماتم کے سوا کچھ اختیار میں نہیں رہتا۔ مگر بعض اوقات اس قسم کے لوگ خود ہی اپنی کسی ایسی بوالعجبی کی بنا پر ...... ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والی صورت حال کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔

میری والدہ مرحومہ اس سلسلے میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ اس طرح بیان فرمایا کرتی تھیں کہ ...... ''کو میری شادی ۱۹۳۴[1]ء میں ہو چکی تھی مگر ان دنوں میں لاہور چچا جان کے پاس گئی ہوئی تھی۔ دراصل سردار چچی جان (والدہ جاوید) کا انتقال ۱۹۳۵ء میں ہو چکا تھا' اس لیے سیالکوٹ سے کوئی نہ کوئی جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے جاوید منزل میں قیام کرتا تھا۔ وزیر آباد سے پھوپھی زینب صاحبہ بھی ان دنوں وہاں تھیں۔ چچا جان ان دنوں کافی علیل تھے ...... آواز تقریباً بند ہو چکی تھی اور بات چیت میں بڑی دقت محسوس ہوتی تھی۔ چچی جان کی جدائی اس پر مستزاد تھی۔ اس حادثہ جانکاہ نے تو انہیں بالکل ختم ہی کر دیا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں وہ بالکل بوڑھے ہو چکے تھے۔ میری شادی سے تھوڑا عرصہ قبل تک' جن دنوں میں یہاں لاہور میں مستقل رہا کرتی تھی اور سردار چچی جان بقید حیات تھیں ...... چچا جان کس قدر بذلہ سنج ہوا کرتے تھے ...... روتوں کو ہنسا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ...... مگر اب ان کی خوش مزاجی کو شاید کسی کی نظر لگ گئی تھی ...... گلا بند ہو جانے کی وجہ سے انہیں بولنے میں اس قدر دقت ہوتی تھی کہ ان کی یہ بے بسی سب کو خون کے آنسو رلاتی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے' پھوپھی زینب اور میں' جاوید منزل کے گول کمرے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ بانو!

پاس بیٹھی کھیل رہی تھی کہ چچا جان تشریف لے آئے اور خاموش بیٹھ کر بانو کو کھیلتا دیکھنے لگے۔ پھوپھی زینب نے ان کی پریشانی کو بھانپ لیا اور پوچھا' بھائی صاحب! آج آپ کچھ زیادہ پریشان نظر آرہے ہیں..... کیا بات ہے؟''

چچا جان تھوڑی دیر خاموش بیٹھے سوچتے رہے' پھر زیرلب مسکراتے ہوئے فرمایا..... ''ابھی ابھی ایک صاحب کو ایک نسخہ بتا کر آرہا ہوں..... خدا جانے وہ اسے سچ مان کر اس پر عمل کرتے ہیں یا مذاق میں اڑا دیتے ہیں!'' پھوپھی زینب بڑی متجسس ہوئیں اور پوچھا..... ''آخر وہ کون سا نسخہ ہے جس کا مذاق اڑا دیا جانا آپ کو اس قدر متفکر کیے دے رہا ہے؟''

چچا جان ہنس پڑے اور اپنے مخصوص انداز میں فرمایا..... ''دراصل آج مجھ سے ایک راز فاش کرنے کا جرم سرزد ہو گیا ہے۔ بہت کم احباب کو اس کا علم تھا مگر غلطی سے آج بھری محفل میں بات منہ سے نکل گئی کیونکہ ایک صاحب اس قدر بضد ہو رہے تھے کہ میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور اب پچھتاوا ہو رہا ہے''۔

اب پھوپھی زینب بھی ان کے پیچھے پڑ گئیں کہ ''آخر وہ کون سا راز ہے جس کو آپ آج تک چھپائے بیٹھے تھے' کچھ ہمیں بھی تو بتائیں کہ اس کے انشاء نے آپ کو کیوں پریشان کر دیا ہے؟'' چچا جان نے تفصیل سے بتاتے ہوئے فرمایا ..... ''آج ایک صاحب بھری محفل میں پوچھنے لگے ڈاکٹر صاحب! آپ حکیم الامت کس طرح بنے؟''

میں نے انہیں ادھر ادھر ٹالنا چاہا مگر وہ تو کسی طرح مان ہی نہیں رہے تھے۔ بس ایک ہی رٹ لگائے جا رہے تھے۔ کچھ لوگ زیادہ ہی بے تکلف ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آخر زچ ہو کر میں نے ان سے کہا ''یہ کوئی ایسا ناممکن کام نہیں' اگر لگن سچی ہو تو یہ مقام آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں''۔

حیرت سے ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور انہوں نے بڑے اشتیاق سے دریافت کیا۔ ''وہ کیسے؟'' ماحول ایسا بن گیا کہ مجھے بھی خود پر قابو نہ رہا اور پوری تفصیل بتاتا چلا گیا کہ میں نے اپنی زندگی میں کروڑ ہا بار درود! شریف کا ورد کیا ہے'

جس کے صلہ میں مجھے یہ مقام جناب باری سے ودیعت ہوا ہے۔ اگر آپ بھی خواہشمند ہیں تو اسی نسخے پر عمل پیرا ہو جائیں۔

''اب مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے اپنا راز فاش کر دیا۔ حالانکہ سوائے چند ایک مخصوص احباب کے اس سے پہلے کبھی کسی سے اس قسم کا ذکر نہیں آیا۔ محفل میں مختلف افراد بیٹھے تھے' کوئی اس

بات کو کس رنگ میں دیکھتا ہے' یہی سوچ طبیعت کی پریشانی کا باعث بن رہی ہے''۔

''چچا جان کی آواز جو پہلے ہی گلے کی خرابی کی وجہ سے بے حد نحیف ہو رہی تھی' شدت جذبات سے رندھ گئی اور انہیں بات پوری کرنا دشوار ہو گیا۔ وہ ہمیشہ کے بڑے رقیق القلب تھے' اور خاص طور پر نبی اکرمؐ کا ذکر مبارک تو ہمیشہ ہی انہیں رلا دیا کرتا تھا۔ عمر کے آخری حصہ میں تو ان کی طبیعت اس قدر گداز ہو گئی تھی کہ سرکار دو عالمؐ کا نام نامی سنتے ہی ان کی آنکھیں پرنم ہو جایا کرتیں۔ وہ بڑی دیر تک بت بنے وہیں خاموش بیٹھے رہے اور پھوپھی جان اور میں شدت جذبات سے رنگ بدلتا ہوا ان کا چہرہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی رہیں''۔

خدا جانے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو صرف افشائے راز نے پریشان اور پشیمان کر دیا تھا یا وہ مندرجہ ذیل صورتحال کی بنا پر متفکر تھے۔

سوز و گداز حالتے است! بادہ ز من طلب کنی

پیش تو گر بیاں کنم مستیء ایں مقام را

(زبور عجم)

دلگرفتہ کانفرنسیں

تقسیم ہند سے قبل حکومت برطانیہ نے متعدد بار لندن میں گول میز کانفرنسیں منعقد کیں جن میں ہندوستان کے مختلف نمائندوں کو مدعو کیا گیا تاکہ برصغیر کی آزادی اور دیگر متعلقہ امور کو باہمی رضامندی سے حل کر لیا جائے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے بھی دو بار ایسی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں آپ نے بڑا ابھر پور حصہ لیا اور اقلیتی امور کی کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے بڑے سرگرم رہے۔ مگر گاندھی جی اور ان کے چیلوں کی ہٹ دھرمی سے کسی متفقہ فیصلہ پر پہنچنا ناممکن ہو گیا تو علامہ صاحب نے دلبرداشتہ ہو کر معذرت کر لی اور کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی واپس روانہ ہو گئے۔

۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے آپ ایک بار پھر لندن گئے مگر حسب معمول یہ کانفرنس

بھی ..... نشستند و گفتند و برخاستند ہی ثابت ہوئی اور حضرت علامہ صاحب گزشتہ برس کی طرح مایوس اور دلگرفتہ واپس لوٹے۔

میری والدہ روایت کرتی ہیں کہ "چچا جان (علامہ صاحب) دونوں گول میز کانفرنسوں سے بالکل مایوس واپس آئے۔ وہ اکثر گھر میں بھی ان ناکام کانفرنسوں کا ذکر فرمایا کرتے۔ ان کا لہجہ اس وقت بے حد دکھی ہو جایا کرتا۔ انہیں سب سے زیادہ تکلیف وطن اور قوم کے نام نہاد رہنماؤں کے منافقانہ طرز عمل پر ہوتی تھی جو اپنے اپنے ذاتی مفادات کو ملک وملت پر ہمیشہ فوقیت دیتے تھے۔ جب بھی یہ موضوع زیر بحث آتا تو شدت جذبات سے ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور آواز بہت بلند ہو جاتی کیونکہ قوم کے ان رہنماؤں نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ ان کا تجزیہ فرماتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ..... "ہمارے اکثر لیڈر بڑی عجیب وغریب فطرت کے مالک ہیں۔ رات کو کچھ کہتے ہیں اور صبح بالکل اس کے برعکس رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ اگر رات کو قوم کے لیے جان کی بازی لگانے پر کمربستہ نظر آتے ہیں تو دوسری صبح اسی کا گلا کاٹنے پر تیار ہو جاتے ہیں"۔ والدہ محترمہ بتایا کرتی تھیں "چچا جان ان مفاد پرستوں کی ان حرکات سے اس قدر دلبرداشتہ تھے کہ جب بھی ان کا ذکر آتا تو ہمیشہ ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ "ناقابل اصلاح" فطرت کے مالک ہیں۔ لیکن چچا جان ہمیشہ اصلاح احوال کے لیے دعا ضرور فرماتے تھے"۔

مندرجہ ذیل شعر یقیناً انہی واقعات سے متاثر ہو کر کہا گیا ہوگا۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

(بال جبریل)

پردہ دار خواتین

نانا جان قبلہ (علامہ علیہ الرحمۃ) بڑی سختی سے پردہ کے قائل تھے۔ اس دور میں پردے کی پابندی بڑی سختی سے کی جاتی تھی اور مستورات کا برقعے کے بغیر گھروں سے نکلنے کا تو تصور بھی محال تھا۔ ان دنوں سیدھے برقعے کا رواج تھا۔ میں نے اپنے لڑکپن تک اپنے گھر کی تمام مستورات کو "لٹھے" کے بنے ہوئے سفید "شٹل کاک" برقعوں میں ملبوس دیکھا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ "عربی برقعہ" مروج ہوا جو سیاہ ریشمی کپڑے سے بنتا تھا اور وزن بھی اس کا نسبتاً اپنے پیشرو سے کافی ہلکا ہوتا تھا۔ بس یوں سمجھئے کہ بے چاری خواتین کی جان دو من کا بوجھ سر پر اٹھائے پھرنے سے بچ گئی اور صرف ایک چھٹانک کا برقعہ باقی رہ گیا اور وہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا۔

والدہ مرحومہ بتایا کرتی تھیں کہ...... "گھر سے باہر جانے کے لیے اس زمانے کے رواج کے مطابق پردے کا پوری طرح اہتمام کیا جاتا تھا۔ سفر میں اگر چچا جان بھی ہمراہ ہوتے تو انہیں سب سے زیادہ فکر ہمارے پردے کی رہتی تھی۔ لاہور میں کہیں آنے جانے کے لیے تانگے یا موٹر میں پردے کا پورا پورا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ جب کبھی ریل کا سفر درپیش ہوتا تو چچا جان بے حد فکر مند رہتے کہ کہیں بے پردگی نہ ہو جائے۔ کسی پارٹی وغیرہ میں کبھی بھی سردار چچی جان یا مجھے ساتھ لے کر نہیں گئے۔ ایک واقعہ اس سلسلے میں یاد آ رہا ہے کہ شاید سر شہاب الدین کے ہاں ایک دفعہ چچا جان کھانے کی دعوت پر گئے تو واپس آ کر سردار چچی جان کو خاص طور پر بتایا کہ "آج کی دعوت میں شہاب الدین صاحب نے سب کی بیگمات کو بھی مدعو کر رکھا تھا' چنانچہ جب سب لوگ کھانے کے لیے بیٹھے تو مجھے اکیلا دیکھ کر انہوں نے پوچھا "کیا آپ بیگم صاحبہ کو ساتھ نہیں لائے؟" میں نے جواب دیا کہ "وہ پردہ دار خاتون ہیں' مخلوط دعوتوں میں شریک نہیں ہوتیں"۔ اس پر لیڈی شہاب فرمانے لگیں کہ "اگر آپ ان کو لے آتے تو علیحدہ انتظام کیا جا سکتا تھا"۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ "یہ کسی طور ممکن نہیں' کیونکہ وہ کبھی بھی اس قسم کی دعوت میں شرکت پر رضامند نہیں ہوں گی اور دوسرے میں بھی اس کی اجازت نہیں دوں گا"۔

میری والدہ مزید بیان کرتی ہیں کہ...... "اسی طرح ایک بار چچا جان کو کسی دوسرے ملک میں حکومت کا نمائندہ مقرر کرنے کی تحریک ہوئی۔ اس وقت کے وائسرائے ہند نے بہ نفس نفیس چچا جان سے اس خواہش کا اظہار کیا مگر دوران

ملاقات جب یہ بات چچا جان کے علم میں آئی کہ وہاں انہیں اپنی بیگم کے ساتھ سرکاری تقریبات میں شمولیت کرنا ہو گی' تو انہوں نے اسی وقت معذرت کر لی اور وائسرائے ہند سے صاف صاف کہہ دیا کہ میری بیگم ایک پردہ دار خاتون ہیں لہٰذا یہ کسی طور ممکن نہیں' چنانچہ یہ تحریک دم توڑ گئی''۔!

میری والدہ محترمہ نانا جان کے سفر مدراس کا ایک واقعہ یوں بیان کیا کرتی تھیں:

''۱۹۲۹ء میں جب چچا جان مدراس گئے تو وہاں سے مراجعت کے بعد خاص طور پر انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ وہاں کے ایک بڑے مشہور رہنما کی صاحبزادی بھی اپنے والد کے ہمراہ ان سے خاص طور پر ملنے آئی تھی۔ وہ ان دنوں شاید کانونٹ میں پڑھتی تھی اور بلاتکلف انگریزی لباس یعنی سکرٹ وغیرہ پہنتی تھی اور چچا جان سے ملاقات کے لیے بھی انگریزی لباس پہن کر ہی آئی تھی۔ شاید اس کا خیال ہوگا کہ وہ چونکہ انگلستان کے تعلیم یافتہ ہیں اس لیے ماڈرن خیالات کے مالک ہوں گے۔ مگر سب سے پہلے تو اسے اسی پر حیرت ہوئی کہ چچا جان سوٹ اور ٹکٹائی کی بجائے مشرقی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے اور اس نے اپنی اس حیرت کا اظہار ان کے سامنے ہی کر بھی دیا۔ چچا جان نے بتایا کہ اس کے بعد خدا معلوم اسے کیا خیال آیا کہ بڑی بے تکلفی سے پوچھنے لگی کہ..... ''ڈاکٹر صاحب! اگر کبھی میں آپ کی بیٹی ہوتی تو کیسا ہوتا؟'' چچا جان نے جو اس کی بے باکی اور بے حجابی سے پہلے ہی منغض بیٹھے تھے' ایک دم جواب دیا کہ..... ''اگر ایسا ہوتا تو آپ اس وقت اس طرح بے پردہ اور ایسے مختصر لباس میں میرے پاس نہ بیٹھی ہوتیں''۔ چچا جان فرماتے ہیں کہ میرے اس جواب نے اسے قدرے محجوب سا کر دیا اور وہ ایک طرف خاموش بیٹھ گئی۔ میں نے سوچا چلیں اس طرح کچھ حجاب تو اس میں بھی پیدا ہو ہی گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان محترمہ کا نام نامی بھی ''حجاب'' تھا۔ اس دوران دوسرے حاضرین سے گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بے چاری بالکل خاموش بیٹھی ہے' چنانچہ بچی کی دلجوئی کے لیے میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کبھی لاہور آنے کی دعوت دی اور کہا کہ جب آپ وہاں مجھ سے ملنے آئیں گی تو میں آپ کی ملاقات اپنی بیٹی سے کرواؤں گا تب آپ کو معلوم ہوگا کہ میری بیٹی بننا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ پھر اپنی پرانی حالت میں آ گئی اور لاہور آنے کے لیے اسی وقت تیار ہو گئی''۔

ان دنوں پردے کی اس قدر سختی ہوتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو برقع اوڑھا دیا جاتا اور برقع بھی سفید لٹھے کا بنا ہوا۔

یعنی سیدھا ''شٹل کاک'' برقع جس کے اوپر ٹوپی لگی ہوتی تھی جس کے موجد والد اقبال شیخ نور محمد مرحوم و مغفور تھے۔ جس کی وجہ سے خاندان اقبال سیالکوٹ میں ''ٹوپیاں والے'' کے نام سے مشہور ہے۔ چنانچہ رواج کے مطابق جب منیرہ خالہ ابھی تقریباً سات برس کی ہی تھیں کہ سیالکوٹ سے ان کے لیے اسی قسم کا ایک چھوٹا سا برقع تیار کروا کر شیخ عطا محمد صاحب نے لاہور بھجوایا اور ساتھ ہدایت کی کہ بچی جوان ہو رہی ہے' اس لیے گھر سے باہر نکلتے وقت برقع اوڑھا کرے۔

والدہ محترمہ بتاتی ہیں کہ برقع دیکھ کر منیرہ کا خوف کے مارے برا حال ہو گیا اور رات کو بخار چڑھ گیا۔ کئی روز بیچاری ڈر کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلی کہ برقع اوڑھنا پڑے گا۔ آخر جب چچا جان کو معلوم ہوا تو انہوں نے تسلی دی کہ ابھی تو نہیں مگر بڑے ہو کر تمہیں خود یہ فیصلہ کرنا ہے اور تب تک یقیناً زمانہ کافی بدل چکا ہو گا' اس لیے فیصلہ میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی۔

سحر خیزی

رمضان المبارک میں قبلہ نانا جان (حضرت علامہؒ) کا یہ معمول تھا کہ وہ خصوصی طور پر یہ حکم دیا کرتے کہ گھر کے تمام بچوں کو سحری کے وقت ضرور بیدار کیا جائے' خواہ وہ روزہ رکھیں یا نہ رکھیں مگر سحری ضرور تناول کریں تاکہ اوائل عمر میں ہی بچوں کو شعائر اسلامی سے واقفیت اور ماہ رمضان کی برکات اور سب سے بڑھ کر اس کے احترام کا بھرپور احساس ذہن نشین ہو سکے۔

والدہ مکرمہ اس سلسلے میں بتایا کرتی تھیں کہ..... ''جاوید کو ابھی بہت چھوٹا تھا مگر سحری کے وقت اٹھنے کے لیے ہمیشہ ضد کیا کرتا تھا۔ سردار چچی جان (والدہ جاوید) اس خیال سے کہ بچہ خواہ مخواہ صبح صبح اٹھ کر پریشان کرے گا' اکثر اسے سحری کے وقت بیدار نہ کرتیں۔ چچا جان (علامہ صاحب) کو علم ہوتا تو وہ سردار چچی جان کو ایسا کرنے سے منع فرماتے اور ہمیشہ تلقین فرماتے کہ اگر ''ببا'' شوق سے اٹھنا چاہتا ہے تو آپ کیوں اس کو مایوس کرتی ہیں' اس کو ضرور اٹھایا کریں بلکہ اگر کسی روز وہ اٹھنے سے انکار کرے تو اسے زبردستی بیدار کریں تاکہ مذہب کے لیے اس کا ذوق شوق فزوں تر ہو''۔ ان (علامہ صاحب) کا فرمانا تھا کہ جو عادات کم سنی میں راسخ ہو جاتی ہیں وہ پھر تمام عمر نہیں چھوٹتیں۔ اس لیے

اگر بچوں کو عمر کے ابتدائی حصہ میں ہی مذہب کی طرف رغبت دلائی جائے اور صحیح راہنمائی بہم پہنچائی جائے تو بڑے ہو کر وہ یقیناً اچھے اور بڑے راسخ العقیدہ مسلمان ثابت ہوں گے۔ چچا جان کا فرمانا تھا کہ سحر خیزی تو اسلام کا سب سے بڑا اور بہترین تحفہ ہے..... بچے اگر اوائل عمر سے ہی اس کے عادی بن جائیں تو پھر پوری زندگی نہ صرف اس کے روحانی بلکہ جسمانی فیوض و برکات سے بھی فیض یاب ہوتے رہیں گے"۔ حضرت علامہؒ کا مندرجہ ذیل فرمان ان کی اسی سوچ کا آئینہ دار ہے۔

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی!

(بال جبریل)

اور اسی طرح ضرب کلیم میں فرمایا۔

بے اشک سحر گاہی تقدیم خودی مشکل
یہ لالہ پیکانی خوشتر ہے کنار جو!

حضرت علامہؒ کی سحر خیزی سے سبھی واقف ہیں۔ تہجد اور نماز فجر کے بعد تلاوت کلام پاک ان کا ہمیشہ کا معمول تھا۔ تلاوت قرآن ایسی خوش الحانی سے کرتے تھے کہ سننے والے وجد میں آ جایا کرتے اور لحن داؤدی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ تلاوت کلام الٰہی کے دوران اکثر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ زار و قطار روتے' یہاں تک کہ کلام پاک کے صفحات ان کے آنسوؤں سے تر ہو جاتے اور دھوپ میں سکھانے پڑتے۔ عمر کے آخری حصہ میں جب گلے کی خرابی سے آواز تقریباً بند ہو گئی تو سب سے زیادہ دکھ اسی بات کا رہا کہ بلند آواز میں' جوان کا معمول تھا' تلاوت قرآن ممکن نہ رہی۔ نانا جان رات کو ہمیشہ دیر سے سونے کے عادی تھے مگر سحر خیزی بھی ان کا معمول تھا۔ ان کی شب بیداری اور سحر خیزی کے ثبوت تو ان کے بے شمار خطوط سے بھی ملتے ہیں۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام خط میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

"سردی آ رہی ہے۔ صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں پھر اس کے بعد نہیں سوتا سوائے اس کے کہ مصلے پر کبھی اونگھ

جاؤں''[2]۔

ایک دوسرے خط میں ۱۱ جون ۱۹۱۸ء کو مہاراجہ کشن پرشاد ہی کو تحریر کیا:

''انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ آج رمضان المبارک کی پہلی ہے۔ بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے اور بعد بھی دعا کروں گا کہ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے' کیا عجب ہے کہ دعا قبول ہو جائے''[3]۔

'بال جبریل' میں شاید اسی کیفیت کو یوں بیان فرمایا۔

میں نے پایا ہے اسے اشک سحرگاہی میں!
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش!

(بال جبریل)

قیام یورپ میں بھی یہ معمول جاری رہا اور انہوں نے وہاں بھی شدید سردی کے باوجود اپنی سحرخیزی کی عادت برقرار رکھی اور تہجد اور نماز فجر اول وقت میں ادا کرتے رہے۔

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

(بال جبریل)

میاں جی کی سادہ لوحی

میری والدہ محترمہ روایت کرتی ہیں کہ..... ''ایک دفعہ بے جی' (والدہ اقبال) نے سونے کی چند کنگنیاں بنوانے کا ارادہ کیا اور اپنی کسی ملنے والی سے نمونے کے طور پر ایک کنگنی حاصل کر کے میاں جی (والد اقبال) کے سپرد کی کہ بالکل اس کے مطابق بارہ کنگنیاں بنوادیں۔ چنانچہ میاں جی نمونے کی وہ کنگنی لے کر بازار میں اپنے ایک خاص دوست زرگر' جس سے ہمیشہ زیور بنواتے تھے' کی دکان پر گئے اور نمونے کے مطابق بارہ کنگن تیار کرنے کا کہہ آئے۔ زرگر نے

نمونے کا کنگن دیکھ کر میاں جی کو اسی وقت واپس کر دیا اور کہہ دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ واپس لے جائیں ...... انشاءاللہ کنگن اس کے مطابق تیار ہو جائیں گے۔ چنانچہ میاں جی نمونہ کا کنگن واپس لے آئے اور احتیاط سے کہیں رکھ کر بھول گئے کہ سنار نے نمونے والی کنگن واپس کر دی تھی''۔

والدہ مزید بیان کرتی ہیں کہ...... ''میاں جی بڑے سادہ لوح اور انتہائی ایمان دار واقع ہوئے تھے اس لیے دوسروں کی غلط بیانی بھی ان سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ وعدہ کے مطابق جب مطلوبہ کنگن نمونہ کے عین مطابق تیار ہو گئے اور زرگر نے میاں جی کے سپرد کر دیئے تو انہوں نے نمونے والے کنگن کا مطالبہ کیا۔ بے چارے زرگر نے بتایا کہ وہ تو اسی وقت آپ کو واپس کر دیا تھا کیونکہ ضرورت نہیں تھی۔ میاں جی بڑے جز بز ہوئے اور زرگر سے فرمایا ''یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کنگن تم نے بنانے تھے یا میں نے؟ نمونے کی ضرورت تمہیں تھی یا مجھے؟''

جب اس شریف آدمی نے اصرار کیا تو میاں جی کو جلال آ گیا اور فرمایا ''تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں تولہ بھر سونے کے لیے غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں؟'' بے چارا زرگر دست بستہ معافی کا خواستگار ہوا اور اسی وقت ایک تولہ سونا کاٹ کر بارہ نئی کنگنیوں کے ساتھ پیش کر دیا اور عرض گزاری کہ

''حضور معاف فرما دیں۔ مجھ سے بڑی بھول ہو گئی''۔

میاں جی نے معاف فرماتے ہوئے حکم دیا کہ

''اس کے ساتھ بنوائی کا ایک روپیہ نقد بھی ادا کرو!''

چنانچہ اس بے چارے نے جو میاں جی کا بے حد احترام کرتا تھا ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والا معاملہ دیکھ کر فوراً ایک روپیہ نقد بھی پیش کر دیا۔

اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر گیا کہ ایک روز اپنی چیزوں کو الٹتے پلٹتے میاں جی کو نمونے کی وہ کنگن اچانک مل گئی اور اپنی ضروری چیزوں کے درمیان پڑا دیکھ کر ایک دم انہیں پوری صورت حال کا ادراک ہو گیا۔ انہوں نے فوراً وہ کنگن پکڑا اور سیدھے اپنے دوست زرگر کی دوکان پر جا پہنچے اور اس سے دلی طور پر معذرت خواہ ہوئے کہ بھائی تمہیں سچے تھے اور مجھے ہی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں اپنی طرف سے اس کو محفوظ کر کے بھول گیا تھا۔ اسی وقت ایک تولہ سونے کی قیمت مع ایک روپیہ نقد جو بنوائی کا تھا' واپس کیا اور استدعا کی کہ مجھے صدق دل سے معاف کر دو کہ میں نے خواہ مخواہ تم پر شک

کیا۔ ان کا دوست بھی انہی کا دوست تھا خود معافی کا خواستگار ہوا کہ اس کی وجہ سے انہیں اس قدر کوفت ہوئی اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لایا کہ میاں جی کے سامنے سرخروئی حاصل ہوئی کہ اس میں اس کی کوئی فروگذاشت نہیں تھی"۔

آہ! وہ بھی کیا وقت تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے لیے کس قدر پریشان ہوا کرتے تھے۔ ہر حال میں دوسروں کی راحت ان کا منتہائے نظر ہوتا تھا۔ اپنی پریشانیوں اور تکالیف کو وہ اس وقت بالکل فراموش کر دیا کرتے تھے' جب دوسروں کو ان کے بدلے میں شاداں و فرحاں پاتے تھے۔ ایسے ایماندار اور دوسروں پر نچھاور ہو جانے والے انسان اب کہاں ملتے ہیں۔

خدا رحمت کندآں "زاہدان" پاک طینت را

بجلی کی آمد اور میاں جی

والدہ محترمہ روایت کرتی ہیں کہ "جن دنوں ابھی بجلی کی سہولت سیالکوٹ میں میسر نہیں تھی ہمارے ہاں یعنی اقبال منزل میں شام کو ایک آدمی کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ تمام لالٹینیں اور لیمپ وغیرہ صاف کر کے ان میں تیل ڈالے اور روشن کر کے سر شام تمام کمروں میں پہنچائے۔ میاں جی کی نظر جب بڑھاپے کی وجہ سے قدرے کمزور ہو گئی تو وہ ہر روز یہی شکایت کرتے کہ ان کے کمرے میں لیمپ اچھی طرح صاف کر کے نہیں رکھا جاتا کیونکہ روشنی بالکل دھندلی ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد جب بجلی لگ گئی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ یہ روشنی بہت اچھی ہے' ہر کونے کھدرے کو روشن کر دیتی ہے۔ موسم گرما میں بجلی سے چلنے والے پنکھے کی ہوا سے بڑے محظوظ ہوتے۔ کیونکہ اس سے پہلے دستی پنکھیاں استعمال ہوتی تھیں یا ہمارے چھت گیر دستی پنکھے لگے ہوئے تھے جن کو جھلانے کے لیے رسہ کھینچنا پڑتا تھا جو خاصا دقت طلب کام ہوا کرتا تھا۔

ابا جان نے تو اس کے لیے خاص ملازم رکھا ہوا تھا جو موسم گرما کی دوپہروں میں کمرے سے باہر بیٹھا رسی ہلاتا اور بری طرح اونگھتا اور ابا جان اپنے کمرے میں خنک ہوا میں قیلولہ فرماتے۔ یہ انگریزوں کا طریقہ انہوں نے اپنی فوج کی

ملازمت کے دوران سیکھا تھا۔ ان کے خیال میں یہ بڑا ظالمانہ عمل تھا مگر وہ اسے ترک کرنا بھی شاید پسند نہیں فرماتے تھے''۔

والدہ مزید بتاتی ہیں کہ..... ''بے چارے میاں جی کو روشنی کی یہ زیادتی شاید راس نہ آئی اور تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی نظر تقریباً بند ہوگئی۔ چنانچہ اس طرح اندھیرے اجالے کا امتیاز تو ختم ہو گیا البتہ بجلی کے پنکھے سے استفادہ بدستور جاری رہا۔ البتہ زیادہ گرمی کے دنوں میں وہ بجلی کے پنکھے کی بجائے اسی پرانے دستی پنکھے کی طرف لوٹ جایا کرتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بجلی کے پنکھے کی ہوا میں ویسی خنکی عنقا ہو جاتی ہے جیسی پرانی طرز کے دستی پنکھوں کی خصوصیت تھی۔ چنانچہ جون' جولائی کی شدید گرمی کے دنوں میں وہ بجلی کے پنکھے کی بجائے دستی پنکھے والے کمرے میں رہنا پسند کرتے اور دوسروں کو بھی اس کے فوائد سے آگاہ فرماتے رہتے''۔

نومولود بچے

والدہ محترمہ اکثر بتایا کرتی تھیں کہ..... ''چچا جان کو چھوٹے بچے بے حد پسند تھے۔ سوئے ہوئے بچوں کو کتنی کتنی دیر بیٹھے دیکھتے رہتے اور خوش ہوتے۔ ان کا فرمانا تھا کہ چھوٹے بچے کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ خاص طور پر نومولود بچوں کو بہت پسند کرتے اور بڑے پیار سے انہیں دیکھتے''۔

والدہ بتاتی ہیں کہ..... ''اسی طرح ابا جان (شیخ عطا محمد) بھی نومولود بچے کو سوتے میں دیکھنا پسند کرتے تھے اور سوتے میں منہ بسورنے اور مسکرانے کی وجہ سے بڑے خوش اور حیران ہوا کرتے تھے''۔ ''۱۹۳۸ء میں چچا جان کے انتقال کے بعد ابا جان بے حد دلگرفتہ اور ملول رہنے لگے تھے۔ ان کا دل دنیا کی ہر خوشی سے اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ کسی بات میں دل نہیں لگتا تھا' طبیعت اس قدر حساس ہوگئی کہ ذرا ذرا سی بات پر مایوسی کا اظہار کرنے لگتے اور زاروقطار رونا شروع ہو جاتے۔ بعض اوقات تو ان کی حالت اس قدر بگڑ جاتی کہ کسی طور سنبھالنا ممکن نہ ہوتا۔ پھر جب ۱۹۳۹ء کے وسط میں خالد پیدا ہوا تو بے حد خوش ہوئے جیسے ایک کھلونا بلکہ جینے کا بہانہ انہیں مل گیا۔ ہر وقت اس کے ساتھ کھیلتے اور اس کے لیے کیا کیا انتظامات کرتے رہتے۔ ان دنوں خاص طور پر ایک کیمرہ خرید ا اور خدا جانے کس قدر فلمیں اس میں ضائع کیں کیونکہ کبرسنی کی وجہ سے ہاتھوں میں قدرے رعشہ سا تھا اس لیے جیسے ہی بٹن دباتے' ہاتھ بری طرح

کانپ جاتے ......شاید ہی کوئی تصویر درست اتری ہو مگر پھر بھی ہر وقت ''نومولود'' کی تصاویر اتارنے کا جنون سوار رہتا۔ خالد کو وہ ''ہٹلر'' کہہ کر پکارا کرتے تھے کیونکہ ان دنوں جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اور وہ شاید ہٹلر کے مداحوں میں سے تھے۔ اکثر مجھے مخاطب کر کے فرماتے:

''سیما! تمہارا بیٹا بالکل ہٹلر کی طرح زبردست ہے۔ اپنی بات منوا کر چھوڑتا ہے''۔

ہر وقت اس کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ کبھی گود میں اٹھاتے اور کبھی سینے پر لٹاتے۔ نومولود خالد خاصا صحت مند تھا اس لیے اٹھانا دوبھر ہو جاتا' مگر ان کا جی نہ بھرتا۔ کبھی وہ ہاتھ چلاتا تو ابا جان کے منہ یا ناک پر خاصا زوردار مکہ جڑ دیتا۔ ابا جان ایک دم گھبرا جاتے اور میرے حوالے کرتے ہوئے فرماتے:

''اس کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔ مجھے تو یہ کوئی باکسر معلوم ہوتا ہے''۔

ابا جان نے خود کو بہلانے کے لیے ہر بہانہ آزمایا اور اپنے عزیز بھائی کی رحلت کے بعد خود کو مصروف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بھائی کی جدائی کا غم اندر ہی اندر انہیں کھوکھلا کرتا چلا گیا۔ وہ انسان جس کا رعب اور دبدبہ مثالی ہوا کرتا تھا' حالات کے سامنے سپر انداز ہوتا گیا۔ چچا جان ان سے عمر میں بہت چھوٹے تھے' اس لیے انہیں بالکل بیٹوں کی طرح عزیز تھے۔ ان کی وفات ان کے لیے بالکل اپنے عزیز ترین بیٹے کی موت کے مترادف تھی۔ ابا جان کو ہمیشہ اس کا دکھ رہا کہ عمروں میں اتنے زیادہ فرق کے باوجود انہیں' چچا جان کے بعد اس دنیا میں زندہ رہنا پڑ رہا ہے۔ آخر یہ غم ان کی جان لے کر ہی ٹلا اور وہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۰ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے''۔

ع

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(غالب)

محترمہ کریم بی بی۔ خواہر خورد

نانا جان قبلہ (حضرت علامہؒ) کی چار بہنیں تھیں۔ دو بڑی' محترمہ فاطمہ بی بی اور حضرت طالع بی بی[1] اور دو چھوٹی' محترمہ کریم بی بی اور محترمہ زینب بی بی۔ محترمہ کریم بی بی بہنوں میں تیسرے نمبر پر اور میاں جی شیخ نور محمد مرحوم کے

سات بچوں میں چھٹے نمبر پر تھیں۔ آپ علامہ صاحب سے تقریباً تین [2] برس چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی موضع ''نت''
(ضلع گوجرانوالہ) کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ وہاں انہوں نے تین بیٹوں کو جنم دیا۔ سب سے بڑے ظفر الحق تھے جنہوں نے انگلستان سے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کراچی میں کئی ایک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ منجھلے محمد سرور جو محکمہ ڈاک میں ملازم رہے اور ان کا قیام مستقلاً لاہور میں رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں وفات پائی اور سب سے چھوٹے محمد اصغر جو صغرسنی میں ہی وفات پا گئے۔ پھوپھی جی [3] کے میاں جو اپنی زمینداری کے زعم میں بڑے رنگین مزاج واقع ہوئے تھے' کو خدا جانے کیا سوجھی یا اس دور میں شاید یہ لازم تھا کہ ہر مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرنا ''مردانگی'' سمجھتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی دوسرا بیاہ ایک طوائف زادی سے رچا لیا۔ پھوپھی جی جو بڑی عابدہ زاہدہ اور اس دور میں جب عورتوں کو تعلیم دلوانا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا' پانچ جماعت تک پڑھی ہوئی تھیں اور نہ صرف خاندان میں بلکہ محلہ برادری میں بڑی عالم فاضل مانی جاتی تھیں' بچوں کو ساتھ لے کر میکے چلی آئیں اور کافی عرصہ سیالکوٹ میں مقیم رہیں۔ تقریباً دس برس بعد ان کی سوت انتقال کر گئیں' چنانچہ وہ واپس اپنے سسرال چلی گئیں۔ لیکن کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ ان کے میاں بھی قضائے الٰہی سے وفات پا گئے چنانچہ وہ دوبارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیالکوٹ آ گئیں اور پھر کبھی سسرال جا کر نہیں رہیں' البتہ آنا جانا رہا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی' خاص طور پر بڑے بیٹے ظفر الحق نے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم انگلستان سے حاصل کی جس کے لیے اخراجات میں ان کے چچا نے مدد دی' البتہ وہ تمام رقم انہوں نے ملازمت کے بعد چچا کو واپس لوٹا دی جس کا ریکارڈ پھوپھی جی کے ذاتی کاغذات میں موجود ہے۔

پھوپھی جی چونکہ بچپن سے ہی بڑی سمجھدار اور پڑھنے لکھنے میں بڑی ہوشیار تھیں' اس لیے گھر بھر کی چہیتی تھیں۔ میاں جی' بے جی' بڑے بھائی اور حضرت علامہ صاحب سب ان کی بات مانتے تھے۔ علامہ صاحب کے ساتھ تو ان کی بڑی بے تکلفی تھی کیونکہ دونوں اوپر تلے کے بہن بھائی تھے اس لیے بچپن سے ہی اکٹھے کھیل اور پڑھ کر جوان ہوئے۔

پھوپھی جی چونکہ پڑھی لکھی تھیں اس لیے اچھا ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ نماز فجر کے بعد مناجات اور کلام اقبال پڑھنا ان کا معمول تھا۔ ان کے پاس ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' موجود تھیں' جنہیں بڑی حفاظت سے ایک جزدان میں لپیٹ کر رکھتی تھیں۔ ان کی رحلت کے بعد وہ جزدان جس میں ان دو کتابوں کے علاوہ ان کے دوسری ضروری

کاغذات بھی تھے میرے حصے میں آیا اور اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

راقم الحروف نے اپنے بچپن سے پھوپھی جی خلد آشیانی کو اقبال منزل سیالکوٹ یا جاوید منزل لاہور میں مقیم دیکھا ہے۔میرے ہوش سنبھالنے سے قبل شاید کچھ عرصہ وہ اپنے بڑے صاحبزادے ظفر الحق کے پاس بھی رہیں کیونکہ اکثر و بیشتر اس کا ذکر کیا کرتی تھیں۔مگر میں نے انہیں کبھی کراچی آتے جاتے نہیں دیکھا۔راقم الحروف نے انہیں یا تو لاہور میں مقیم دیکھا یا پھر عمر کے آخری حصہ میں مستقل طور پر سیالکوٹ میں ان کا قیام رہا۔

سرخ وسفید رنگت کے ساتھ سر کے بال سفید براق تھے۔چہرے پر ہر وقت کھیلتی پیاری اور نرم مسکراہٹ ان کی دلنواز شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھا۔گفتگو کا انداز بے حد پیارا اور دل کو چھو لینے والا' بڑوں کی محفل میں انتہائی مدبر اور بچوں کے ساتھ بے حد مشفق۔وہ بڑی زندہ دل واقع ہوئی تھیں اور ہمیشہ جان محفل سمجھی جاتی تھیں۔نماز پنجگانہ' تہجد اور مختلف اوراد کا ذکر ان کا روز کا معمول تھا۔بڑی صفائی پسند اور خوش پوشاک واقع ہوئی تھیں۔پورا دن لباس تبدیل کرتی رہتیں کیونکہ کبرسنی میں بھی ہر کام اور وقت کے لیے لباس مخصوص رکھے ہوتے تھے۔نماز کے لیے علیحدہ لباس' کھانا کھانے کے وقت دوسرا لباس' غسلخانہ جانے کے لیے مختلف کپڑے اور بیت الخلاء کے لیے علیحدہ۔یہاں تک کہ ان اوقات کے لیے جوتے بھی مختلف استعمال کرتی تھیں۔شاید عبادت اور پاکیزگی کے اس قدر اہتمام نے ہی ان کی شخصیت بالکل حوروں کی طرح بنا دی تھی۔عمر کے آخری حصہ تک ان کے چہرے پر اس طرح نور برستا تھا کہ آدمی مبہوت رہ جاتا تھا۔

لاہور میں بڑا طویل عرصہ ان کا قیام "جاویدمنزل" میں رہا۔آپا بانو (منیرہ خالہ) اور جاوید ماموں کے ساتھ ان کو بے انداز محبت تھی اور وہ دونوں بھی ان کو دل وجان سے پیار کرتے تھے۔آپا بانو کی شادی[1] کے بعد جب جاوید ماموں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک چلے گئے تو "جاویدمنزل" کو آباد رکھنے کے لیے آپا بانو مع صلی ماموں[2] (میاں صلاح الدین) اور بچوں کے وہیں اٹھ آئیں۔انہوں نے پھوپھی جی کو بھی مستقلاً اپنے پاس رکھنا چاہا مگر شاید یہ اس لیے ممکن نہ ہو سکا کہ ان دنوں پھوپھی جی کا مستقل قیام خالہ عنایت کے ہاں تھا' جو ان دنوں جاوید منزل کے بالکل نزدیک برڈز انسٹیٹیوٹ کی ریلوے کالونی میں رہ رہی تھیں۔خالہ عنایت کی کوٹھی سے جاوید منزل کا فاصلہ پانچ یا دس منٹ کا تھا' چنانچہ سارا دن ادھر سے ادھر آنے جانے کا تانتا بندھا رہتا۔میری دونوں خالہ زاد برڈز انسٹیٹیوٹ کے ساتھ واقع

لڑکیوں کے سکول میں پڑھتی تھیں جو بالکل جاوید منزل کے پچھواڑے میں تھا۔ اس لیے تمام بچے سارا دن کبھی پیدل اور کبھی سائیکلوں پر ادھر ادھر چکر لگاتے تھے۔

شب دیگ

یہ انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز دوپہر کے کھانے پر سب لوگ جاوید منزل کے کھانے کے کمرے میں اکٹھے تھے ...... پھوپھی جی کریم بی بی' پھوپھی زینب' آپا جان[3] (آنٹی ڈورس)' آپا بانو' میاں صلاح الدین (صلّی میاں)' خالہ عنایت' میری والدہ (وسیمہ مبارک)' نادرہ باجی' محمود (میرے خالہ زاد) اور راقم الحروف ...... اس دن کشمیر کی خاص الخاص ڈش ''شب دیگ'' پکوائی گئی تھی ...... ساری رات پورے اہتمام کے ساتھ پکائی گئی ''شب دیگ'' اس وقت سب خاص طور پر مستورات بڑے ذوق وشوق سے خشکے کے ساتھ نوش جان کر رہے تھے۔ خالو صلّی تو تھوڑا سا کھانا ہی کھا کر اور معذرت کر کے میز سے اٹھ گئے کہ انہیں کہیں جانے کی جلدی تھی یا شاید انہیں شب دیگ خاص مرغوب نہیں تھی اور محض اپنی بیگم صاحبہ کا دل رکھنے کو شامل ہو گئے تھے اور اب کہیں اور شکم پری کا بندوبست فرمانے بھاگ لیے تھے۔ باقی سب ڈٹے ہوئے تھے اور دنیا ومافیہا سے بے خبر شب دیگ کے ساتھ پورا پورا انصاف ہو رہا تھا۔ پھوپھی جی اور آپا جان کے مابین تو باقاعدہ ''شب دیگ خوری'' کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ آنٹی ڈورس مشرقی کھانوں کی بڑی دلدادہ تھیں اور خوش خوراک بھی واقع ہوئی تھیں۔ باقی سب لوگ تو شب دیگ کو ''ختم'' کرنے میں مگن تھے مگر ہم تینوں نئی نسل کے نمائندہ یعنی نادرہ باجی' محمود اور راقم الحروف' شب دیگ سے مستفیض ہونے کے بجائے کوئی دوسرا سالن چپاتیوں کے ساتھ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھے۔ آپا بانو کو جیسے ہی اپنی پسندیدہ شب دیگ سے ذرا فراغت ملی تو انہیں احساس ہوا کہ کچھ بدنصیب اس نعمت غیر مترقبہ کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے روئے سخن ہماری طرف کرتے ہوئے فرمایا ...... ''ارے تم تینوں شب دیگ کیوں نہیں کھا رہے؟'' تینوں نے جواب دیا ''ہمیں شلغم اور چاول پسند نہیں ہیں''۔ اتنا سننا تھا کہ ان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور بڑی مشکل سے اس حیرت پر قابو پاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں چلائیں ...... ''ہا خائے! تم سب کس قسم کے کشمیری ہو جنہیں چاول اور شلغم پسند نہیں؟'' پھر خالہ عنایت اور میری والدہ سے مخاطب ہوئیں ...... ''آپا عنایت! آپا وسیمہ! یہ بچے کیا کہہ

رہے ہیں۔ مجھے تو ان کے کشمیری ہونے پر شک ہو رہا ہے' ہا خائے' یہ شب دیگ اور چاول پسند نہیں کرتے' یہ ہمارے بچوں کو ہو کیا گیا ہے؟'' وہ ایک ہی سانس میں بولے چلے جا رہی تھیں۔ اسی وقت نادر شاہی بلکہ ''بانو شاہی'' حکم صادر ہوا کہ تینوں فوراً اپنی اپنی پلیٹ میں خشکہ نکالیں اور شب دیگ کے ساتھ انصاف کریں ورنہ میز سے اٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی ...... چنانچہ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق حکم حاکم پر عمل پیرا ہوتے ہی بنی۔ میں نے شاید پہلی بار خشکے کے ساتھ شلغم کا مزا چکھا اور محسوس کیا کہ شب دیگ تو واقعی خاصی خوش ذائقہ چیز ہے اور اس کا برملا اقرار کیا اور خوب ڈٹ کر دونوں چیزیں اڑائیں۔ شب دیگ میں ڈالا گیا گوشت بڑا لطف دیتا ہے۔ کیونکہ ساری رات پک پک کر وہ بالکل حلیم بن چکا ہوتا ہے اور پھر اس کے مسالے' بس لطف ہی آ جاتا ہے۔ واقعتاً کشمیر کے دوسرے منفرد اور لذیذ کھانوں مثلاً گشتاربہ' کونتہ کبیر' ہریسہ کباب' پنیر شوربہ اور مرغ مسلم پلاؤ کا لطف اپنی اپنی جگہ مگر صحیح طریقے سے تیار کی گئی شب دیگ کام و دہن کو ایک عجیب سی لذت سے ہمکنار کرتی ہے۔

سحری کھانے میں تاخیر

پھوپھی جی کافی عرصہ اسی طرح خالہ عنایت کے گھر اور جاوید منزل کے درمیان ''شٹل'' کرتی رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں وہ ابھی روزے پوری پابندی سے رکھا کرتی تھیں اور رمضان المبارک میں سنت رسول مقبولؐ کی پیروی کا پورا اہتمام کرتی تھیں۔ چنانچہ سحری کے وقت کھانا کھانے میں تاخیر اور افطار میں جلدی کیا کرتی تھیں۔ سحری کے وقت تہجد کے بعد اوراد میں مصروف ہو جاتیں اور کھانا وغیرہ ان کے بستر کے قریب میز رکھ کر اس پر لگا دیا جاتا کیونکہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اذان سے تھوڑی دیر پہلے کھا کر پورا ثواب لیں گی۔ ان دنوں اس ریلوے کالونی میں کوئی مسجد اتنی قریب نہیں تھی کہ اذان کی آواز صحیح طرح سنائی دے۔ باقی سب تو گھڑی سے وقت دیکھ کر سحری کا اختتام کر لیتے مگر پھوپھی جی نہ مانتیں اور پو پھٹنے کا انتظار کرتی رہتیں۔ چنانچہ اکثر اچھا خاصا دن نکل آتا اور وہ آنکھیں بند کیے اپنی مناجات میں مشغول رہتیں۔ جب ان کو احساس دلایا جاتا تو سادہ طبیعت کی وجہ سے کھڑکی پر پردہ کھینچ لیتیں اور کہتیں ابھی تو روشنی بہت کم ہے اور جلدی جلدی سحری نوش کر لیتیں۔ اس وقت وہ کم از کم ۵۷ کے پیٹے میں ہوں گی۔ صحت بالکل ٹھیک تھی۔ رمضان المبارک میں پورے روزے رکھتی تھیں۔ اپنے تمام چھوٹے بڑے کام خود کرتیں۔ اٹھنے بیٹھنے

اور چلنے پھرنے میں بالکل کوئی دقت نہیں تھی۔

۱۹۵۳ء کے وسط میں خالو جان کا تبادلہ ملتان ہو گیا چنانچہ خالہ عنایت مع بچوں اور پھوپھی جی سیالکوٹ منتقل ہو گئیں۔ چار چھ مہینوں کے بعد خالہ عنایت فیملی تو ملتان سدھار گئی مگر پھوپھی جی نے مستقلاً سیالکوٹ میں ہی قیام کا فیصلہ کیا اور پھر ۱۹۵۸ء میں اپنی وفات تک تقریباً پانچ برس "اقبال منزل" میں ہی مقیم رہیں۔ ان دنوں میری نانی محترمہ یعنی بڑی بھابھی جی ابھی حیات تھیں۔ چنانچہ دونوں نند اور بھابھی ایک دفعہ پھر اکٹھی ہو گئیں۔ اقبال منزل میں میاں جی والا کمرہ ان دنوں ان کے پاس ہوا کرتا تھا اور اپنے والد محترم کی وہ دیوار گیر مخصوص الماری اب ان کے استعمال میں تھی جس میں میاں جی اپنی خاص خاص چیزیں جن میں ان کا مشہور برفی والا ڈبہ شامل تھا' رکھا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کبھی کبھی پھوپھی جی پنجابی میں ظریفانہ اشعار بھی کہا کرتی تھیں اور پھر بڑے چاؤ سے سب کو سنایا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ہمارے ایک عزیز نے اقبال منزل کی دکانوں میں چائے کا چھوٹا سا ہوٹل کھولا اور اس کا نام "لالہ زار کیفے" رکھا۔ پھوپھی جی نے بڑی لمبی نظم اس پر لکھی جس میں بڑی خوبصورت "تک بندی" فرمائی۔ مجھے تھوڑا سا حصہ یاد ہے:

ہوٹل کھولیا جے افتخار ناں رکھیا سو لالہ زار
ہر اک نوں اے دیوے چکر مارے ڈنڈی' کردے پار
لالہ زار بڑا ہوشیار
چاء ایدی اے سڑدی بلدی پر بوتل رکھدا ٹھنڈی ٹھار
لالہ زار بڑا ہوشیار
ہر کم ایسدا اپرا پار

اقبال منزل میں تقریباً پانچ برس انہوں نے بڑا اچھا وقت گزارا۔ آخری وقت تک بڑی چاک و چوبند رہیں۔ سارا دن گھر میں ادھر سے ادھر گھومتی پھرتیں۔ اپنا تمام کام خود انجام دیتیں۔ خطوط نویسی کا بہت شوق تھا۔ خاص طور پر اپنے بڑے صاحبزادے کو بڑی باقاعدگی سے خط لکھا کرتی تھیں اور وہاں سے جواب بھی بڑی باقاعدگی سے آیا کرتے

تھے۔ ہر ماہ ماموں ظفر الحق کی طرف سے انہیں منی آرڈر بھی آتا تھا۔ بات بے بات اپنے بڑے صاحبزادے کا ذکر انہیں بہت پسند تھا اور میرے خیال میں وہ اس میں حق بجانب تھیں کہ ساری عمر کی کمائی ان کا یہی بیٹا تھا۔ اقبال منزل کی زنانہ نشست گاہ جو پہلے بے جی کا کمرہ ہوا کرتا تھا اور اب چوبی تخت بچھا کر اس پر فرشی نشست کا انتظام ہوا کرتا۔ روزانہ رات کو چاندنیوں کے فرش پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھ کر محفل جمائی جاتی اور پھوپھی جی کے گرد گھر اور ملنے والے سب مل کر بیٹھتے اور وہ اپنی پیاری پیاری باتوں سے خوب رونق لگاتیں۔ وہ واقعتاً جان محفل تھیں۔ ان کا مطالعہ خاصا اچھا تھا۔ اخبار روزانہ پڑھتی تھیں۔ اس لیے ان کی گفتگو خاصی معلومات افزا ہوا کرتی تھی۔ سیاست سے بھی دلچسپی تھی' اس لیے میرے والد کے ساتھ اکثر اس سلسلے میں بحث کیا کرتی تھیں۔

مہمان خصوصی

انہی دنوں جب وہ سیالکوٹ میں مقیم تھیں' پھوپھی جی کو ۲۱ اپریل پر یوم اقبال کی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر لڑکیوں کے کالج میں مدعو کیا گیا۔ پھوپھی جی چونکہ وقت کی بڑی پابند تھیں اس لیے عین وقت مقررہ پر کالج پہنچ گئیں۔ جب کہ وہاں مدعوئین تو رہے ایک طرف' ابھی منتظمین کا بھی دور دور تک پتہ نہ تھا۔ میری والدہ محترمہ ان کے ہمراہ تھیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ ہمیں پرنسپل کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ وہ محترمہ ابھی قیلولہ فرما رہی تھیں۔ کافی دیر گزر گئی۔ آخر وہ محترمہ تشریف لائیں جنہوں نے ہمیں مدعو کیا ہوا تھا اور آتے ہی گلہ کرنے لگیں کہ آپ اتنی جلدی کیوں تشریف لائیں؟ ہم نے تو آپ کو سب لوگوں کے آنے کے بعد جلوس کی شکل میں لے کر آنا تھا وغیرہ۔

پھوپھی جی بڑی حیران ہوئیں اور کہا کہ آپ نے جو وقت بتایا تھا' ہم بالکل اس کے مطابق یہاں پہنچی ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک تعلیمی ادارے میں بھی وقت کی کوئی قدر نہیں۔ وہ محترمہ بجائے شرمندہ ہونے کے الٹی عجیب و غریب توجیہات بیان فرمانے لگیں کہ تقریبات میں ایسے ہی چلتا ہے اور خاص طور پر مستورات کی تقریبات میں تو کم از کم دو تین گھنٹوں کا مارجن رکھا جاتا ہے۔ پھوپھی جی بے چاری کیا کرتیں۔ بس حیرت کا اظہار کرتی رہیں مگر آخر میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی خوبصورت بات کہی کہ وہ محترمہ پانی پانی ہو گئیں۔ پھوپھی جی نے فرمایا:

''ویسے مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ پوری قوم بالخصوص مستورات بڑی ثابت قدمی سے علامہ اقبال کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ تو اقبال تھے' اس لیے دیر سے آیا کرتے تھے' آپ سب کس وجہ سے دیر سے آتی

ہیں؟"

غیر مطبوعہ کلام اقبال

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے کہ پھوپھی جی کے پاس ایک جزدان تھا جس میں وہ "بانگ درا" اور "بال جبریل" کے ساتھ اپنے خاص کاغذات رکھا کرتی تھیں جن میں ایک پرانی کاپی بھی تھی جس میں انہوں نے چند نعتیں، نظمیں، چند مناجات کے شعر اور کچھ یادداشتیں محفوظ کر رکھی تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں ان کے انتقال کے بعد متذکرہ جزدان میرے حصے میں آیا کیونکہ کوئی دوسرا اس کا طلبگار نہیں تھا۔ تب سے وہ جزدان میرے پاس کتابوں کی الماری میں رکھا رہا۔ شاید کبھی کھول کر دیکھا ہو مگر کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس میں کوئی خاص تحریر موجود ہو..... مگر اب جب میں نے "اقبال درون خانہ" کے دوسرے حصہ کی ترتیب کی ابتدا کی ہے تو اتفاقاً وہ جزدان کتابوں اور مختلف کاغذات کے درمیان رکھا ہوا ملا۔ خیال ہوا کہ دیکھا جائے کہ کہیں اس میں کوئی خاص تحریر وغیرہ تو پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ اس میں محفوظ کاغذات وغیرہ کو ایک ایک کر کے دیکھنا شروع کیا۔ "بانگ درا" اور "بال جبریل" کی جلدوں کے علاوہ سب سے پہلے ایک چھوٹی سی نوٹ بک ملی جس میں پھوپھی جان نے مختلف بچوں کی پیدائش کی تواریخ، مختلف شادیوں اور فوتیدگیوں کے متعلق یادداشتیں محفوظ کی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ خاندانی حساب کتاب اور لین دین کا ذکر ہے۔ دو صفحات پر حضرت علامہ کی دو بیگمات یعنی والدہ جاوید اقبال اور لدھیانہ والی بیگم کی تواریخ وفات اور مادہ ہائے تاریخ کو محفوظ کر رکھا ہے۔ ان سب کے علاوہ وہ کاپی جس میں چند نعتیں، نظمیں اور دوسری تحریریں موجود ہیں۔ اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے احساس ہوا کہ مختلف جگہوں پر پھوپھی جی نے علامہ صاحب کا جو کلام لکھا ہے، اس میں کچھ غیر مطبوعہ اشعار بھی موجود ہیں۔ چنانچہ مزید تحقیق کے بعد واقعتاً علامہ صاحب کا غیر مطبوعہ کلام ثابت ہوا۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

سب سے پہلے تو ایک دعا کے دس اشعار ہیں جو نظام الدین اولیاؒ کی بارگاہ میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے مگر بعد میں شاید ان کو ترک کر کے دوسرے اشعار وہاں پڑھے گئے کیونکہ یہ تمام اشعار کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ ان کو پھوپھی جی نے اپنی کاپی میں اس عنوان کے تحت درج کیا ہے:

حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بارگاہ میں جناب ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب نے یہ دعا لکھ کر پڑھی۔

کیوں نہیں ارماں مرے دل میں کلیم اللہ کے
طور در آغوش ہیں ذرے تری درگاہ کے

میں تری درگاہ کی جانب جو نکلا لے اڑا
آسماں تارے بنا کر میری گرد راہ کے

ہے زیارت کی تمنا المدد اے سوز عشق!
پھول لا دے مجھ کو گلزار خلیل اللہ کے

تر جو تیرے آستانے کی تمنا میں ہوئی
اشک موتی بن گئے چشم تماشا خواہ کے

رنگ اس درگاہ کے ہر ذرے میں ہیں توحید کے
طائران بام بھی طائر ہیں بسم اللہ کے

چھپ کے ہے بیٹھا ہوا اثبات نفی غیر میں
لا کے دریا میں نہاں موتی ہیں الا اللہ کے

سنگ اسود تھا مگر سنگ فسان تیغ عشق
زخم میرے کیا ہیں دروازے ہیں بیت اللہ کے

کس قدر سرسبز ہے صحرا محبت کا تری
اشک کی نہریں ہیں اور سائے ہیں نخل آہ کے

عشق اس کو بھی تری درگاہ کی رفعت سے ہے
آہ! یہ انجم نہیں آنسو ہیں چشم ماہ کے

اس دعا کے بعد دس اشعار ''لا الہ الا اللہ'' کے عنوان کے تحت درج کیے گئے ہیں۔ یہ ''ضرب کلیم'' میں موجود نظم ''خودی کا سر نہاں ..... الخ'' کے وزن پر ہیں۔ شاید انہیں بھی بعد میں بوجوہ ترک کر دیا گیا مگر چونکہ پھوپھی جی انہیں محفوظ کر چکی تھیں، اس لیے ان کی کاپی میں ابھی بھی موجود ہیں:

خودی خدا کا نشاں لا الہ الا اللہ
خدا خودی سے عیاں لا الہ الا اللہ
نظام کن میں اگر تو بچشم دل دیکھے
خودی ہے روح رواں لا الہ الا اللہ
جہان عشق و جنوں ہے حقیقت روشن
تری خودی میں نہاں لا الہ الا اللہ

اگر تو شان و مقام خودی کو پہچانے
ترے ہیں دونوں جہاں لا الہ الا اللہ
ہوا ہے غیر کی محفل میں جا کے تو رسوا
حرم ہے تیرا مکاں لا الہ الا اللہ
دل و نظر میں تفاوت کبھی نہیں ممکن!
اگر ہو ورد زباں لا الہ الا اللہ
تو اپنا آپ نگہباں نہیں گلہ کس کا
کہاں کا جورِ زماں لا الہ الا اللہ
مجاہدانہ بسر کر قلندری آموز
یہی ہے مقصد جاں لا الہ الا اللہ
خطیب سحر بیانی سے کر گیا مسحور
خدا کا ذکر کہاں لا الہ الا اللہ
اگر مقام محبت نظر میں ہو تیرے
سبک ہے بار گراں لا الہ الا اللہ

بچوں کے لیے مشہور دعا ''لب پہ آتی ہے .... الخ'' بھی اس کاپی میں درج کی گئی ہے۔لیکن مروجہ چھ اشعار کے بجائے اس میں نو اشعار ہیں۔ان تین اشعار کے ساتھ جو بعد میں شاید ترک کر دیے گئے' اس کی صورت کچھ اس طرح ہے:

لب پہ آئی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب
علم دنیا کے چمن میں ہو اگر گل کی طرح
میں چہکتا رہوں اس پھول پہ بلبل کی طرح
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
دکھ اٹھائے مرے ہاتھوں سے نہ جاندار کوئی
اے خدا عمر اس طرح بسر ہو میری
میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو
دکھ بھی آ جائے تو ہو دل نہ پریشاں میرا
شکر ہر حال میں ہو میری زباں پہ تیرا

ان تین اشعار جو آج کی مروجہ دعا میں شامل نہیں' کے علاوہ پہلے شعر کے مصرع اولیٰ میں ایک لفظ بھی مختلف ہے۔ ''آتی'' کی بجائے یہاں لفظ ''آئی'' استعمال ہوا ہے۔ یعنی مروجہ مصرع ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' کی بجائے یہاں یہ مصرع یوں ہے ''لب پہ آئی ہے ....الخ''۔ ''بانگ درا'' میں شامل چھ اشعار کے علاوہ شعر نمبر ۵' ۷ اور ۹ یہاں پر اضافی ہیں' جنہیں بعد میں ترک کر دیا گیا۔

معصوم دعا

اس سلسلے میں پھوپھی جی کی زبانی سنا ہوا ایک واقعہ مجھے یہاں یاد آ رہا ہے ......پھوپھی جی چونکہ گھر کی تمام مستورات بلکہ خاندان' محلّہ اڑوس پڑوس میں سب سے زیادہ یعنی پانچ جماعت تک پڑھی ہوئی تھیں' چنانچہ پورے خاندان اور

محلّہ میں عورتوں کے درمیان سب سے زیادہ عالم فاضل مانی جاتی تھیں۔ اس لیے گھر کی تمام بچیوں کو پڑھانا ان کے ذمہ تھا' نہ صرف گھر بلکہ ہمسایوں' محلّہ داروں اور رشتہ داروں کی تمام بچیاں خاص طور پر قرآن مجید پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھجوائی جاتی تھیں۔ اس دور میں خاص طور پر بچیوں کو سکول بھیجنا انتہائی معیوب خیال کیا جاتا تھا' زیادہ سے زیادہ دو یا تین جماعت اور اس کے بعد ختم...... چنانچہ پھوپھی جی کا دم اس دور میں غنیمت تھا کہ بچیاں بے چاری گھر پر ہی کچھ شد بد حاصل کر لیتیں...... گھر کے علاوہ اڑوس پڑوس اور رشتہ داروں کی بچیاں شام کے وقت پھوپھی جی کے گرد جمع ہو جاتیں اور وہ قرآن پاک کے سبق کے ساتھ ساتھ اردو کا قاعدہ بھی انہیں پڑھا دیتیں۔

پھوپھی جی بتایا کرتی تھیں کہ...... "انہی دنوں کا ذکر ہے کہ اقبال بھائی صاحب کی لکھی ہوئی دعا "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" میاں جی نے مجھے پڑھنے کے لیے دی۔ وہ مجھے اتنی بھلی لگی کہ میں نے فوراً اسے اپنی کاپی میں لکھ لیا اور دن میں کئی کئی بار پڑھا کرتی۔ ایک دن میں نے سوچا کہ کیوں نا بچیاں جو پڑھنے آتی ہیں' ان کو بھی یہ دعا سکھائی جائے۔ چنانچہ ہر روز کچھ کچھ بچیوں کو ازبر کروانی شروع کر دی۔ جب چھوٹی چھوٹی بچیاں لہک لہک کر اسے پڑھتیں اور یاد کرتیں تو سماں بندھ جاتا اور میاں جی بہت خوش ہوتے۔ آہستہ آہستہ پوری نظم بچیوں نے یاد کر لی مگر میں نے اس کی بھنک کسی کو نہیں پڑنے دی کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ اب کی چھٹیوں میں جب بھائی صاحب گھر آئیں گے تو انہیں ایک دم حیران کر دوں گی۔ چنانچہ جب اقبال بھائی صاحب گرمیوں کی تعطیلات میں سیالکوٹ تشریف لائے تو میں نے تمام بچیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ انہیں کس طرح یہ دعا پڑھنا ہے۔ ساری بچیوں میں "ویڑے"! والے بھائی

چراغ کی بچی سائرہ سب سے اچھا پڑھا کرتی تھی چنانچہ اس کو میں نے لیڈر بنایا کہ پہلے وہ پڑھے اور باقی سب اس کے پیچھے پیچھے دہرائیں۔ ان دنوں کافی بچیاں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ گھر سے تو زیادہ تر عنایت ہی ہوتی تھی کیونکہ دوسری بچی وسیمہ تو لاہور بھائی صاحب کے پاس ہوتی تھی' اس کے علاوہ "ویڑے" سے سائرہ' اس کی بہن خورشید پھر ویڑے ہی سے رشیدہ اور حمیدہ' ہمسائے سے بھی دو چار بچیاں آتی تھیں۔ نام یاد نہیں۔ اور پھر خاص طور پر "مہراں"!

اپنی دو بچیوں فاطمہ اور رضیہ کو بھجواتی تھی' گو مہراں کا گھر خاصا دور یعنی "لدھر والی مسجد" کے قریب تھا مگر اس کے باوجود وہ بچیوں کو قرآن مجید پڑھنے کے لیے ملازمہ کے ساتھ بھجوایا کرتی تھیں۔ چنانچہ اس روز سہ پہر کے وقت جب بھائی صاحب قیلولہ فرما کر ابھی اٹھے ہی تھے اور تازہ بھرے ہوئے حقہ سے انہوں نے دو ایک کش ہی لگائے تھے کہ باہر گھر

کے صحن میں ایک دم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" کی صدا گونجی ..... بھائی صاحب اس وقت لاہور کے متعلق کوئی واقعہ سنا رہے تھے' جیسے ہی یہ آواز ان کے کان میں پڑی انہوں نے چونک کر پہلے تو میری جانب دیکھا اور پھر باہر کی طرف نگراں ہوئے کیونکہ اس کے فوراً بعد دوسری صدا بلند ہوئی ..... "زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری" ..... ساری بچیاں پوری طرح آواز ملا کر اتنے پیار سے دعا پڑھ رہی تھیں کہ سب کچھ بھول کر اور ایک دم لپک کر بھائی صاحب باہر صحن میں نکل آئے اور بڑی حیرت کے ساتھ بچیوں کو لہک لہک کر دعا پڑھتے دیکھنے لگے۔ ہم سب بھی ان کے پیچھے آن کھڑی ہوئیں۔ جب تک پوری دعا ختم نہیں ہوئی' وہ یونہی دم سادھے کھڑے رہے۔ جیسے ہی دعا ختم ہوئی' ان کو جیسے ہوش آ گیا اور انہوں نے گلوگیر آواز میں مجھے مخاطب کر کے فرمایا ..... "ہمشیرہ! خدا ان بچیوں کی یہ معصوم دعا قبول کرے اور قوم کے نونہال اسی طرح بڑے ہو کر ملک وملت کا بول بالا کریں ..... آپ نے بچیوں کو بڑی محنت سے یہ دعا سکھائی ہے اور مجھے اس وقت ان کا پڑھنا بہت اچھا لگا ہے"۔ اقبال بھائی صاحب ہمیشہ کے بڑے رقیق القلب تھے چنانچہ اس کے بعد کافی دیر تک گم سم بیٹھے سوچتے رہے' شاید نونہالان قوم کا غم انہیں کھائے جا رہا تھا یا خداوند تعالیٰ سے ملک وملت کی بہتری کے لیے ملتجی تھے۔ اس رات بھائی صاحب خاصے پریشان رہے اور رات گئے تک میاں جی سے بھی اسی سلسلے میں تبادلہ خیالات فرماتے رہے۔ میں بھی بڑی پشیمان سی تھی کہ لاعلمی میں ان کو اس قدر پریشان کرنے کا سامان کر دیا۔ دوسرے روز ان کی طبیعت قدرے بحال ہوئی تو بازار سے تمام بچیوں کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے خرید لائے اور سہ پہر میں جب بچیوں نے دعا ختم کی تو ان میں وہ تحفے تقسیم کیے۔ کسی کو بالوں میں لگانے کا "کلپ" اور کسی کو خوبصورت پراندہ ملا اور ان سب کو بہت شاباش دی اور روزانہ اسی طرح دعا پڑھنے کی تلقین فرمائی ..... میں نے اس روز حالانکہ بچیوں کو دعا پڑھنے سے منع کر دیا تھا کہ بھائی صاحب کی طبیعت مزید پریشان ہو گی مگر وہ خود صحن میں آ گئے اور فرمائش کر کے دعا سنی۔ پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔ اس کے بعد جب بھی بھائی صاحب سیالکوٹ تشریف لاتے تو لاہور ہی سے تمام بچیوں کے لیے تحفے لے کر آتے۔ دعا سننے کے بعد یہ خصوصی تحائف تقسیم کیے جاتے اور "استانی صاحبہ" یعنی میرے لیے خاص الخاص تحفہ لانا کبھی نہ بھولتے"۔

پھوپھی جی بتایا کرتی تھیں کہ یہ سلسلہ کافی عرصہ تک یونہی چلتا رہا یہاں تک کہ تمام بچیاں جوان ہو گئیں اور میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی اور سہ پہر کی پڑھائی کا یہ گھریلو مدرسہ بالکل بند ہو گیا۔

خوش آئند خواب

گزشتہ صفحات میں جس کاپی کا ذکر ہو رہا تھا' اس میں پھوپھی جی نے اشعار کے علاوہ چند یادداشتیں بھی قلم بند کی ہوئی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر ایک خواب ہے جسے انہوں نے خاصی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اپنا یہ خواب جب انہوں نے میاں جی کو سنایا تو انہوں نے اس کی بڑی اچھی تعبیر نکالی۔ پھر انہوں نے یہ خواب اپنے اقبال بھائی صاحب کو خط میں لکھ بھیجا اور علامہ صاحب نے اس کا جو جواب دیا اسے بھی اس کے ساتھ اپنی کاپی میں محفوظ کر لیا۔

پھوپھی جی نے اپنے اس خواب کو اس طرح تحریر کیا ہے:

''چند روز قبل میں نے ایک بڑا مفصل خواب دیکھا...... میں کیا دیکھتی ہوں کہ جیسے ایک لق و دق صحرا میں سفر کر رہی ہوں۔ ہر طرف پر ہیبت خاموشی چھائی ہوئی ہے اور میں ایک بڑے ہی دبلے پتلے اونٹ پر سوار ہوں جو بھوک اور پیاس سے جاں بلب ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس اب گرا کہ تب گرا۔ چلچلاتی دھوپ اور اس انتہائی شدید موسم کی وجہ سے میں بھی قریب المرگ ہوں۔ پیاس سے میری زبان کانٹا ہو رہی تھی۔ اپنے انجام سے باخبر ہونے کے باوجود میری یہی کوشش اور دلی خواہش تھی کہ کسی نخلستان کا نشان نظر آ جائے مگر سوائے سرابوں کے ابھی تک کچھ ممکن نہیں ہوا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک طویل زمانہ گزر گیا کہ میں یوں ہی محو سفر ہوں اور شاید میری قسمت میں کوئی منزل بلکہ نشان منزل بھی نہیں...... اسی بے کسی کی حالت میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اونگھ سی آ گئی اور میں نے ایک ندا سنی کہ دعا کرو اور نبی اکرمؐ پر کثرت سے درود بھیجو...... ایک دم میں نے اپنے آپ کو درود و سلام پڑھتے اور دعائیں مانگتے ہوئے دیکھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف پھیلا ہوا وہ صحرا ایک سرسبز و شاداب وادی میں تبدیل ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو ایک پرشور چشمے کے سامنے پایا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس قریب المرگ اونٹ کی بجائے ایک قد آور اور مضبوط گھوڑا میرے پاس کھڑا ہے اور ایک خارا شگاف تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اچک کر اس گھوڑے پر سوار ہو جاؤں اور تلوار کو ہوا میں زور زور سے لہرانا شروع کر دوں...... درود و سلام ابھی بھی میرے وردِ زبان تھا اور ماحول کی اس تبدیلی نے مجھے مسحور سا کر دیا تھا۔ دوزخ کی طرح دہکتا ہوا وہ خطہ اس طرح جنت نشاں بن چکا تھا کہ میں نے اس کی طراوت اپنی روح کی گہرائیوں تک محسوس کی...... اور پھر کہیں نزدیک ہی سے بڑی خوش الحان اذان کی آواز آنی شروع ہو گئی...... اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی اور اس وقت چاروں طرف

فجر کی اذانیں گونج رہی تھیں''۔

میں نے اسی وقت اپنا یہ خواب میاں جی کو سنایا تو انہوں نے اس کی بڑی اچھی تعبیر نکالی کہ

''یہ بڑا خوش آئند خواب ہے۔ انشاء اللہ عالم اسلام کے لیے بڑا اچھا وقت بہت جلد آنے والا ہے اور وہ وقت اب زیادہ دور نہیں جب تمام مسلمان متحد ہو کر موجودہ آزمائشوں اور ابتلاؤں سے خلاصی حاصل کر لیں گے اور ان کا مستقبل انشاء اللہ بڑا تابناک ہوگا''۔

میاں جی کی بتائی ہوئی تعبیر بڑی خوش کن تھی اور میں بے حد مسرور تھی کہ عالم اسلام کے لیے اتنا اچھا خواب دکھانے کے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اسی روز ایک تفصیلی خط اس سلسلے میں اقبال بھائی صاحب کو لاہور روانہ کر دیا جس میں خواب کی پوری تفصیل کے ساتھ ساتھ میاں جی کی خوبصورت اور ہمت افزا تعبیر بھی لکھ بھیجی۔

دو ایک روز کے بعد اقبال بھائی صاحب کا بڑا طویل جواب موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے میرے خواب کی بڑی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ میاں جی نے بالکل درست تعبیر اس کی نکالی ہے اور ساتھ اپنی طرف سے بھی کچھ اظہار خیال کیا ہوا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس خواب اور اس کی تعبیر کے ساتھ ساتھ میں اس خط کو بھی یہاں مختصراً نقل کر لوں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ خط کہیں دستیاب نہ ہو اور اس میں درج اتنی اچھی اچھی باتیں ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ بھائی صاحب کا خط کچھ اس طرح سے ہے:

لاہور ۸ دسمبر ۱۹ء

ہمشیرہ عزیزہ! السلام علیکم

تمہارا خط مل گیا ہے۔ الحمد للہ کہ گھر میں سب خیریت ہے۔ اس وقت واقعی وہی حالت دنیائے اسلام کی ہے جو تم کو خواب میں دکھائی گئی اور والد مکرم نے جو نتیجہ نکالا وہ بھی خدا کے فضل و کرم سے صحیح ہے اور میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ضرور نئی زندگی عطا فرمائے گا اور جس قوم نے آج تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے' اس کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا۔ مسلمان کی بہترین تلوار دعا ہے' سو اسی سے کام لینا چاہئے۔ ہر وقت دعا کرتے رہنا چاہئے اور نبی کریمؐ پر درود بھیجنا چاہئے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس امت کی دعا سن لیں اور اس کی غریبی پر رحم فرمائیں۔ میں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو بے حد افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی پوری عمر یورپ کا فلسفہ پڑھنے میں گزار دی۔

خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قوائے دینی علوم پڑھنے میں صرف کیے جاتے تو آج خدا اور اس کے رسولؐ کی میں بھی کوئی خدمت کر سکتا اور جب خیال آتا ہے کہ والد مکرم مجھے دینی علوم ہی پڑھانا چاہتے تھے تو اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے صحیح راہ معلوم تھی' مگر حالات نے اس پر چلنے نہ دیا۔ بہر حال جو کچھ خدا کو منظور تھا وہی ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا' میں نے کیا لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا' اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی اکرمؐ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔

والسلام

محمد اقبال' لاہور

میں نے اقبال بھائی صاحب کے خط کا وہ حصہ خاص طور پر یہاں نقل کر لیا ہے جو میرے خواب سے متعلق تھا۔ اصل خط میاں جی کو واپس کر دیا ہے کیونکہ ان کے لیے بھی اس میں کچھ ضروری باتیں ہیں''۔

نانا جان قبلہ کو اپنی ان چھوٹی ہمشیرہ یعنی پھوپھی کریم بی بی صاحبہ سے بے حد پیار تھا اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ بڑی شفقت اور عزت سے پیش آیا کرتے تھے۔ دونوں اوپر تلے کے بہن بھائی تھے اور ایک ساتھ کھیل اور پڑھ کر بڑے ہوئے تھے۔ بچپن میں یقیناً لڑائی جھگڑا بھی ہوتا ہوگا کہ فطری عمل ہے مگر بڑے ہو کر انہوں نے اپنی پیاری بہن کو کبھی اف تک نہیں کہا۔ پھوپھی جی بھی اپنے اقبال بھائی صاحب کا ذکر ہمیشہ بڑے احترام سے کیا کرتی تھیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ اقبال بھائی میرے بڑے بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ میرے پیر بھائی بھی ہیں۔ کیونکہ ہم دونوں نے میاں جی کی بیعت کی ہوئی ہے اور میاں جی ہمارے باپ بھی ہیں اور مرشد بھی۔ شاید اسی لیے تینوں باپ' بیٹے اور بیٹی میں بے حد انسیت تھی۔

خدا کا انصاف

پھوپھی جی ایک دن ایک گھریلو محفل میں یہ واقعہ سنا رہی تھیں کہ...... ''ایک دفعہ میری اپنے دیور کے ساتھ اس بات پر تکرار ہو گئی کہ میں اپنے بڑے بیٹے ظفر الحق کو اس کی خواہش پر لاہور کے کالج میں داخل کروانا چاہ رہی تھی۔ بچوں کے بڑے ہو جانے پر ان کے ددھیال والے اپنا حق جتانے چلے آتے تھے اور ہر بات میں ٹانگ اڑاتے تھے کہ یوں نہیں

یوں صحیح ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ اسی پر مصر تھے کہ لاہور جانا درست نہیں۔ میں نے زچ ہو کر اپنے دیور سے' جو فوج میں اچھے عہدے پر تھے' کہا کہ آپ لوگ اس وقت کہاں تھے جب میں نے اکیلے ہی بچوں کو کن کن مصیبتوں سے پالا پوسا ہے۔ اب یہ کسی قابل ہو رہے ہیں تو آپ کا خون جوش مارنے لگا ہے۔ میری اس صاف گوئی نے ان کو بڑی تکلیف پہنچائی اور وہ جو کچھ منہ میں آیا' بکتے چلے گئے۔ میں نے جواب میں اتنا کہا کہ اچھا آپ کا جو جی چاہے کہیں۔ میرا خدا شاہد ہے۔ وہی میرا انصاف کرے گا۔

میاں جی کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے صبر کی تلقین کی اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ دوسرے روز جب میں میاں جی کی طرف سے اقبال بھائی کو خط لکھنے بیٹھی تو غصے سے مغلوب ہو کر مندرجہ بالا واقعہ من وعن ان کو بھی لکھ دیا اور پتہ نہیں کیا کیا لکھنے کے بعد آخر میں وہی بات لکھ دی:

''اچھا اللہ تعالیٰ سب سے بڑا منصف ہے' وہی میرا انصاف کرے گا''

چند روز کے بعد اس خط کا جو جواب میاں جی کے نام آیا' اس میں اقبال بھائی صاحب نے خاص طور پر میری انصاف والی بات کا ذکر کیا اور مجھے تسلی اور دلاسہ دینے کے بعد ایک بڑے پتے کی بات لکھی کہ:

''دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ انصاف نہ کرے کیونکہ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ البتہ ہمیشہ یہ استدعا کرنی چاہئے کہ وہ ہم پر اپنا فضل وکرم فرمائے''۔

میاں جی بھی یہ بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور مجھ سے کہا کہ اقبال نے بالکل درست لکھا ہے۔ ہر انسان کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے انصاف کو برداشت کرنا واقعی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہمیں ہمیشہ ہی اس کے لطف وکرم اور عفوودرگزر کی امید رکھنی چاہئے اور اسی کے لیے ہر دم دست بدعا رہنا چاہئے۔

راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

(بال جبریل)

محترم شیخ عطا محمد! برادر بزرگ

محترم نانا جان زندگی میں بڑے نظم و ضبط کے عادی تھے۔ تمام عمر فوج میں گزری اس لیے فوجی قواعد و ضوابط ان کی زندگی کا ایک لازمی حصہ بن چکے تھے۔ ان کی پوری زندگی اندرون اور بیرون خانہ بڑے منظم انداز میں گزری۔ ملازمت کے دوران ہمیشہ انگریزی لباس پہنا۔ بڑے جامہ زیب واقع ہوئے تھے۔ والدہ بتایا کرتی تھیں کہ..... ''ابا جان نے ساری عمر بہترین لباس زیب تن کیا۔ ہر وقت ''سوٹڈ بوٹڈ'' رہا کرتے تھے اور جدید تراش خراش کے سوٹ ان کے پاس ہوا کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد روزانہ صبح سب سے پہلے سوٹ، بوٹ، نکٹائی وغیرہ پہن کر تیار ہوتے اور پھر ناشتہ کرتے اور اخبار پڑھتے۔ یہاں تک کہ عمر کے آخری حصہ میں جب پتلون پہننا ترک کر دیا، شلوار قمیض کے اوپر بھی کوٹ اور اس کے ساتھ میچنگ نکٹائی ضرور پہنتے تھے۔ فوج میں ملازمت کی وجہ سے تقریباً ساری عمر گھر سے باہر ہی کٹی۔ بڑا طویل عرصہ بلوچستان کی سرحد پر S. D. O. کے عہدے پر فائز رہے اس لیے گھر پر بہت کم قیام رہا۔ ۱۹۱۲ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سب سے پہلے موجودہ اقبال منزل کو تعمیر کروایا۔ تمام نقشہ جات خود اپنے ہاتھ سے بنائے اور بڑے اہتمام سے تعمیراتی کام اپنی زیر نگرانی کروایا۔ خود چونکہ اس کام کے ماہر تھے اس لیے یہ عمارت بڑی مضبوط اور منفرد قسم کی ہے۔ اس کی تعمیر میں ایسی عجیب و غریب چیزیں استعمال کی گئی ہیں کہ بعض مقامات پر حیرت ہوتی ہے اور اس کے تعمیراتی حسن کو دیکھ کر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

شیخ صاحب بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ طویل القامت، مضبوط ڈیل ڈول اور سرخ و سفید رنگت، چہرے پر بڑی گھنی داڑھی اور سر پر اس زمانے کے رواج کے مطابق پگڑی پہنتے تھے[۲]۔ اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے انہیں والہانہ پیار تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی محمد اقبال کے لیے تو انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ جو کچھ کمایا ان کی بہتری کے لیے خرچ کر دیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو بام عروج تک پہنچانے کے لیے ان کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کو ہی وسیلہ بنایا۔ اس دور میں ایسی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کرنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ شیخ عطا محمد کا ہی دل گردہ تھا کہ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی

کے لیے کسی بات سے دریغ نہ کیا اور ان کی ہر خواہش کا دل و جان سے احترام کیا۔ انہوں نے نہ صرف حضرت علامہؒ کی پڑھائی کے تمام اخراجات برداشت کیے بلکہ ان کے بال بچوں کی بھی دل کھول کر کفالت فرمائی۔ میرے خیال میں آج کے دور میں تو کوئی یہ سب کچھ شاید سوچ بھی نہیں سکتا مگر آفرین ہے شیخ عطا محمد اور ان کے اہل خانہ پر کہ چھوٹے بھائی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ صاحب بڑی سخت طبیعت کے مالک تھے اور انہوں نے چھوٹے بھائی کے بیوی بچوں سے بڑا سخت رویہ روا رکھا۔ اگر ایک شخص اپنی پوری کمائی چھوٹے بھائی پر خرچ کر رہا ہے' اس کو پڑھا رہا ہے' اعلیٰ ترین تعلیم دلوانے کے انتظامات کر رہا ہے اور ساتھ اس کے بیوی بچوں کی کفالت بھی کر رہا ہے تو کیا اس کو اتنا حق بھی نہیں پہنچتا کہ وہ جو اپنے بیوی بچوں کو مشکلات میں ڈال کر یہ سب کر رہا ہے' کسی غلط بات پر تھوڑی باز پرس بھی کر لے۔ اور پھر وہ کوئی غیر تو نہیں۔ اگر کسی غلط کام سے منع کر رہا ہے تو یقیناً اس میں بھلائی کا پہلو مضمر ہے۔

اس دور میں بھائیوں کا بڑا مقام ہوا کرتا تھا اور شیخ صاحب تو حضرت علامہ کے بمنزلہ باپ کے تھے۔ عمر میں ان سے سترہ اٹھارہ برس بڑے تھے۔ انہوں نے جب کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تو اگر کبھی کسی بات پر سخت سست کہہ بھی دیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ انہوں نے جو بھی کیا بہتری کے لیے ہی کیا۔ آخر اپنے باپ بھی تو بچوں پر سختیاں کرتے ہیں اور اس دور میں تو بچوں کو برے بھلے کی تمیز سکھائی جاتی تھی اور جو سیدھی طرح نہیں مانتا تھا اس کے ساتھ سختی بھی کی جاتی تھی۔ اور میرے خیال میں وہی طریقہ درست تھا۔ شیخ صاحب نے اگر بھائی کے بچوں پر سختی کی تو وہ اپنے بچوں پر بھی تو اسی طرح سختی فرماتے تھے۔ اور یہ سب کچھ وہ کسی دشمنی کی بنا پر نہیں' بلکہ ان کے بھلے کے لیے کرتے تھے۔ تاکہ بچوں کی تربیت صحیح خطوط پر ہو اور بڑے ہو کر وہ ایک ذمہ دار شہری کا کردار درست طریقے سے ادا کر سکیں۔ وہ خود چونکہ انتہائی "ڈسپلنڈ" زندگی کے عادی تھے اس لیے اپنے بچوں کو بھی اسی رنگ میں دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اور میری ناقص رائے میں اگر انہوں نے ایسی آرزو کی تو یہ کوئی ایسی غلط اور قابل مذمت چیز نہیں تھی' اگر ایک باپ اپنے بچوں سے بہتری کی امید رکھتا ہے تو وہ یقیناً حق بجانب ہے۔ کاش بچے بھی اس حق کی پاسداری کی ہمت پیدا کریں۔

حال ہی میں "اقبال اور گجرات" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں "فاضل مصنف" نے شیخ صاحب قبلہ پر بے بنیاد الزامات کی بھرمار کی ہے اور اپنے ممدوحین کو مظلوم اور بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور

لگا دیا ہے مگر ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف فرمایا ہے کہ:

''تاہم یہاں یہ یاد رہنا چاہئے کہ شیخ عطا محمد ملازمت کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر گھر سے باہر رہتے تھے' اس لیے تمام تر ذمہ داری ان پر ڈالنا زیادتی ہوگی!''

اس کے جواب میں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا۔ ع

''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا''

خدا تعالیٰ اس قبیل کے افراد کو عقل سلیم سے نوازے۔

یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ شیخ عطا محمد مرحوم بہت جلد غصہ میں آ جاتے تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے غصہ کا پارہ جتنی جلدی چڑھتا تھا' اسی تیزی سے اتر بھی جایا کرتا تھا۔ ایک سچے اور پرخلوص انسان کی طبیعت میں یہ اتار چڑھاؤ ضرور ہوتا ہے۔ وہ چونکہ خود سچ کا پرستار ہوتا ہے اس لیے کسی قسم کا جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ ماضی میں اس قسم کے انسان تو تقریباً ہر گھر میں موجود ہوتے تھے۔ ذرا ان کے مزاج کے خلاف بات ہوئی اور ان کا پارہ ایک دم ساتویں آسمان کی خبر لانے لگا اور میرے خیال میں یہ انہی بزرگوں کی برکت ہے کہ آج ہم کچھ لوگ اب تک پرانی قدروں کو نبھا رہے ہیں۔ اگر ہمارے بزرگ برے بھلے کی صحیح تربیت کا اہتمام ہمارے لیے نہ فرماتے تو خدا جانے اب تک ہمارے معاشرہ کا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔ انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے' اس لیے جب تک اس کو صحیح طریق سے سدھایا نہیں جائے گا وہ حیوان ہی رہے گا۔ جب تک اسے برے بھلے کی تمیز نہیں سکھائی جائے گی' اس کی حیوانی جبلتیں تبدیل نہیں ہوں گی۔ انسان کے بچے کے سامنے آپ آگ اور پانی رکھ دیں وہ یقیناً چمکتی ہوئی آگ کو پکڑنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس چمک میں نقصان کا عنصر مضمر ہے۔ یہ اب ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ جب تک والدین نے بچوں کی درست راستوں کی طرف رہنمائی کا فرض احسن طریق سے نبھایا' معاشرہ صحیح ڈگر پر چلتا رہا مگر جب سے مغرب کی تقلید میں اس فرض سے چشم پوشی ہوئی ہمارا معاشرہ بھی مغربی معاشرے کی طرح مادر پدر آزاد ہو گیا۔ اب نہ کسی کو باپ کا ڈر ہے اور نہ ماں کی شرم۔ جو کچھ جی میں آتا ہے وہ کر گزرتا ہے اور یہی اس تباہی اور بربادی کی بنیادی وجہ ہے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے تو بہت پہلے خبردار کر دیا تھا مگر افسوس کسی نے اس پر کان نہ دھرے۔ گو اس وقت انہوں نے مغرب کو متنبہ کیا تھا مگر درحقیقت اس میں ہمارے

لیے بھی پیغام عمل تھا' لیکن ہم نے اس پر عمل پیرا ہونے کی بجائے الٹی مغرب کی اندھی تقلید شروع کر دی۔ اور اب اسی بھنور کا شکار ہیں جس کی نشان دہی مغرب کے باسیوں کے لیے کی گئی تھی۔ اور ہمارا انجام بھی کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آ رہا۔ چنانچہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی مندرجہ ذیل پیش گوئی نہ صرف دیار مغرب بلکہ اہل مشرق کے لیے بھی درست ثابت ہو رہی ہے:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا!
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا!

ذرا چاروں طرف نگاہ دوڑائیے کیا ہم اسی صورت حال سے دوچار نہیں ہو چکے؟ اگر ماضی میں بچوں کی صحیح تربیت کے لیے سختی کی جاتی تھی تو وہ بالکل درست تھا کیونکہ حیوان ناطق کو انسان ناطق بنانے کے لیے یقیناً اس کی ضرورت تھی۔ جب سے اس ضرورت سے پہلوتہی کی گئی ہے انسانوں کی فصل پیدا ہونا بند ہو گئی ہے۔ کیا مغرب کا یہ نام نہاد انسان واقعی انسان کہلائے جانے کا مستحق ہے؟ کیا یہ انسان ان حیوانوں سے بدتر نہیں جو کبھی کوئی خلاف فطرت عمل نہیں کرتے۔ کہاں ہے وہ انسان جو اشرف المخلوقات تھا؟ میں سمجھتا ہوں اس میں سب سے زیادہ قصور ہم بزرگوں کا ہے' ماں باپ کا ہے' جنہوں نے معمولی سی سردردی سے بچنے کے لیے بچوں کو خودمختار کر دیا...... اپنی فضول مصروفیات میں اس قدر مگن ہو گئے کہ مستقبل کو بالکل فراموش کر دیا...... اپنے نام نہاد آرام کے لیے پورے معاشرے کو داؤ پر لگا دیا...... بچوں کو حیوانوں کے دودھ پر پالا گیا چنانچہ اس میں انسانی کی بجائے حیوانی خصائل پیدا ہو گئے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ صرف اس ایک وجہ سے پوری نسل' انسانی خصائل سے بے بہرہ ہو گئی...... شاید اس میں نئی نسل کا اتنا قصور نہیں ہے کیونکہ اس کو جس جانب ہانکا جا رہا ہے وہ اسی طرف جانے پر مجبور محض ہے۔ جب ان کو بغیر کسی تجربہ کے ہر قسم کے فیصلوں کا اختیار دے دیا جائے گا تو پھر اس کا انجام تو یہی ہو گا۔

اوہ! معاف کیجئے گا میں جذبات کی رو میں کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا...... بات ہو رہی تھی شیخ عطا محمد مرحوم کے غصے کی...... میری والدہ مکرمہ اور میرے والد گرامی بتایا کرتے تھے کہ...... "ابا جان کا غصہ ایک دم آسمان پر چڑھ جایا کرتا

تھا۔ ذرا کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوئی اور وہ گرجنے برسنے لگے مگر پھر ایک دم گھٹائیں چھٹ جاتیں اور روپہلی دھوپ نکل آتی۔ یہاں تک کہ وہ متاثرہ شخص سے معافی تک مانگ لیتے۔ یعنی جیسے ہی معلوم ہوتا کہ غلطی اس شخص کی نہیں ہے اور اس سے زیادتی ہوگئی ہے تو فوراً اس سے معذرت طلب کر لیتے۔ یہ ایک نرم اور صاف دل کے مالک کی نشانی ہے کہ وہ فوراً اپنی غلطی کا اقرار کر لیتا ہے اور اگر کسی کی دل آزاری کا باعث بنا ہو تو معافی مانگ لیتا ہے۔ شیخ عطا محمد مرحوم کی اس اعلیٰ صفت کا ثبوت تو کئی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً اپنے عزیز چھوٹے بھائی کے انتقال کے موقع پر جب آفتاب اقبال وہاں پہنچے تو شیخ صاحب کو ان سے جو ملال تھا' اس کی وجہ سے ان کا غصہ ایک دم آسمان کو چھونے لگا..... مگر بعد میں اپنے رویے میں زیادتی نظر آئی تو آفتاب ماموں کو خط لکھا اور معذرت چاہی۔ اپنے پہلے ہی خط میں جو ۱۰ جون ۱۹۳۸ء کو تحریر کیا' اس کی ابتداء ہی میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا:

''بعد دعا کے واضح ہو مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے اس روز زیادتی ہوئی اور تمہاری برخورداری نے بعد میں مجھے خود نادم کیا۔ غم اور رنج کی حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے''۔[1]

یہ اس شخصیت کی عظمت کی نشانی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس طرح کبھی کسی نے اپنے سے چھوٹوں بلکہ اپنے بیٹوں سے معافی کی درخواست کی ہو۔ کیا اس سے شیخ صاحب کی اعلیٰ ظرفی نہیں جھلکتی۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو شیخ صاحب نے جتنے خط بھی آفتاب ماموں کو تحریر کیے' ان میں یہی ایک جذبہ جھلکتا ہے کہ وہ اس روز کی زیادتی کا ازالہ کسی طور کر سکیں۔ یہاں تک کہ ان دنوں آفتاب اقبال صاحب کی ملازمت کے لیے کشمیر تک کا سفر کیا۔ حقیقتاً ان کے دل میں اپنے بڑے بھتیجے کے خلاف کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا' آفتاب صاحب کی بہتری کے لیے کیا۔ اگر بچپن میں کبھی سخت وست کہا یا جسمانی سزا دی تو اس میں وہی پہلو کارفرما تھا کہ وہ آفتاب صاحب کو انسان بنانا چاہ رہے تھے۔ کیونکہ یقیناً ان میں بھی تمام بچوں کی طرح ایسی خصلتیں ہوں گی جن کی درستگی کے لیے یہ عمل ضروری رہا ہو۔ شیخ صاحب نے اس دور میں اپنے بچوں کو بھی غلط کاموں پر جسمانی سزائیں دیں۔ خاص طور پر اپنے منجھلے صاحبزادے امتیاز ماموں کو بھی اس امتحان سے اکثر و بیشتر گزرنا پڑا کیونکہ ان کا جی پڑھائی میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ آفتاب ماموں اپنے تایا جان کو وہ مقام نہ دے سکے' جس کے وہ حقدار تھے اور ان کے ہر اچھے فعل کو بھی جو یقیناً آفتاب صاحب کے بھلے کے لیے ہی ہوتا تھا' ظلم سمجھتے رہے۔ میرے خیال میں بڑے ہو کر آفتاب ماموں نے جو

ترقی کی اور ان کے اخلاق کے سب لوگ مداح بنے تو اس کی اصل بنیاد بچپن میں ان کے تایا جان شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور کے ہاتھوں ہی رکھی گئی۔

اس کے علاوہ شیخ عطا محمد صاحب کے آفتاب اقبال صاحب کے نام لکھے گئے ان تمام خطوط سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شیخ صاحب اپنے عزیز از جان بھائی کی اس کوتاہی کا بھی ازالہ چاہتے تھے جو دانستہ یا نادانستہ ان سے سرزد ہوئی کہ اپنی وراثت میں سے کچھ حقوق کی ادائیگی رہ گئی۔ یہ اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ روز قیامت اس سلسلے میں کوئی سخت باز پرس ہو۔ اب یہ ان کے ظرف کی بات ہے کہ انہوں نے شیخ صاحب کی اس معصوم خواہش کو غلط رنگ دے لیا اور انہیں اپنے عظیم تایا جان کے خلاف استعمال کیا اور اس پاک باطن انسان کی صاف شفاف تحریروں کو اس طرح پیش کیا کہ وہ انہیں مقدمہ بازی پر ابھارتے رہے' حالانکہ ان کی دلی خواہش صرف اتنی رہی کہ کسی طرح چھوٹے بھائی کے نام کو کسی قسم کی حرف گیری سے محفوظ کر دیا جائے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں مگر شیخ صاحب اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب رہے اور انہوں نے اپنے عزیز چھوٹے بھائی کے لیے آخری قربانی پیش کی اور ان کو صاف بچا لیا...... آپ دیکھئے کہ تمام تر مخالفت کا رخ شیخ صاحب کی طرف ہو چکا ہے' تمام زہر افشانیاں ان کی ذات پر کی جا رہی ہیں اور حضرت علامہ کو انہوں نے اس طوفان سے صاف بچا لیا ہے۔ یہی ان کا منتہائے نظر تھا کہ وہ اپنے عزیز بھائی کو ان الزامات سے بری دیکھنا چاہتے تھے جو شیخ صاحب کے خیال میں نادانستہ ان سے سرزد ہوا تھا۔ وہ بس اتنا چاہتے تھے کہ روز قیامت کوئی ہاتھ ان کا دامن گیر نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے بالکل شہنشاہ بابر کی طرح جس نے اپنے بیٹے ہمایوں کی بیماری اپنے سر لے لی تھی اپنے چھوٹے بھائی جو بالکل ان کو اپنے بیٹوں کی طرح عزیز تھے' کا تمام الزام اپنے سر لے لیا اور اس طرح حضرت علامہ کی پہلی زوجہ محترمہ اور بڑے صاحبزادے کے دلوں سے وہ تمام کدورت صاف کر دی' ان کو علامہ صاحب سے شاید اب کوئی گلہ نہیں بلکہ وہ اب ان کے گن گا رہے ہیں اور ان کے بدلے تمام دشنام طرازیاں اب شیخ صاحب پر ہیں' تمام الزامات کا رخ اب ان کی جانب ہے' تمام زہر اب ان کے خلاف اگلا جا رہا ہے۔ تمام کیڑے ان کی ذات میں نکالے جا رہے ہیں۔ ہر قسم کی برائی ان کی ذات میں نظر آ رہی ہے۔ اور شاید وہ یہی چاہتے تھے اور یقیناً ان کی عظیم روح عالم ارواح میں اپنی اس کامیابی پر متبسم ہو گی اور اپنے عزیز بھائی کو صاف نکال لے جانے پر فرحاں و شاداں ......

شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بعد دو بہنیں محترمہ فاطمہ بی بی اور محترمہ طالع بی بی پیدا ہوئیں۔ ان کے بعد ایک بھائی تولد ہوا جو شیر خواری میں انتقال کر گیا۔ پانچویں حضرت علامہ اقبال تھے اور ان کے بعد دو بہنیں محترمہ کریم بی بی اور محترمہ زینب بی بی۔ اس طرح حضرت علامہ شیخ صاحب کے بعد پانچویں نمبر پر پیدا ہوئے اور عمر میں شیخ صاحب سے سترہ اٹھارہ برس چھوٹے تھے۔ اسی بنا پر شیخ صاحب علامہ صاحب کو بالکل اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ شیخ صاحب کو چھوٹے بھائی جو ان کے اکلوتے بھائی بھی تھے، سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ ہر بات میں ہمیشہ ان کو مقدم رکھتے تھے اور ہر بات میں ان سے ضرور مشورہ لیا کرتے تھے۔ جب اپنا ذاتی مکان تعمیر کیا تو اس کا نام اپنے عزیز چھوٹے بھائی کے نام پر ''اقبال منزل'' رکھا۔ اپنی ساری عمر کی کمائی چھوٹے بھائی کی تعلیم پر خرچ کر دی اور چھوٹے بھائی کی ہر خواہش کا احترام کیا اور انہیں اس بام عروج پر پہنچا دیا جو اس زمانے میں ہر خاص و عام کے بس کی بات نہیں تھی۔

محترم نانا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) یاروں کے یار اور بڑے مجلسی قسم کے انسان تھے۔ اگر کسی معاملے میں کسی سے کوئی وعدہ کر لیتے تو ہر حال میں پورا کرتے۔ وعدہ خلافی ان کی تربیت میں شامل نہیں تھی۔ تقریباً تمام عمر فوج کی ملازمت کی وجہ سے وہ ہمیشہ Order is Order کے قائل رہے۔ حکم عدولی کا تصور بھی ان کے ہاں موجود نہیں تھا۔ شاید اسی بنا پر انہیں بہت سخت مزاج سمجھا جاتا رہا مگر درحقیقت یہ ان کی فطرت بن چکی تھی کہ وہ حکم حاکم پر ہر وقت عمل پیرا رہنے کی وجہ سے انکار کا لفظ سننے کے عادی نہ رہے تھے اور دوسروں کو بھی اور خاص طور پر بچوں کو ایک منظم زندگی کا عادی دیکھنا چاہتے تھے۔ ایفائے عہد کا یہ حال تھا کہ اگر دشمن سے بھی کوئی وعدہ کر لیتے تو ہر حال میں اسے پورا کرنا جزو ایمان خیال فرماتے تھے۔ اس کا ذکر تو کتابوں میں بھی موجود ہے کہ جب انہوں نے اپنے عزیز چھوٹے بھائی کی وفات کے بعد اپنے بڑے بھتیجے آفتاب اقبال سے وعدہ کیا کہ وہ ملازمت کی تلاش میں ان کی مدد کریں گے تو اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے انہیں اس کبرسنی میں کشمیر تک کا سفر کرنا پڑا اور وہاں سے سفارشی خط[1] ان کے لیے لے کر آئے اور ان کی ملازمت کے لیے بھرپور کوشش فرمائی۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ اپنی سخت طبیعت کے باوجود وہ ایک نہایت دردمند دل کے مالک تھے اور زندگی کے سفر میں اپنے بڑے بھتیجے کی بھرپور مدد کے خواہش مند۔ اب اگر کوئی ان کی اس نیک خواہش کو غلط رنگ دیتا ہے تو بہ زبان اقبال یہی کہا جا سکتا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر　　مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

(بال جبریل)

''مرقدے در سایہء دیوار بخش''

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا ایک مشہور شعر ہے۔

کوکبم　راہ　دیدۂ　بیدار　بخش

مرقدے　در　سایہء　دیوار　بخش

(رموز بے خودی)

اس کے مصرع ثانی میں انہوں نے روضہ اطہر کی دیوار کے سایہ میں دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔تمام عمر وہ حج بیت اللہ شریف اور روضہ رسول مقبولؐ پر حاضری کے لیے تڑپتے رہے' مگر حالات نے موافقت نہ کی ......شاید ان کے دل کی حسرت نے اس شعر میں اس طرح جگہ پائی اور وہ خالق کائنات سے یوں ملتجی ہوئے کہ اگر زندگی میں مجھے یہ سعادت نصیب نہیں ہو سکی تو موت کے بعد مرے جسد خاکی کو ہی روضہ اطہر کی چھاؤں نصیب ہو۔

اس سلسلے میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے برادر بزرگ جناب شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور کا ایک ذاتی نوٹ حال ہی میں ایک کتاب کے شروع میں درج ملا ہے۔یہ ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' کا ''اقبال نمبر'' ہے جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔شیخ صاحب نے حسب عادت اس کو بڑی مضبوط چمڑے کی جلد میں محفوظ کیا ہے اور اس کے سرورق پر جہاں لاہور کی عالمگیری مسجد کی تصویر شائع کی گئی ہے۔بڑی احتیاط سے مسجد کے ساتھ ''مزار اقبال'' کی جگہ کی نشان دہی فرماتے ہوئے تصریحاً مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کیا ہے:

''نوٹ:

'اسرار خودی' لکھنے کے بعد علامہ مرحوم نے اپنے واسطے دعا مانگی تھی جس میں اپنی خواہش ظاہر کی ہے کہ میری مرقد روضہ رسول کریمؐ کی دیوار کے سایہ میں ہو۔لیکن دعا قبول ہوئی۔بجائے دیوار کے سایہ کے مینار شاہی مسجد لاہور کے سایہ میں بنی۔اور شعر اس طرح ہو گیا

مرقدے　در　سایہء　مینار　بخش

(دستخط) شیخ عطا محمد

۹۔۷۔۳۸"

مندرجہ بالا تبدیلی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ محترم شیخ عطا محمد صاحب کی طبیعت بھی اپنے چھوٹے بھائی کی طرح خاصی موزوں تھی۔ انہوں نے جس بے تکلفی سے شعر کے مصرع ثانی میں تبدیلی فرمائی ہے اور اس کو حسب حال بنا دیا ہے وہ قابل داد ہے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے شاید ہی کسی سے اصلاح لی ہو سوائے مرزا داغ دہلوی کے اور وہ بھی بالکل ابتدائی زمانے میں۔ مگر ان کے برادر بزرگ نے ان کی وفات کے بعد اس کمی کو بھی بہ احسن پورا کر دیا۔

محترم نظیر احمد صوفیؒ

داماد برادر بزرگ و پورزادہ خواہر بزرگ

والد مکرم جناب نظیر احمد صوفی[1] حضرت علامہ کی بڑی ہمشیرہ محترمہ طالع بی بی خلد آشیانی کے پوتے تھے۔۱۹۳۴ء میں آپ کو علامہ علیہ الرحمۃ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کی دامادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ گو شادی سے قبل بھی انہیں بارہا بارگاہ اقبال میں باریابی حاصل رہی کیونکہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ میرے دادا جان شیخ خورشید احمد مرحوم کے حقیقی ماموں تھے' اس لیے شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے علاوہ بھی اکثر و بیشتر آنا جانا رہتا تھا البتہ جب صوفی صاحب کو داماد کا درجہ حاصل ہو گیا تو صورت حال بالکل تبدیل ہو گئی۔

اپنی شادی[2] کے تقریباً پانچ برس بعد ۱۹۳۹ء کی آخری سہ ماہی میں صوفی صاحب کو مجبوراً مع اہل و عیال خورشید منزل سے مستقل طور پر اقبال منزل میں منتقل ہونا پڑا۔ چنانچہ انہیں اپنے خسر محترم شیخ عطا محمد صاحب کی ان کے مرض الموت میں ہر طرح خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔ میری والدہ بتایا کرتی تھیں کہ ''ان دنوں ابا جان ہر وقت صوفی صاحب کے لیے رطب اللسان رہا کرتے تھے اور ہر کس و ناکس کو یہ بتاتے نہ تھکتے تھے کہ نظیر احمد نے جس طرح میری خدمت کی ہے اور راتیں جاگ جاگ کر میری خبر گیری کرتا رہا ہے' شاید اس طرح میری اپنی اولاد بھی نہ کرتی''۔

آخری وصیت

ان دنوں جب شیخ عطا محمد صاحب اپنی زندگی کے آخری دن گن رہے تھے' ان کے تینوں بیٹے سیالکوٹ میں موجود نہیں تھے۔ چنانچہ میرے والد گرامی نے ہی ان کا ہر طرح خیال رکھا چنانچہ شیخ صاحب ان سے بے حد خوش تھے۔ فوت ہونے سے صرف ایک روز پہلے انہوں نے اپنی جو آخری وصیت کی' اس کا تفصیلی ذکر اکثر والد صاحب کی زبانی یوں سنا ہے:

والد محترم بتایا کرتے تھے کہ...... ''ابا جان نے اپنے انتقال سے صرف ایک روز قبل مجھے خاص طور پر تلقین کی کہ میرا (شیخ صاحب کا) جنازہ صرف اور صرف حنفی العقیدہ سنی مسلمان اٹھائیں اور نماز جنازہ بھی حنفی العقیدہ امام سے پڑھوائی جائے۔ دراصل ان دنوں ابا جی کو اپنے بڑے بیٹے یعنی میرے برادر نسبتی شیخ اعجاز احمد کی طرف سے خدشہ تھا کیونکہ وہ زبردستی شیخ صاحب کو قادیانیت میں گھسیٹنا چاہ رہے تھے۔ ابا جان کی بیماری کے دوران تقریباً ہر روز اعجاز بھائی صاحب کا خط آ جاتا تھا' جس میں وہ اپنے والد کو بیعت ہو جانے کی ترغیب دیتے تھے اور اپنی آخرت سنوارنے کے لیے لکھتے تھے۔ ہر روز ان کا خط پڑھ کر وہ پریشان ہو جاتے تھے اور کڑھتے رہتے۔ اکثر میرے ساتھ اس سلسلے میں بات کرتے تو زاروقطار رونے لگتے کہ آخر اعجاز کیوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور میری عاقبت خراب کرنے پر تلا ہوا ہے۔ انہوں نے بار بار اعجاز بھائی کو یہی جواب دیا کہ میں کسی طور اس کے لیے تیار نہیں ہوں کیونکہ میں مرزا قادیانی کو ایک اچھا مبلغ اسلام تو سمجھتا تھا مگر جیسے ہی دعویٰ نبوت کا شوشہ انہوں نے چھوڑا' میں نے اپنا راستہ ان سے جدا کر لیا اور اب میں ان سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ مگر اعجاز بھائی نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان (ابا جی) کی وفات سے ایک روز قبل جو خط اعجاز بھائی کی طرف سے آیا' اس میں انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ ''میں نے جماعت کو لکھ دیا ہے کہ آپ جلد ہی اپنی بیعت کا خط انہیں لکھیں گے۔ اس لیے میرا خط ملتے ہی آپ ایک کارڈ اس مضمون کا قادیان روانہ کر دیں''۔ اعجاز بھائی ان کو ناجائز تنگ کر رہے تھے اور خواہ مخواہ کا دباؤ ڈال رہے تھے۔ اپنے اس باپ کو اپنی مرضی پر چلانا چاہ رہے تھے جس کے سامنے کبھی ان کی گگی بندھی رہتی تھی۔ وقت وقت کی بات ہے۔ مگر شیخ عطا محمد صاحب بھی شیخ عطا محمد تھے ان کا اس روز کا خط پڑھ کر ان کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس روز وہ پرانے شیخ عطا محمد صاحب جن کے دبدبے سے دیواریں بھی کانپتی تھیں' پورے جلال میں آ گئے اور اس طرح گرجے برسے کہ الامان والحفیظ ......

بھابھی جی کے سامنے اعجاز بھائی صاحب کو خوب کوسا اور سارا غصہ ''مرزا قادیانی'' اور اس کے ''خلیفوں'' پر نکالا اور انہیں بے نقط سنائیں۔ ابا جی نے حسب عادت اسی وقت اس سلسلے میں ایک کارڈ قادیان روانہ کر دیا جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ میرے بیٹے اعجاز نے میرے متعلق جو اطلاع آپ کو دی ہے' وہ بالکل غلط ہے' میرا ایسا کوئی ارادہ کبھی تھا اور نہ ہے اس لیے آپ میری طرف سے کوئی امید نہ رکھیں ......دوسرا کارڈ اسی وقت اعجاز بھائی کو روانہ کیا کہ تم نے یہ بالکل غلط کیا ہے اور میں نے تفصیلی خط قادیان روانہ کر دیا ہے''۔

والد مکرم مزید بتاتے ہیں کہ ''دونوں کارڈ لکھ کر انہوں نے ملازم کے ہاتھ سپرد ڈاک کرنے کے لیے بھجوا دینے کے بعد بھابھی جی کی موجودگی میں مجھے مندرجہ بالا وصیت فرمائی کہ کس طرح ان کا جنازہ اٹھایا جائے اور پڑھایا جائے۔

انہوں نے بھابھی جی کو خاص طور پر کہا کہ اعجاز پوری کوشش کرے گا اس لیے تمہیں اس کا پورا پورا خیال رکھنا ہے اور میں نے جس طرح نظیر احمد کو سمجھایا ہے بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے۔ورنہ روز قیامت میں تم دونوں کا دامن پکڑوں گا' اگر اعجاز کو تم نے میرا جنازہ خراب کرنے کی اجازت دی۔دوسرے روز ابا جی انتقال فرما گئے۔اعجاز بھائی نے پہنچتے ہی احکامات جاری کرنے شروع کر دیے۔چنانچہ بھابھی جی نے انہیں ابا جی کی وصیت کے متعلق واضح طور پر آگاہ کر دیا اور انہیں خاص طور پر تلقین کی کہ تمہارے والد کے حکم کے مطابق سب کام ہوں گے اور میں تمہیں جنازہ پر کسی قسم کے اختلاف کی اجازت نہیں دوں گی۔بھابھی جی نے خاص طور پر مجھے حکم دیا کہ میں ابا جی کی وصیت کے مطابق تمام انتظامات کروں۔چنانچہ میں نے شیخ عطا محمد صاحب کی آخری وصیت کا ہر طرح خیال رکھا اور ان کا جنازہ سنی مسلمانوں نے اٹھایا اور نماز جنازہ حنفی العقیدہ مولانا سکندر خان مرحوم جو ان دنوں اقبال منزل کے بالمقابل مسجد جہانگیری کے پیش امام تھے' نے پڑھائی اور مزار امام علی الحق علیہ الرحمۃ سے ملحقہ قبرستان میں برسوں قبل پختہ بنوائی ہوئی قبر میں انہیں آسودۂ خاک کیا گیا۔اعجاز بھائی نے علیحدہ جنازہ پڑھنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہے''۔

اندھیرا عطا کا مکاں ہو گیا

والد گرامی بتایا کرتے تھے کہ...... ''چچا جان (علامہ صاحب) کی وفات کے بعد جتنا عرصہ ابا جی (شیخ عطا محمد صاحب) زندہ رہے' بس چھوٹے بھائی کے فراق میں زار و قطار روتے اور آہ و زاری کرتے ہی گزری۔آخری دنوں میں تو انہیں کوئی دوسری بات سوجھتی ہی نہیں تھی۔بس ہر وقت چچا جان کا ہی ذکر کرتے رہتے۔چھوٹے بھائی کے پہلے چلے جانے کا انہیں بے حد رنج تھا اور اکثر اپنے کمرے میں بیٹھے حضرت علامہؒ کے مختلف اشعار پڑھتے جاتے اور زار و قطار روتے۔کسی شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار جنہیں معمولی رد و بدل سے اپنے حسب حال بنا لیا تھا' بسا اوقات ان کے وردِ زباں رہتے ؎

اندھیرا عطا کا مکاں ہو گیا　　　　وہ خورشید روشن نہاں ہو گیا

بیاباں ہماری سرا بن گئی مسافر وطن کو رواں ہو گیا
گیا اڑ کے وہ بلبل خوش نوا چمن پائمال خزاں ہو گیا
گرا کٹ کے آنکھوں سے لخت جگر مرے صبر کا امتحاں ہو گیا

میں اگر کبھی صبر کی تلقین کرتا تو ناراض ہو جاتے کہ صبر آخر کیسے کروں کہ میرا قرار جاں اور نور العین مجھ سے چھن گیا...... صبر آئے تو کیسے؟''

حق مست

والد گرامی انہی دنوں کا ایک واقعہ اس طرح بیان فرمایا کرتے تھے کہ...... ''ایک دن ابا جی (شیخ عطا محمد صاحب) کے چند دوست مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ان میں ایک صاحب لاہور میں رہتے تھے اور چچا جان (علامہ صاحبؒ) سے کافی طویل عرصہ فیضیاب ہوتے رہے تھے۔انہوں نے دوران گفتگو جب حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے روحانی کمالات کا تذکرہ کیا تو ابا جی ایک دم جذباتی ہو گئے اور حسب معمول زاروقطار رونے لگے۔جب ذرا طبیعت سنبھلی تو گلوگیر آواز میں فرمایا...... ''اتنے عظیم مقام پر پہنچ جانے کے باوجود بھی اس نے میرے بڑا ہونے کا ہمیشہ ادب ملحوظ خاطر رکھا۔وہ بچپن ہی سے اپنے آپ میں مست رہا کرتا تھا۔اپنے کام سے کام رکھنا اور میاں جی کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اس کو سب سے زیادہ پسند تھا۔میاں جی نے بھی اس کی رہنمائی میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔بچپن سے ہی وہ ان کے اس قدر قریب تھا کہ میاں جی نے اپنا سب کچھ اس کو سونپ دیا۔تہجد اور نماز فجر کے بعد قرآن حکیم کی تلاوت بچپن ہی سے اس کا معمول رہا......شروع سے ہی وہ تلاوت ایسی خوش الحانی سے کیا کرتا تھا کہ سننے والے مبہوت رہ جاتے تھے۔مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کی تعطیلات میں جب وہ یہاں سیالکوٹ آتا تو اکثر یہاں میرے کمرے میں بیٹھ کر صبح جب تلاوت قرآن کرتا تو بازار میں چلتے لوگ رک جاتے۔وہ پیدائشی حق مست تھا......میاں جی نے اس کی بھرپور تربیت کی اور راہ سلوک میں جیسا چاہا تھا ویسا ہی بن کر انہیں دکھا دیا۔اس لیے وہ اس سے بہت خوش تھے''۔

قرعہ فال

میرے والد مرحوم جناب نظیر احمد صوفی نے اپنی جو یادداشتیں قلمبند فرمائی ہیں' ان میں ایک جگہ وہ یوں رقمطراز ہوتے ہیں کہ...... ''سردار چچی جان کی المناک موت کے بعد چچا جان (علامہ صاحب) کو دو چھوٹے بچوں (جاوید اور منیرہ) اور گھر کی دیکھ بھال کی وجہ سے بے حد تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ بچوں اور گھر کو دیکھنے والا کوئی نہ رہا...... چچا جان کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہو رہا تھا۔ ملازمین موجود تھے مگر گھر کی مالکن کے چلے جانے سے سب کچھ چوپٹ ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی ان دنوں کئی ایک بیماریوں کا شکار بنے ہوئے تھے' چنانچہ اس دوہری افتاد نے انہیں بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سیالکوٹ سے اعزاء نے اس سلسلے میں بھرپور کوشش کی۔ شروع میں اباجی اور بھابھی جی نے وہاں قیام کیا پھر امتیاز بھائی اور ان کی بیگم محمودہ بھابھی نے کچھ عرصہ گھر کا نظام چلانے کی سعی لاحاصل کی مگر سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ منیرہ' جو ابھی بالکل کم سن تھی' کسی طرح نہیں بہل رہی تھی...... آخر قرعہ فال میری بیگم کے نام نکلا کہ وہ چونکہ شادی سے قبل ایک طویل عرصہ اپنے چچا جان کے ہاں مقیم رہیں' اس لیے گھر کے تمام رموز سے واقفیت رکھتی تھیں اور پھر دونوں کمسن بھی ان سے کافی مانوس تھے۔ ایک روز بھابھی جی نے خاص طور پر مجھے بلوا بھیجا اور ساری صورت حال میرے سامنے رکھی اور مجھ سے کہا کہ اگر میں کچھ عرصہ کے لیے وسیمہ کو لاہور بھجوا سکوں تو امید ہے کہ جاوید منزل کا انتظام وہ سب سے بہتر طریق سے چلا سکے گی۔ مجھے اس میں کیا اختلاف ہو سکتا تھا۔ میں نے دوسرے روز ہی اپنی بیگم کو ساتھ لیا اور لاہور پہنچا کر بھابھی جی کو اطلاع دے دی''۔

درست انتخاب

صوفی صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں...... ''میری خوشدامن صاحبہ کا یہ انتخاب بالکل درست ثابت ہوا اور حضرت علیہ الرحمۃ کی دختر خواندہ یعنی میری بیگم وسیمہ مبارک کے لاہور پہنچتے ہی جاوید منزل کے تمام درون خانہ مسائل بہ احسن حل ہو گئے۔ عزیزی منیرہ اور جاوید چونکہ اپنی سیما آپا سے بہت مانوس تھے اس لیے ان کی وہ تمام ضدیں' جن سے چچا جان بے حد پریشان ہو رہے تھے ختم ہو گئیں۔ ایک روز جب میں بھی وہاں موجود تھا چچا جان (علامہ صاحب) نے گھر کے نظام کی بحالی پر پورا اطمینان ظاہر کرتے ہوئے ہم دونوں کا بے حد شکریہ ادا کیا اور فرمایا...... ''سیما بیٹی کی آمد

نے مجھے ایک دفعہ پھر گھر کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن کر دیا ہے''۔ انہوں نے مختلف تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان دنوں کسی House Keeper کی تلاش جاری ہے اور امید ہے کہ تب تک سیما یہاں لاہور میں قیام کر سکیں گی۔ انہوں نے خاص طور پر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''نظیر احمد میں آپ سب کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میری پریشانیوں کو سمجھتے ہوئے سیما بیٹی کو یہاں بھجوا دیا ورنہ نہ جانے اس گھر کا کیا حال ہو جاتا؟'' اتنا کہتے کہتے شدت جذبات سے ان کی آواز رندھ گئی۔ میں نے فوراً عرض کیا..... ''چچا جان! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر میں نے کچھ کیا ہے تو اپنا فرض جان کر..... یہ کوئی احسان نہیں ہے۔ آپ ایسی باتیں کر کے شرمندہ نہ کریں''۔ میرے اس جواب نے انہیں مزید دلگرفتہ کر دیا اور وہ کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ان دنوں ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ آواز تو تقریباً بند ہو چکی تھی اور بات چیت میں بڑی دقت محسوس کرتے تھے۔ کئی قسم کی ادویات کا استعمال ہو رہا تھا۔ مختلف ڈاکٹر بلا ناغہ دیکھنے آتے تھے اور حکماء سے بھی مشورے جاری تھے۔ چچا جان چونکہ ہمیشہ خوش ذائقہ ادویات پسند فرماتے تھے' اس لیے حکیم نابینا اور دوسرے حکماء کی تجویز کردہ دیسی ادویات شوق سے استعمال کر رہے تھے۔ ایلوپیتھک ادویات سے انہیں ہمیشہ سے چڑ تھی۔ اس لیے مختلف ڈاکٹر تشریف لاتے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے مگر انگریزی ادویات سے وہ ہمیشہ کی طرح جان بچانے کی کوشش کرتے اور فرماتے کہ ''ایلوپیتھک ادویات بالکل خلاف فطرت ہوتی ہیں اور آدمی کو اس قدر رزچ کر دیتی ہیں کہ اچھا بھلا انسان مریض بن کر رہ جاتا ہے''۔

نورانی محفل

والد محترم مزید لکھتے ہیں کہ..... ''ان دنوں سب سے زیادہ انہیں جس بات کا دکھ تھا' وہ یہ کہ گلے کی خرابی کی بنا پر قرآن پاک کی تلاوت' جو ان کا روز کا معمول تھا' ممکن نہ رہی تھی۔ اس کے ازالے کے لیے انہوں نے ایک خوش الحان قاری کا اہتمام کر رکھا تھا جو بلا ناغہ فجر کی نماز کے بعد تشریف لاتے اور قرآن کی تلاوت انہیں سناتے۔ اس وقت چچا جان پر بڑی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں بھی اکثر و بیشتر اس نورانی محفل میں شریک ہوتا کیونکہ ان کا گھر کے تمام افراد کے لیے خصوصی حکم تھا کہ نماز فجر کے بعد ان کے کمرے میں پہنچ جائیں۔ شروع شروع میں حد ادب کی وجہ سے میں

کچھ گریزاں رہا مگر ایک شام انہوں نے خود مجھے خصوصی دعوت دی کہ ''نظیر احمد! صبح فجر کی نماز پڑھ کر ادھر میرے کمرے میں آجایا کرو'' ۔ مجھے اور کیا چاہئے تھے...... میں تو خود ان سے اجازت طلب کرنا چاہ رہا تھا لیکن اس وقت ان کی جو کیفیت ہوتی تھی اور وہ جس طرح زاروقطار روتے تھے' میں نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کی یکسوئی میں مخل ہوا جائے ۔ مگر اب جب انہوں نے خود اجازت مرحمت فرمادی تو میں جتنے روز جاوید منزل میں ہوتا بلاناغہ تلاوت قرآن پاک سے مستفیض ہوتا ۔ اور واقعتاً میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت کی کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی ۔ چچا جان (علامہ صاحب) کے پاس بیٹھ کر تلاوت قرآن سننے کا اپنا ہی ایک لطف تھا ۔ اس محفل میں جو کیفیت طاری ہوتی تھی' اس کا بیان ممکن نہیں ۔ وہ سرور وہ خودفراموشی اس کے بعد ساری عمر مجھے کہیں نصیب نہیں ہوئی ۔

نہ تخت و تاج میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے!

لحن داؤدی

صوفی صاحب مزید فرماتے ہیں کہ...... '' انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک روز ایک بہت مشہور و معروف قاری جن کا تعلق مصر سے تھا' چچا جان سے ملنے تشریف لائے تو چچا جان نے ان سے تلاوت کلام پاک کی فرمائش کی ۔ ان مصری نژاد قاری اور حافظ قرآن نے دوسرے روز صبح کے وقت آ کر ان کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا ۔ چنانچہ چچا جان نے دوسرے روز صبح گھر کے تمام افراد کو اپنے کمرۂ خاص میں پہنچنے کی اطلاع بھجوائی اور ساتھ ہی منیرہ اور جاوید کو بھی خاص طور پر بلوایا گیا ۔ وہ مصری قاری واقعتاً بے حد پر اثر اور خوش الحان تھے ۔ انہوں نے سماں باندھ دیا ۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان سے نور برس رہا ہے اور یہ ساعت نزول قرآن ہی کی ہے ۔ چچا جان کی بڑی عجیب کیفیت تھی ۔ وہ بستر میں بیٹھے' اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے' اس لحن داؤدی میں گم آنسوؤں کے دریا بہا رہے تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت حاضرین محفل میں شاید کوئی ہی ایسا تھا جو اپنے آنسوؤں پر قابو رکھ سکا ہو...... میری اپنی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں'' ۔

'' چچا جان کو قرآن حکیم سے عشق کی حدوں سے بھی کہیں بڑھ کر عقیدت تھی ۔ عشق رسول مقبولؐ اور قرآن سے محبت ان

کی زندگی کا ماحصل رہے۔ میں نے ان دنوں قرآن پاک کا ایک نسخہ ہمیشہ ان کے سرہانے تپائی پر موجود پایا......"
میرے خیال میں ان دنوں سب سے زیادہ وہ کتاب الٰہی کو ہی پڑھتے رہتے تھے۔ آواز کو بند ہو چکی تھی اور تلاوت ممکن نہیں تھی مگر ابھی آنکھوں میں تو دم تھا......شاید وہ اپنی زندگی کی بجھتی ہوئی شمع کو اکسیر اعظم سے جلا دینے کے لیے کوشاں تھے"۔

ز قرآن پیش خود آئینہ آویز
دگرگوں گشتہٴ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردار خود را
قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

(ارمغان حجاز)

عجز

والد مرحوم اکثر بتایا کرتے تھے کہ......"چچا جان کو اپنی عمر کے آخری حصہ میں حج بیت اللہ شریف اور روضہ رسول مقبولؐ پر حاضری کی خواہش اس قدر تھی کہ ہر وقت یہی ذکر ورد زباں رہتا۔ کوئی بات ہو رہی ہو' گھوم پھر کر بات یہیں پہنچ جاتی تھی مگر ساتھ ہی انہیں یہ غم بھی لگا رہتا تھا کہ وہ کس منہ کے ساتھ اس دربار میں حاضر ہوں گے۔ ہمیشہ اس عزم کا اعادہ فرماتے کہ اگر اللہ نے توفیق بخشی تو حج بیت اللہ کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت مدینہ منورہ میں گزاروں گا۔ مگر ساتھ ہی اس خوف کا اظہار بھی ضرور فرماتے کہ میرے اعمال اس قابل نہیں کہ اس عظیم ہستی کے دربار میں سرخرو ہو سکوں۔ اتنا فرماتے اور زار و قطار رونے لگتے۔ عشق نبیؐ کا یہ عالم تھا کہ حضور انورؐ کا نام نامی ہی سن کر آبدیدہ ہو جاتے اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ ویسے تو تمام عمر ہی زود رنجی کی بنا پر بہت روتے رہے مگر عمر کے آخری حصہ میں اس میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ آنکھوں کی بینائی تک زائل ہو گئی"۔

والد گرامی مزید بتاتے کہ......"ایک دن گھر میں اسی سلسلے میں بات ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو کسی نے کہہ دیا کہ آج کل آپ کی آنکھوں میں تکلیف ہے' آئندہ برس آنکھوں کے آپریشن کے بعد چلے جایئے گا۔ چچا جان بڑے دلگرفتہ

ہوئے اور گلوگیر آواز میں بس اتنا فرمایا:

''آنکھوں کا کیا ہے، آخر اندھے بھی تو چلے جاتے ہیں''

اتنا ہی کہا اور حسب معمول آنکھیں بے طرح برسنے لگیں۔

محترم عبدالغنی راٹھور

بھاوجہ اقبال کے جڑواں بھائی کے صاحبزادے

عبدالغنی راٹھور مرحوم میری والدہ مرحومہ کے حقیقی ماموں زاد تھے۔آپ کے والد گرامی بابو غلام نبی راٹھور مرحوم میری نانی محترمہ مہتاب بی بی خلد آشیانی کے جڑواں بھائی تھے۔بابو غلام نبی مرحوم انتہائی شریف النفس انسان تھے' بے حد پاکیزہ اطوار اور پابند صوم وصلوٰۃ بزرگ۔ہر کس وناکس کو سلام کرنے میں پہل کرنا ان کا شیوہ رہا۔یعنی ہر بات میں سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہونا انہیں بے حد مرغوب تھا۔ماموں عبدالغنی بھی اپنے والد محترم کی طرح بے حد شریف اور سچے انسان تھے۔کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا بلکہ اس کے متعلق سوچنا بھی گناہ تصور کرتے تھے۔پورے خاندان میں اپنے نیک اطوار کی وجہ سے بڑے ہر دلعزیز تھے۔بے چاروں کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی' اس لیے ہم سب بچوں کو اپنے بچوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے۔

''اقبال درون خانہ'' حصہ اول کی ۱۹۷۱ء میں اشاعت کے بعد انہیں بھی کتاب دیکھنے کے بعد چند ایسے واقعات یاد آ گئے جنہیں معمولی خیال کرتے ہوئے انہوں نے فراموش کر دیا ہوا تھا۔چنانچہ اس کے بعد جب بھی ان سے ملاقات ہوئی' کوئی نہ کوئی نیا واقعہ ان کی یادوں کے دفینے سے نکال ہی لیا۔

ماموں عبدالغنی نے بتایا کہ علامہ صاحب اپنے برادر بزرگ کا ایسا احترام فرماتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔اس سلسلے میں انہوں نے اپنا ایک چشم دید واقعہ کچھ اس طرح بیان فرمایا:

تعظیم

''یہ علامہ صاحب کی والدہ ماجدہ کی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے کہ رات کے وقت خاندان کے تقریباً تمام مرد میاں جی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اپنے والد محترم کی دلجوئی میں مصروف تھے کہ اتنے میں پھوپھا جی (شیخ عطا محمد صاحب) کمرے میں داخل ہوئے۔وہ ابھی دروازے ہی میں تھے کہ علامہ

صاحب ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ باقی حاضرین میں سے کسی نے جنبش نہیں کی۔ شاید کسی کو علم ہی نہیں ہوا کہ کیا ہوا ہے۔ کمرے کے اندر آ کر جب پھوپھاجی اپنے والدِ محترم کے پہلو میں بیٹھ گئے تو علامہ صاحب بھی بیٹھے۔ چند لمحوں کے بعد ہی پھوپھاجی کو شاید کوئی کام یاد آ گیا چنانچہ وہ فوراً اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ لیکن فوراً ہی واپس لوٹ آئے۔ وہ ابھی دروازے ہی میں تھے کہ علامہ صاحب پھر تعظیماً ایستادہ ہو چکے تھے اور جب تک پھوپھاجی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ نہیں گئے علامہ صاحب کھڑے رہے۔ اس روز پھوپھاجی شاید بے حد مصروف تھے اسی لیے بار بار باہر چلے جاتے اور پھر آ کر بیٹھ جاتے مگر میں نے ایک بار ایسا نہیں دیکھا کہ علامہ صاحب ان کے لیے تعظیماً ایستادہ نہ ہوئے ہوں۔ اور نہ ہی اس سارے وقت میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا تاثر ابھرا''۔

جنت زیرِ پا

یہ واقعہ ماموں عبدالغنی کا اپنا چشم دید تو نہیں البتہ اپنے والد گرامی جناب غلام نبی صاحب کی زبانی شنید ہے۔ وہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ کسی نے علامہ صاحب سے استفسار کیا کہ آپ ابھی تک حج بیت اللہ شریف کے لیے کیوں تشریف نہیں لے گئے۔ اتنا سننا تھا کہ علامہ صاحب کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ کافی دیر اسی طرح گریہ ان پر طاری رہا' بے چارہ پوچھنے والا بھی بے حد نادم اور شرمسار سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب قدرے طبیعت سنبھلی تو چھلکتی آنکھوں کے ساتھ فرمایا کہ..... ''بھائی! جتنی میری استطاعت ہے اور جس قدر ابھی تک توفیق ارزانی ہوئی ہے' اس کے مطابق ہر سال حج پر جاتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ کا اذن ابھی تک نہیں ہوا''۔ پوچھنے والا بڑا حیران ہوا اور دوبارہ پوچھا کہ حضرت کبھی سنا نہیں کہ آپ حج بیت اللہ پر تشریف لے گئے ہیں چہ جائیکہ آپ ہر سال کی بات کر رہے ہیں۔ علامہ صاحب بڑے اداس ہو گئے اور بڑی حسرت سے وضاحت فرمائی کہ..... ''ہم گنہگاروں کی قسمت ابھی اتنی یاور نہیں کہ بیت اللہ کی زیارت نصیب ہوتی ..... ابھی تو بس ''جنت زیرِ پا'' تک ہی رسائی ہے اور اس کی زیارت کو ہی حج کا نعم البدل جان کر بہلے ہوئے ہیں اور اس کی عنایت خاص کے منتظر ہیں کہ کب ہم پر بھی لطف و کرم کی بارش کا نزول ہوتا ہے''۔

پوچھنے والے کے لیے شاید ان کے جواب کی تہہ تک رسائی ممکن نہ ہوسکی' اس لیے بے چارہ ایک بار پھر مزید وضاحت کا طالب ہوا۔علامہ صاحب پوچھنے والے کی پریشانی پر ہلکا سا مسکرائے اور یوں ان کی تسلی فرمائی ...... ''شاید سب کو علم ہے کہ ہر سال گرمیوں کی تعطیلات میں خاص طور پر میں سیالکوٹ ضرور چلا جاتا ہوں اور وہاں اپنے والدین کی خدمت میں حاضری دیتا ہوں۔ اب اس حقیقت سے کون واقف نہیں ہے کہ ''ماں کے قدموں میں جنت ہے'' چنانچہ ابھی تک تو اپنی رسائی بس اسی ''جنت زیرِ پا'' تک ہی ہے''۔

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اپنے والد گرامی جناب شیخ نور محمد صاحب کو بجا طور پر اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔اور واقعتاً ان کے والد محترم اور والدہ ماجدہ نے ہی ان کی ابتدائی تربیت فرمائی اور راہ سلوک کی منازل طے کروائیں۔ والد اقبال بلا شبہ ایک صوفی منش اور اللہ والے بزرگ تھے۔اپنے بلند اقبال فرزند ......جس کی بلند اقبالی کی بشارت پیدائش سے قبل ہی انہیں مل چکی تھی' کو راہ حق پر قدم قدم چلنا انہوں نے خود سکھایا ......اتنا عظیم فرزند اور مرید قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتا ہے جس نے ان کی ہر خواہش کا احترام کیا اور ہر طرح سرخرو ہوا۔

جب میاں جی کا دم واپسیں قریب تھا تو حضرت علامہ پر رنج والم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور جس وقت ان کا انتقال ہو گیا تو علامہ صاحب پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ماموں عبد الغنی اس وقت کی کیفیت یاد کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ......''مسلسل تین دن علامہ صاحب دنیا و مافیہا سے بالکل بے نیاز سے رہے۔ اقبال منزل کے پچھواڑے میدان میں زمین پر دریاں بچھائی جاتی تھیں اور حسب رواج فاتحہ خوانی کے لیے بیٹھتے تھے' یہی دستور زمانہ ہے' تین دن ملنے جلنے والے' دوست واحباب' رشتہ دار سب آتے رہے اور فاتحہ خوانی کرتے رہے۔علامہ صاحب بھی وہیں ایک دیوار کا سہارا لیے گم سم بیٹھے رہے اور فاتحہ خوانی میں خاموشی سے شرکت کرتے رہے۔نہ نہائے نہ کپڑے بدلے' گرمیوں کے دن اور اگست[1] کا مہینہ تھا۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہوں نے دنیا سے ہر قسم کا ناطہ توڑ لیا ہے۔باپ کے غم نے انہیں بالکل بے حال کر دیا تھا۔آخر تیسرے روز جب ختم قل ہو گئے تو پھوپھا جان (شیخ عطا محمد) نے ان کو بہلانا چاہا حالانکہ ان کا اپنا حال بھی ابتر تھا۔مگر پھر بھی وہ بڑے تھے' چنانچہ علامہ صاحب کو پیار سے گلے لگایا' دلاسہ دیا' اور فرمایا ......''بالے! پہلے تو ہم دونوں مسکین تھے' آج یتیم بھی ہو گئے''۔ اتنا کہا اور چھوٹے بھائی کو گلے لگا کر پھوٹ

پھوٹ کر رونے لگے۔ پھوپھا جان کو اپنی والدہ کی وفات کا بھی بے حد دکھ تھا اور وہ ہمیشہ ان کو یاد کر کے بے حد و حساب رویا کرتے تھے۔ آج پھر ان کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس کا ذکر تو علامہ نے اپنی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" بھی اس طرح کیا ہے۔

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سرو بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ
تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

پھوپھا جی دلاسہ چھوٹے بھائی کو دینے لگے تھے اور ہاتھوں سے خود نکلے جا رہے تھے۔ آخر میرے والد صاحب (بابو غلام نبی صاحب جو شیخ عطا محمد صاحب کے برادر نسبتی تھے) اور شیخ غلام رسول صاحب (شیخ عطا محمد صاحب اور علامہ صاحب کے بہنوئی) نے بڑی مشکل سے دونوں بھائیوں کو تسلی دی اور خاموش کرایا اور میاں جی کے کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ مگر اس کمرے میں پہنچ کر ایک بار پھر ان پر گریہ طاری ہو گیا"۔

(ب) بیرونِ خانہ

۱۔ محترم مولانا غلام رسول صاحب مہرؔ

(الف) چند یادیں اور واقعات

(ب) ذکر اقبال ..... مولانا مہرؔ یا مولانا سالکؔ؟

(مولانا مہرؔ حقائق سے پردہ سرکاتے ہیں)

۲۔ محترم سید امتیاز علی صاحب تاجؔ

چند بھولی بسری یادیں

یہاں حیاتِ اقبال کی چند بیرونِ خانہ سرگرمیاں بھی نذرِ قارئین ہیں جو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے فیض یافتہ دو بزرگوں مولانا غلام رسول مہؔر اور جناب امتیاز علی تاؔج کی وساطت سے ہم تک پہنچ رہی ہیں۔ ان دونوں کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے ان واقعات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

محترم مولانا غلام رسول مہرؔ

چند یادیں اور واقعات

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کا مسودہ جب بزم اقبال لاہور کی جانب سے محترم مولانا غلام رسول صاحب مہرؔ کو پیش لفظ کے لیے بھجوایا گیا تو انہوں نے چند مندرجات کے متعلق میرے ساتھ تبادلہ خیال کرنا چاہا' چنانچہ سید امتیاز علی صاحب تاجؔ' ناظم مجلس ترقی ادب' جو ان دنوں بزم اقبال کے معتمد اعزازی بھی تھے' کی طرف سے مندرجہ ذیل خط مجھے ملا:

لاہور ۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء

محترمی ومکرمی صوفی صاحب' السلام علیکم

آپ کی کتاب ''اقبال درون خانہ'' دیباچہ لکھنے کے لیے مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب کی خدمت میں بھیجی گئی تھی۔ مہرؔ صاحب نے کتاب کو پسند فرمایا ہے' البتہ وہ بعض مقامات پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ اگر چند نکات باہم گفتگو سے حل ہو جائیں تو وہ کتاب پر دیباچہ لکھنے کے لیے بخوشی رضامند ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس علمی ملاقات کو آپ پسند فرمائیں گے۔ ہو سکے تو اولیں فرصت میں لاہور تشریف لے آئیں اور دفتر سے کوہر نوشاہی صاحب کو ساتھ لے کر مہرؔ صاحب سے مل لیجیے۔ توقع ہے اس ملاقات سے کتاب کے مطالب میں بعض اہم اور خوش گوار اضافے ہوں گے۔ امید کہ آپ بعافیت ہوں گے۔

والسلام

جناب خالد نظیر صوفی صاحب
سیالکوٹ

(دستخط) سید امتیاز علی تاج
ناظم مجلس ترقی ادب' لاہور

چنانچہ مولانا مہرؔ سے ان کے گھر پر (مسلم ٹاؤن) ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں جسمانی طور پر خاصے ضعیف ہو چکے تھے مگر حافظہ بالکل درست تھا۔ کچھ عرصہ قبل چونکہ خاصے علیل رہے' اس لیے نقاہت محسوس کر رہے تھے۔ اس روز وہ کافی دنوں کے بعد اپنے دفتر میں بیٹھے تھے چنانچہ ملاقات قدرے مختصر رہی مگر پھر بھی انہوں نے کئی ایک مفید مشوروں سے نوازا اور ''اقبال درونِ خانہ'' کے چند ایک مندرجات کے متعلق تبادلہ خیالات کے بعد ''پیش لفظ'' کے لیے آمادگی ظاہر فرما دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وعدہ لیا کہ آئندہ ماہ ایک بار پھر تشریف لائیں' تب تک پیش لفظ تیار ہو گا۔ آج کی اس مختصر سی ملاقات سے میری تسلی نہیں ہوئی اس لیے میں آپ سے تفصیلاً گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور اپنے پاس محفوظ رکھی ہوئی چیزیں آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ اپنی کسی آئندہ کتاب میں ان کو بھی جگہ دے کر مجھ پر احسان فرمائیں۔ ان کا ارادہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق ایک ڈائری لکھنے کا تھا مگر اپنی موجودہ صحت کی حالت کو دیکھتے ہوئے ان کا خیال تھا کہ شاید اس میں کامیابی ممکن نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کی خواہش کی تکمیل میں دو ایک بار مزید حاضر ہوا اور خاصی تفصیلی ملاقاتیں ان سے رہیں۔ زبانی معلومات کے علاوہ چند کاغذات جن پر انہوں نے چند یادداشتیں حضرت علامہؒ کے بارے میں تحریر کر رکھی تھیں' میرے حوالے کیے تا کہ انہیں کسی آئندہ کتاب میں شامل کر سکوں۔ وہ نامکمل سی تحریر تب سے میرے پاس رکھی رہی کیونکہ اس طویل عرصہ میں کچھ مزید لکھنا میرے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ اب ایک طویل عرصے کے بعد جناب مہرؔ سے کیا ہوا وعدہ ایفا کر رہا ہوں۔

مولانا غلام رسول مہرؔ کو میں نے علامہ اقبالؒ کا ذکر بالکل اپنے پیر و مرشد کی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ان کا نام اس قدر عقیدت و احترام سے لیتے تھے کہ میں نے بہت کم لوگوں کو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا اس قدر گرویدہ دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مجھ سے اس قدر نیازمندی کا اظہار فرماتے کہ میں عجیب سا محسوس کرنے لگتا۔ دو ایک بار میں نے عرض بھی کیا کہ قبلہ آپ میرے بزرگ ہیں' مجھے اس طرح گنہگار نہ کریں۔ مگر وہ ہمیشہ یہ کہہ کر لاجواب کر دیتے کہ..... ''میں تو اقبال علیہ الرحمۃ کے خادموں کا بھی خادم ہوں۔ آپ تو پھر ان کا خون ہیں۔ مجھے اس سعادت سے محروم نہ کریں کہ عمر کے اس آخری حصہ میں خاندان اقبالؒ کے ایک فرد سے نیازمندانہ مل سکوں''۔

اپنے اسی جذبے کا اظہار وہ اپنے ایک خط میں بھی فرماتے ہیں' جو انہوں نے میرے اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا جس میں ''اقبال درونِ خانہ'' کے سلسلے میں ان سے پیش لفظ کے متعلق استفسار کیا گیا تھا۔ میں نے رسم زمانہ کے

مطابق ایک جوابی لفافہ اس میں رکھ دیا تھا جس کا انہوں نے برا منایا اور ایک سادہ لفافہ خط کے ساتھ واپس روانہ کیا۔
ان کا متذکرہ خط کچھ اس طرح ہے:

مولانا غلام رسول مہرؔ کے والا نامے کے متن کی نقل

۱۵۔۰۲۔۱۹۷۱

باسمہ سبحانہ

عزیزم مکرم!

ابھی میری طبیعت بحالی کی اس منزل پر نہیں پہنچی کہ جو کچھ لکھنا ضروری ہے لکھ دوں۔ امید ہے انشاءاللہ ایک ہفتے میں خدا کی رحمت سے ضعف جاتا رہے گا اور میں بے تکلفی سے بیٹھ کر لکھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ آپ جو کاغذات[1] دے گئے تھے احساس ہوا کہ ان کا کچھ نہ کچھ حصہ رہ گیا ہے۔ میں خود بھی ضعف ہی کے باعث ادھر[2] نہیں جا سکا۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ آپ نے جواب کے لیے لفافہ بھیجنے کا تکلف ضروری سمجھا اور مجھ دعا گوئے دیرینہ کو ایک لفافے کے اسراف کی بھی تکلیف دینا گوارا نہ فرمایا۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ کا لفافہ میں نے استعمال کر لیا۔ اس کی جگہ لفافہ حاضر ہے۔ میں یہ چند سطریں دفتر سے اٹھتے اٹھتے لکھ رہا ہوں۔ انشاءاللہ مزید چند روز میں لکھنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ والسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہٗ۔ اپنے تمام اعزا کی خدمت میں میری طرف سے نیازمندانہ سلام ودعا پہنچائیں۔

آپ کا

مہرؔ

درسِ قناعت

مولانا مہر اپنی شخصیت کی تشکیل میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا دخل سب سے زیادہ مانتے تھے۔ ہمیشہ یہی فرماتے کہ ..... ''اگر میں علامہ اقبالؒ کے نیاز حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو یقیناً وہ کبھی نہ بن پاتا' جو آج میں ہوں''۔ مہر صاحب ۱۹۲۲ء میں حضرت علامہؒ کی خدمت میں پہلی دفعہ باریاب ہوئے۔ ان دنوں مولانا اپنے عنفوانِ شباب میں تھے اور روزنامہ ''زمیندار'' میں کام کرتے تھے۔ مجلسِ اقبال میں بلاناغہ حاضری ان کا معمول تھا۔ اگر کبھی دیر سویر ہو جاتی تو علامہ صاحب کا بلاوا آجاتا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ..... ''دنیا سے بے نیازی اور ہر حال میں قناعت کا درس میں نے بارگاہِ اقبال سے ہی حاصل کیا۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنی زندگی میں بے حد تکالیف اور بے شمار مصائب کا سامنا کیا لیکن قناعت اور شکر کا دامن کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ بہت کم انسان ایسے دگرگوں حالات میں ثابت قدمی کا ثبوت دے پاتے ہیں لیکن علامہ صاحب کے پائے ثبات میں کبھی معمولی سی لغزش کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا''۔

ولیء کامل

مولانا پورے وثوق کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ..... ''حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ بلاشک وشبہ ایک ولی کامل تھے۔ میں نے ولیوں کی تمام تر صفات ان میں یکجا پائیں۔ وہ ایک سچے عاشقِ رسول صلعم تھے۔ میں نے بڑے بڑے متقیوں اور پرہیزگاروں کو دیکھا ہے کہ حضورِ سرورِ کائنات ﷺ کا ذکرِ مبارک ان کے لیے کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ مگر ..... اقبال ..... اللہ اللہ ..... شرفِ انسانیت کا ذکر ان کے سامنے آجاتا تو ان پر اس طرح رقت طاری ہو جاتی کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اگر کبھی کوئی حضورؐ کا نامِ نامی گستاخی سے لے لیتا تو ایک دم بھڑک اٹھتے۔ اس زمانے میں انگریزی زدہ نوجوان جب حضور ﷺ کا ذکر ''محمد صاحب'' کہہ کر کرتے تو آپ فوراً ان کو ٹوک دیتے اور بڑی سختی سے سرزنش فرماتے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے سرورِ کائناتؐ کی شان میں گستاخانہ کلمات ادا کیے ..... حضرت علامہؒ کو تاب کہاں' آپ کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور آپ جلال میں آگئے۔ اس گستاخ کو اسی وقت محفل سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ مولانا حالی کی مسدس سے انہیں عشق تھا اور ہمیشہ پڑھ کر بے اختیار روتے تھے۔ جب

کبھی بھی کوئی پر اثر نعت سنتے تو آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ جاتی''۔

مولانا مہر ۱۹۲۲ء میں حضرت علامہ اقبالؒ سے اپنی اولیں ملاقات کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں انہیں بارگاہِ اقبالؒ میں پیش ہونا پڑا اور خود ہی اپنا دفاع کرنا پڑا۔.....

پہلی حاضری

''حضرت علامہ اقبالؒ سے میرے ذاتی تعلق کی ابتدا ۱۹۲۲ء میں ہوئی اور ایک عجیب واقعہ اس کا سبب بن گیا۔ میں نومبر ۱۹۲۱ء میں ''زمیندار'' سے وابستہ ہو گیا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر مجھے گھر پر رکنا پڑا۔ فروری ۱۹۲۲ء میں میں مستقل طور پر لاہور آ گیا۔ میں اس زمانے میں دفتر ''زمیندار'' (جہازی بلڈنگ۔ بیرون دہلی دروازہ) ہی میں رہتا تھا۔ ہم یعنی میں، شفاعت اللہ خان مرحوم، منیجر ''زمیندار'' اور میکش مرحوم، شام کے وقت گول باغ کی اندرونی سڑکوں پر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے ٹہلا کرتے تھے۔ ایک روز ہم لوہاری دروازہ کے قریب لوٹ کر آ رہے تھے کہ چوہدری محمد حسین مرحوم اتفاقیہ مل گئے۔ وہ ہمارے ساتھ باتیں کرتے کرتے موچی دروازے اور اکبری دروازے کے درمیان تک آئے۔ شفاعت اللہ خان نے فرمائش کی کہ ''چوہدری صاحب! ڈاکٹر صاحب (حضرت علامہ علیہ الرحمۃ) کے ایسے اشعار سنایئے جو کہیں چھپے نہ ہوں''۔ انہوں نے چار شعر سنائے۔ موچی دروازہ سے آگے بڑھ کر انہوں نے قلعہ گوجر سنگھ کا رخ کر لیا جہاں وہ ان دنوں رہتے تھے.....بعد ازاں وہی مکان خرید کر انہوں نے ایک نئی بلڈنگ بنوا لی تھی......ہم ''زمیندار'' کے دفتر میں پہنچ گئے۔

وہاں شفاعت اللہ خان نے اصرار کیا کہ جو شعر سنے تھے وہ یاد کر کے لکھ دو۔ میں نے چند منٹ میں چاروں شعر لکھ دیئے اور وہ اگلے روز ''زمیندار'' میں چھپ گئے۔ مجھے قطعاً علم نہ تھا کہ حضرت علامہ مرحوم کی اجازت کے بغیر ان کے اشعار چھاپنا غیر مناسب ہو گا۔ اس سے اگلے روز چوہدری صاحب سہ پہر کے وقت میرے پاس دفتر ''زمیندار'' میں پہنچے اور پوچھا ''تم نے یہ شعر کہاں سے نقل کیے؟'' میں نے کہا کہ آپ ہی نے تو کل شام کو سنائے تھے۔ شفاعت اللہ خان نے اصرار کیا اور میں نے کاغذ پر لکھ دیئے۔ چوہدری صاحب نے فرمایا ''سچ کہتے ہو؟'' میں نے کہا ''مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بولے ''چلو میرے ساتھ'' میں نے پوچھا ''کہاں؟'' فرمایا ''ڈاکٹر صاحب کے

پاس۔‘‘

حضرت علامہ اس زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے۔ میں چوہدری صاحب کے ساتھ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں پہنچے تو ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے اب تک احساس ہے کہ وہ متوسط درجے کا مربع کمرہ تھا۔ اس کے شمال مشرقی گوشے میں حضرت علامہ ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حقہ پاس رکھا تھا۔ چوہدری صاحب ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور پاس کی دوسری کرسی پر میں بیٹھ گیا...... میں سہا ہوا تھا کہ خدا جانے باز پرس کیا شکل اختیار کرے۔

چوہدری صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ’’لیجئے‘ ملزم حاضر ہے‘‘۔ حضرت معاً میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا...... ’’آپ نے یہ شعر کہاں سے لیے؟‘‘ انداز میں سختی و درشتی تو نہ تھی لیکن سنجیدگی اتنی تھی کہ میری پریشانی میں اضافہ ہی ہوا۔ میں نے سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔ فرمایا: ’’آپ سچ کہتے ہیں؟‘‘ میں نے بہ ادب عرض کیا کہ ’’حقیقت وہی ہے جو میں نے عرض کر دی‘ آپ کو شبہ ہو تو اور شعر سنا کر تجربہ فرمالیں۔ اچھے شعر اللہ کے فضل سے مجھے بھولتے نہیں‘‘۔ اس پر حضرت مسکرائے اور فرمایا ’’یہ حافظہ تو بڑا خطرناک ہے‘‘۔ اس پر معاملہ ختم ہو گیا۔ یہی واقعہ میرے ذاتی تعلق کا سبب بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت مرحوم میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ میں اس زمانے میں پرانی میوہ منڈی کے قریب فلیمنگ روڈ پر رہتا تھا اور میرا مکان بیڈن روڈ سے قریب تھا۔ پھر میں بیڈن روڈ پر آ گیا اور میرا مکان وہی تھا جس کی نچلی منزل میں شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی نے قومی دواخانہ قائم کیا تھا۔

اب شاہ ابوالمعالیؒ کے آس پاس بے شمار عمارتیں بن گئی ہیں لیکن ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک وہاں کوئی عمارت نہ تھی۔ کھلا میدان تھا‘ جس میں دن کے وقت دھوبی کپڑے دھو کر سکھایا کرتے تھے اور میں زیادہ سے زیادہ پانچ چھ منٹ میں حضرت علامہ کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ خود حضرت بھی وقتاً فوقتاً علی مراد اور علی بخش کو بھیج کر بلا لیتے تھے۔ غرض آٹھ دس سال تک میرا جانا آنا بہت رہا۔ میں دسمبر ۱۹۳۲ء میں مسلم ٹاؤن آ گیا۔ پھر بھی روزانہ یا دوسرے تیسرے روز حضرت کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اقبال روڈ (جو اس زمانے میں میو روڈ کہلاتی تھی) پر منتقل ہو گئے۔ وہاں بھی ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور حاضری کا شرف حاصل کرتا رہا‘‘۔

بابرکت صحبت

مولانا مہرؔ بتاتے ہیں کہ...... ''جس تعلق کی ابتدا ۱۹۲۲ء میں اس طرح ہوئی کہ میں ایک مجرم کی حیثیت میں بارگاہ اقبالؒ میں لے جایا گیا تھا مگر اس پہلے روز سے ہی یہ تعلق ایک طرح سے مرشد اور مرید کا سا قائم ہو گیا اور جوں جوں وقت گزرتا رہا' اس میں ایسی پختگی اور شیفتگی آتی گئی کہ نہ تو مجھے ان سے ہر روز ملے بغیر چین آتا تھا اور نہ ہی وہ ایک روز کا ناغہ برداشت فرماتے تھے''۔

مولانا ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''یہ میری ہوشمندی کی زندگی کا ابتدائی دور تھا۔ حضرت مرحوم کے پاس مسلسل بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا' ان کے ذاتی اوصاف ومحامد کا پورا پورا اندازہ ہو گیا اور یوں حضرت کی ذات گرامی کے ساتھ بڑی شیفتگی پیدا ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ شیفتگی مجھ ناچیز کی زندگی کی ایک بہت بڑی دولت ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ میں دنیوی معاملات سے بے نیازی' خودداری اور قناعت کی جو حقیری پونجی ہے' یہ اصلاً حضرت علامہ مرحوم ہی کی بابرکت صحبت کا نتیجہ ہے۔ تمام معلاملات پر اسلامی نقطہ نگاہ سے غور وفکر کا سلیقہ بھی مرحوم ہی کی صحبت میں سیکھا۔ البتہ یہ عرض کر دینا چاہئے کہ ہر بزرگ ہستی سے بقدر ہمت و استطاعت ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ خواجہ حافظ کیا خوب فرما گئے ہیں۔

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ہست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

میری جیسی بھی تربیت ہوئی' اس میں بہت بڑا حصہ حضرت علامہ اقبالؒ ہی کا ہے۔ دوسری شخصیت جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا...... مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم کی تھی۔ ان کے پاس بیٹھنے کے مواقع بہت کم میسر آئے۔ ہاں ان کے علمی افادات سے میں بہت مستفید ہوا''۔

ژرف نگاہ اقبالؒ فقید المثال ہے
دیکھا جسے نصیب اسی کا بدل گیا

مرغوب الطبع

مولانا غلام رسول مہر چونکہ بلاناغہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اکثر اوقات پورا پورا دن ان کی خدمت میں بیٹھے رہتے تھے' اس لیے ظاہر ہے کہ کھانا پینا بھی علامہ صاحب کے ساتھ ہوتا ہوگا۔ اس لیے میرے خیال میں گھر کے افراد کے بعد مولانا کو حضرت علامہ کی طبیعت کے متعلق اور ان کی پسند و ناپسند کے بارے میں خاصا ادراک ہونا چاہئے اور یقینی طور پر یہ ان کی طبیعت میں کسی حد تک دخیل بھی رہے ہوں گے۔ اس لیے مولانا یقیناً علامہ صاحب کی خوراک کے بارے میں زیادہ باوثوق رائے دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولانا مہر بجا طور پر فرماتے ہیں:

''حضرت علامہ کھانا بہت کم مقدار میں کھاتے تھے۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا' اس سے پہلے ہی وہ رات کا کھانا بالکل ترک کر چکے تھے۔ سردیوں میں آٹھ بجے (شب) کے قریب دو عدد ''نان خطائیاں'' کھا کر کشمیری (سبز) چائے کی ایک پیالی پی لیتے تھے۔ کھانوں میں انہیں پلاؤ بہت مرغوب تھا۔ سیخ کے چٹ پٹے کباب بہت پسند تھے۔ لیکن چٹ پٹی چیزیں کھا کر انہیں عموماً درد گردہ یا نقرس کا دورہ شروع ہو جاتا جو ان کے لیے عموماً بہت پریشان کن ثابت ہوتا۔ مگر جب تک یہ شروع نہ ہو جاتا بعض اوقات عصر کے وقت سیخ کباب تقریباً روزانہ کھا لیتے چونکہ وہ بے حد پسند تھے مگر جیسے ہی درد گردہ یا نقرس حملہ آور ہوتا تو آئندہ کے لیے توبہ کر لیتے۔ مگر یہ توبہ قائم رکھنا بہت مشکل ہو جایا کرتا''۔

منجانب اللہ

علامہ علیہ الرحمۃ کو کھانے میں بے حد اعتدال سے کام لیتے تھے مگر آخر انسان تھے کبھی نہ کبھی بے اعتدالی ہو ہی جاتی تھی۔ اور پھر ایک کشمیری مسلمان تو کھانے کا اس قدر شوقین ہے کہ وہ اچھے اور چٹ پٹے کھانوں کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے پر ہر وقت تیار رہتا ہے' خواہ وہ اس کی صحت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ علامہ صاحب کی طبیعت خاندانی روایات کے عین مطابق بادی تھی' جو کہ کشمیریوں میں عام ہے' مگر چٹ پٹے کھانوں اور گوشت سے

اجتناب کسی طور ممکن نہیں رہتا تھا جس کی وجہ سے اکثر درد گردہ کی شکایت ہو جاتی تھی۔ ویسے درد گردہ کا عارضہ شاید خاندان میں موروثی حیثیت کا حامل رہا کیونکہ کئی ایک دوسرے افراد بھی اس کا شکار ہوتے رہے۔ میری والدہ مرحومہ بھی اس میں کافی عرصہ مبتلا رہیں اور انہوں نے بڑی تکلیف اٹھائی۔

چنانچہ حسب معمول ایک موسم گرما میں علامہ صاحب ایک بار پھر اس موذی مرض کا شکار ہوئے۔ درد بے حد شدت اختیار کر گیا اور کوئی علاج کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ مولانا مہرؔ ایک روز مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے تو اس وقت ایک بڑا عجیب واقعہ پیش آ گیا جس کی تفصیلات وہ کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ گرمیوں میں وہ درد گردہ میں مبتلا ہو گئے۔ میں دو دو تین تین مرتبہ مزاج پرسی کے لیے جاتا۔ ایک روز دوپہر کو دفتر جانے لگا تو سوچا کہ حضرت کی کیفیت معلوم کرتا جاؤں۔ میں حاضر ہوا تو وہ اندر کے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ میں پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان کی بارگاہ میں بات چیت کی ہمت بھی بہت کم ہوتی تھی۔ البتہ وہ خود مختلف معاملات و امور پر انتہائی شفقت سے گفتگو شروع کر دیتے تھے۔ مجھے بیٹھے ہوئے دو تین ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک اور صاحب تشریف لے آئے جو غالباً کسی کالج کی سائنس لیبارٹری میں ملازم تھے۔ حضرت نے اچانک مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''مہرؔ صاحب! تکلیف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے یا انسان کے نفس کی طرف سے؟''

میں کیا جواب دیتا...... ایک حدیث پاک جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک اعرابی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے زانوئے مبارک سے زانو ملا کر بیٹھ گیا اور پوچھا ''اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ احسان کیا ہے؟'' حضور اکرم ﷺ نے ہر سوال کا جواب دیا...... آخر میں اس نے قیامت کے متعلق پوچھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'مسئول' سائل سے بہتر نہیں جانتا''۔ رسول اللہ ﷺ نے بعد ازاں صحابہ کرامؓ سے فرمایا ''یہ جبریل امینؑ تھے جو ہمیں اسلام سکھانے آئے تھے''۔

میں یہی کلمہ یعنی ''مسئول سائل سے بہتر نہیں جانتا'' دوہرا دینا چاہتا تھا کہ اسی وقت اس پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے سبقت فرمائی حالانکہ ان سے تو حضرت نے پوچھا نہیں تھا۔ مگر وہ صاحب پٹ سے بولے...... ''سچ پوچھیں تو ڈاکٹر صاحب سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے''۔

یہ سنتے ہی حضرت نے اس زور سے چیخ ماری کہ پورا مکان ہل گیا۔ میں کانپ اٹھا۔لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا...... اسے روکنے کی اب کیا صورت ہو سکتی تھی؟ دو تین منٹ کے بعد جوش میں کسی قدر تخفیف ہوئی تو بار بار ایک ہی بات فرماتے جاتے کہ:

''اگر سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے تو میں نے شکوہ کیوں کیا؟ مجھ سے بے تابی کیوں سرزد ہوئی؟ اللہ مجھے معاف کردے' اللہ مجھے معاف کردے۔''

خاصانِ خدا

مجھے پندرہ سولہ سال تک حضرت سے قریب رہنے کے باعث ایسے کئی تجربے ہوئے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور بے تاب ہو جاتے تھے۔ یہ خاصانِ خدا کے شیوے ہیں''۔

عشقِ رسولِ مقبول ﷺ

مولانا غلام رسول مہر رقمطراز ہوتے ہیں:

''اسی طرح رسول اکرم ﷺ کا اسم گرامی سنتے ہی ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور اکثر آنسو نکل آتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور چوہدری محمد حسین مرحوم رات کے وقت پاس بیٹھے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ حضرت پلنگ کے سرہانے کے ساتھ تکیہ لگا کر استراحت فرما رہے تھے۔ اس اثناء میں باتوں باتوں میں کچھ ذکر آیا تو اپنے اشعار کا رجسٹر سامنے رکھ کر شعر سنانے لگے۔ ویسے تو وہ کسی کو شعر سناتے نہیں تھے ...... سناتے سناتے دفعتاً بجلی کی روشنی بجھ گئی۔ ہم دونوں تو خاموش بیٹھے ہی تھے۔ حضرت بھی خاموش ہو گئے۔ دو چار منٹ کے بعد روشنی ہوئی تو دیکھا کہ حضرت کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ جو شعر سنا رہے تھے' ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے تھا''۔

مولانا مہر اپنے سفرِ مکہ کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''میں اکتوبر ۱۹۲۵ء میں حجاز گیا اور روانگی سے کچھ پہلے حضرت علامہ مرحوم سے رخصتی ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو

دیکھا کہ میرے حاضر ہوتے ہی ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ نہ میں کچھ عرض کر سکا اور نہ انہوں نے کچھ فرمایا..... چند لمحوں کی خاموشی، چہرے کے رنگ اور آنکھوں کی کیفیت نے دل پر وہ سب کچھ منکشف کر دیا جو حضرت کے قلبِ صافی میں موجزن تھا۔ بقول عرفیؔ:

نہ گفت و من بشنودم ہر آنچہ گفتن داشت
کہ در بیان نگہش کرد برزباں تقدیم

حضرت علامہؒ کے حبِ رسولؐ میں سرشار ہونے کے متعلق بہت لوگوں نے لکھا اور ہر کسی نے اپنے اپنے مشاہدات اور تجربات بیان کیے ہیں مگر مولانا غلام رسول مہرؔ نے ایک بالکل نیا انکشاف کیا ہے جو شاید اس سے پہلے کسی کے علم میں نہ ہو۔ یہ مولانا کا ذاتی مشاہدہ ہے اور حضرت علامہؒ کے عشقِ رسول ﷺ کو بالکل ایک نئے رنگ میں پیش کرتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''لیکن ایک عجیب بات بتاؤں، جو شاید اکثر اصحاب کے لیے باعث تعجب ہو۔ جب وہ اہلِ یورپ میں سے کسی سے باتیں کرتے اور اسلام موضوعِ گفتگو ہوتا تو بارہا حضور ﷺ کا ذکرِ مبارک آتا اور حضرت علامہ انگریزی میں پے در پے The Prophet کا لفظ بولتے، مگر کبھی ان پر کوئی خاص کیفیت طاری نہ ہوتی اور لوگ بھی گفتگو کے لیے آتے تو حضرت مرحوم بے تکلف گفتگو کرتے، مگر کبھی تاثر کی خاص حالت کے آثار نمایاں نہ ہوتے مگر جب ان کے خاص صحبت نشین موجود ہوتے تو رسول اللہ ﷺ کا محض نام مبارک لے دینا ان کے ضبط و صبر کے لیے ایک سخت امتحان بن جاتا''۔

مجالسِ خاص

مولانا غلام رسول مہرؔ ۱۹۲۲ء سے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی رحلت تک ان کے انتہائی قریب رہے لیکن کبھی بھی ان کی زبان سے کوئی غیر مناسب بات نہیں سنی۔ یہاں تک کہ اگر کبھی کسی کی حرکت پر بہت زیادہ غصہ آ جاتا تو صرف ''احمق آدمی'' کہہ کر اظہار کرتے یا پھر کبھی کبھی ''ڈیکا مرا وا!'' کہہ دیتے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ علامہ صاحب کا دبدبہ اس

قدر رہوتا تھا کہ ان کی محفل میں کبھی کسی کو کوئی خلاف تہذیب بات کہنے کی جرائت نہ ہوتی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ''عام مجالس کا کیا ذکر خصوصی مجالس میں بھی جب صرف میں اور چوہدری محمد حسین ہوتے کوئی ایسی بات نہ کہتے جو ان ایسی مکرم اور بلند پایہ ہستی کے عین شایان شان نہ ہوتی''۔

مولانا مہر ان مجالس خاص کا تفصیلی ذکر فرماتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں:

''میں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۲ء تک بیشتر وقت ان کی خدمت میں گزارا۔ ہر روز رات کو عموماً میں اور چوہدری محمد حسین مرحوم ہوتے اور کم وبیش گیارہ بجے تک ان کے پاس رہتے۔ میرا مکان بھی ان کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے بہت قریب تھا اور چوہدری محمد حسین مرحوم بھی بہت قریب رہتے تھے۔ اس لیے جب تک ان کی خواہش ہوتی ہم بخوشی ان کے پاس رہتے۔

تمیں دسمبر ۱۹۳۲ء میں مسلم ٹاؤن منتقل ہو گیا تو ہر وقت اور ہر روز کی نشستیں گھٹ گئیں تاہم میری حاضری میں کوئی فرق نہ آیا۔ روزانہ نہیں تو دوسرے دن ضرور وقت نکال کر خدمت میں پہنچ جاتا۔ ۱۹۳۵ء میں وہ اقبال روڈ (سابق میو روڈ) والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تو تیسرے چوتھے دن جانے کی فرصت ملتی۔ جب جاتا دو تین گھنٹے بیٹھا رہتا۔ اس زمانے میں ان کی بیماری خاصی بڑھ گئی تھی اور وہ زیادہ تر لیٹے رہتے تھے۔ جب طبیعت ذرا اچھی ہوتی تو بلا لیتے۔ ان کے پاس آموں کے تحفے جگہ جگہ سے آتے رہتے تھے۔ خود نوش نہ فرماتے (کیونکہ ان دنوں ڈاکٹروں نے سختی سے منع کر رکھا تھا ورنہ آم ان کی کمزوری ہوا کرتے تھے) اور صوفے پر تشریف فرما رہتے۔ میں اور سالک مرحوم ڈرائنگ روم کے فرش پر ان کے قدموں میں بیٹھ جاتے ...... وہ آم منگاتے اور ہم ان کے سامنے کھاتے ...... بہت خوش ہوتے اور پر لطف گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا''۔

مولانا مہر مزید فرماتے ہیں:

''غرض ۱۹۳۲ء سے ان کی وفات تک خدا نے مرحوم کی بابرکت صحبت سے استفادے کے بڑے مواقع عطا فرمائے۔ میں نے ان کی زبان مبارک سے کبھی کسی کے لیے کوئی غیر مناسب کلمہ یا لفظ نہ سنا۔ عام مجالس کا کیا ذکر مجلس خاص میں بھی جب صرف میں اور چوہدری محمد حسین ہوتے' کوئی ایسی بات نہ کہتے جو ان ایسی مکرم اور بلند پایہ ہستی کے عین شایان شان نہ ہوتی''۔

مطالعہ کا عجیب طریقہ

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ عالم بے بدل تھے اور دنیا کی متعدد زبانوں پر ان کا مکمل عبور تھا۔ جب کوئی نئی کتاب ان کے سامنے آتی تو شاید ہی کوئی ایسی ہوتی جسے اول سے آخر تک پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ اکثر اشاریہ پر نظر ڈالنے سے ہی نفس مضمون کو پا لیتے۔ ان کا مطالعہ یقیناً اتنا وسیع تھا کہ وہ دنیا کے تقریباً تمام علوم کا احاطہ کرتا تھا اور پھر یادداشت ایسی کہ جو چیز ایک دفعہ دیکھ لی ازبر ہوگئی۔

مولانا غلام رسول مہر ان کے مطالعہ کے سلسلے میں اپنا مشاہدہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''ان کا طریقِ مطالعہ بھی عجیب دیکھا۔ ممکن ہے وہ بعض کتابوں کا مطالعہ تنہائی میں خاص توجہ سے فرماتے ہوں۔ ان کے پاس ڈاک سے بھی بڑے بڑے مصنفین اپنی تصانیف بھیجتے رہتے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا کوئی کتاب آئی...... کھولی...... پہلے اس کی فہرست مضامین دیکھی۔ پھر اشاریہ پر ایک نظر ڈالی۔ کچھ دیر کے لیے جگہ جگہ سے دو دو چار چار فقرے پڑھے اور کتاب ایک طرف ڈال دی۔

چونکہ کتاب کے موضوع خاص کے متعلق پوری معلومات پیش نظر تھیں' اس لیے صرف وہی حصے بطور خاص دیکھتے جس میں موضوع کی بعض شاخوں پر گفتگو ہوتی۔ چند فقرے پڑھ کر اندازہ فرما لیتے کہ مصنف کا طریق استدلال کیا ہے۔

ان کے پاس ''بہار عجم'' برابر پڑی رہتی تھی۔ جو فارسی محاوروں کی مشہور لغت ہے۔ جب ضرورت پڑتی' اسے کھول کر دیکھ لیتے۔ یقیناً اس لیے نہیں کہ خود مصنف 'بہار عجم' کے نزدیک محاورے کا مطلب کیا ہے بلکہ اس نے بیان کردہ معانی کی سند میں فارسی شعراء کے جو اشعار دیئے ہیں' ان سے بتائے ہوئے معنی کی تصدیق ہوتی ہے یا نہیں؟''

متمسّک بالدّین

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد واپسی میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے چند دوسرے ممالک کا بھی دورہ کیا۔ اس سفر میں مولانا مہر ان کے ہمراہ تھے۔ اس دورہ کی تفصیلات کئی ایک جگہوں پر بیان ہوئی ہیں اور مولانا مہر کی زبانی بھی متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔ مگر ایک خصوصی ملاقات کے متعلق ایک بار پھر مولانا مہر کچھ کہنا چاہ رہے ہیں جو مصر کے شہر قاہرہ میں وہاں کے ممتاز صاحب طریقت بزرگ کے ساتھ ہوئی۔ اس ملاقات میں حضرت

علامہؒ کے مقام کا ہلکا سا پرتو نظر آتا ہے۔ مولانا بیان فرماتے ہیں:

"میں ۱۹۳۱ء میں یورپ کے سفر میں ان کے ہمراہ تھا۔ دوسری گول میز کانفرنس سے آپ بہت بددل واپس لوٹے تھے کیونکہ دوسرے لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا تھا اور وہ اس صورت حال سے بہت مایوس تھے۔ لندن سے ہم عازمِ اٹلی ہوئے اور نومبر کے اواخر میں واردِ روم ہوئے۔ یہاں ہفتہ بھر بڑا مصروف گزرا۔ بے شمار لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں مگر خاص ملاقات جسے علامہ صاحب نے بڑی اہمیت دی' وہ اٹلی کے آمرِ مطلق مسولینی سے تھی۔ یہاں سے مصر کے لیے روانگی ہوئی اور اوائل دسمبر میں براستہ سکندریہ' قاہرہ پہنچے۔ ایک ہفتہ کے قریب یہاں بھی قیام رہا اور دن رات دعوتوں کا تانتا بندھا رہا۔ مصر کے بڑے بڑے علماء اور فضلاء سے ملاقاتیں ہوئیں جن کا تفصیلی ذکر پہلے بھی بہت ہو چکا مگر ایک خاص ملاقات جو مجھے آج بھی پوری تفصیلات کے ساتھ یاد ہے' کا ذکر میں ایک دفعہ پھر کرنا چاہوں گا۔

ایک روز مصر کے ممتاز صاحبِ طریقت بزرگ حضرت ابوالعزائم؎۱ علامہ مرحوم سے ملنے خود ان کے ہوٹل میں تشریف لائے۔ علامہ بہت حیران ہوئے اور ان سے کہا "آپ نے کیوں زحمت کی۔ مجھے حکم دیتے تو میں حاضرِ خدمت ہو جاتا"۔ حضرت ابوالعزائم نے جواب میں فرمایا:

"سرورِ دو عالمؐ کی حدیثِ پاک ہے کہ دین سے تمسک کرنے والے کی زیارت کے لیے جانا میری خوشنودی کا باعث ہے"۔

حدیث بیان کرنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ...... "میں جو بادشاہوں سے ملنے کے لیے بھی کبھی گھر سے نہیں نکلا' حضورِ انور ﷺ کے اس ارشادِ مبارک کی تعمیل میں آپ کی ملاقات کے لیے بنفسِ نفیس آیا ہوں"۔

ان کا یہ فرمانا علامہ صاحب کے لیے غضب ہو گیا۔ جتنا وقت حضرت ابوالعزائم بیٹھے' ضبطِ گریہ سے ان کا چہرہ متغیر نظر آتا تھا۔ آنکھیں تمام وقت ڈبڈبائی رہیں۔ جیسے ہی حضرت ابوالعزائم واپس روانہ ہوئے' حضرت علامہ بے تحاشا رونے لگے اور کافی دیر یہی کیفیت رہی...... جب ذرا طبیعت بحال ہوئی تو مجھ سے فرمایا:

"مہر صاحب! یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ سرورِ دو جہان ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھ گنہگار کو متمسک بالدّین سمجھ کر ملنے کے لیے آ رہے ہیں"۔

ایک نہایت مخلص، سادہ اور شریف سیاستدان

حضرت علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نہایت ایماندار اور شریف الطبع انسان تھے کیونکہ بچپن سے ہی ان کی پرورش ایسے پاکیزہ اور سادہ ماحول میں ہوئی جس میں نیکی اور پارسائی کی بلند قدریں تھیں۔ گھر کا ماحول باشرع اور انتہائی دیندار تھا۔ والدین نے سب سے پہلے اسلام کے زریں اصولوں سے روشناس کرایا اور آپ نے اپنی پوری زندگی انہی زریں اصولوں کے زیرِ اثر بسر کی۔ انہی اعلیٰ اقدار کی بنا پر کبھی قناعت اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ سارے جہان کا علم حاصل ہونے کے باوجود کبھی بھی اسے جلبِ منفعت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اگر چاہتے تو کہاں سے کہاں پہنچ سکتے تھے مگر کبھی بھی ذاتی منفعت کو قومی اور ملی فائدے پر فوقیت کا سوچا تک نہیں۔ اخلاص کا یہ حال تھا کہ جہاں بھی کسی کا فائدہ دیکھا، ذاتی نقصان کی پرواہ نہ کی۔ سیاست میں آنے سے پہلے اور بعد میں کبھی کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی ...... بلکہ یہاں تک کہ ہمیشہ اپنے جائز حقوق سے بھی دستبردار ہو جانے میں کبھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مولانا مہرؔ بتاتے ہیں کہ ...... ''حضرت علامہؒ انتہائی سادہ طبیعت کے مالک تھے اور پیشہ ورانہ قسم کے سیاستدانوں کی طرح سیاسی جوڑتوڑ ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ چنانچہ جب احباب کے بے حد اصرار پر آپ نے لجسلیٹو کونسل کے الیکشن میں حصہ لینے پر آمادگی ظاہر فرما دی تو ہم سب کے مدِنظر صرف یہ تھا کہ علامہ صاحب خود تو کبھی کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہوں گے نہیں، اب اگر وہ ممبر منتخب ہو جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی اعلیٰ عہدہ ضرور ان کو حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ جب ۱۹۲۶ء میں آپ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے تو عام خیال یہی تھا کہ انہیں وزارت میں ضرور لے لیا جائے گا۔ ان دنوں یہ افواہ عام تھی کہ گورنر پنجاب انہیں وزارتِ تعلیم یا قانون کا قلمدان دینا چاہ رہے ہیں۔ لیکن جب یہ اڑتی ہوئی خبر مخالف گروپ تک پہنچی تو ان لوگوں کو فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے حسب معمول ایک چال چلی اور میاں سر فضل حسین نے علامہ صاحب کو ایک خط لکھا جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ ...... ''اگر آپ (علامہ صاحب) قوم کی خدمت کے لیے سیاست میں آئے ہیں تو یہ بڑی خوش آئند بات ہے اور اس کے لیے میں (سر فضل حسین) آپ کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کا منتہائے نظر کوئی عہدہ جلیلہ ہے تو میرے خیال میں یہ کوئی مستحسن فعل نہیں ہوگا''۔ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ جو ایک عظیم اور سچے انسان تھے، کو جیسے ہی

متذکرہ بالا خط موصول ہوا انہوں نے حسب عادت فوراً انتہائی سادگی اور خلوص کے ساتھ اس کا یہ جواب سر فضل حسین کو بھجوا دیا کہ...... ''میں سیاست میں صرف اور صرف قوم کی خدمت کے جذبے کے ساتھ آیا ہوں اور میرے پیش نظر کبھی بھی کوئی عہدہ یا ذاتی فائدہ نہیں رہا اور اگر اس قسم کی کوئی تحریک کبھی ہوئی تو میں یقیناً اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دوں گا''۔ چنانچہ مخالفین نے آپ کی یہ تحریر بوقتِ ضرورت گورنر پنجاب کو دکھا دی اور اسے باور کرا دیا کہ علامہ صاحب کبھی بھی کوئی وزارت قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ گورنر نے بھی ان کی عدم دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ خیال چھوڑ دیا''۔

مولانا غلام رسول مہرؔ اس سلسلے میں مزید بتاتے ہیں کہ...... ''اب حضرت علامہ کے احباب نے سوچا کہ چلیں وزارت نہ سہی سپیکر شپ کے لیے کوشش کر دیکھتے ہیں چنانچہ اس کے لیے تگ و دو کا آغاز کر دیا گیا۔ حضرت علامہؒ اسمبلی کے سپیکر کے عہدہ کے لیے بلا شک وشبہ موزوں ترین شخصیت تھے اور ممبران کی بھاری اکثریت ان کی حمایت میں تھی۔ سب کو پورا یقین تھا کہ وہ اس کے لیے بہ آسانی منتخب ہو جائیں گے۔ لیکن مخالف گروپ کو کسی طور یہ منظور نہیں تھا چنانچہ انہوں نے عین اس لمحے جب کہ کونسل کے اجلاس میں سپیکر کا انتخاب عمل میں آنے والا تھا اور حضرت علامہؒ کے حمایتی ان کا نام اس کے لیے پیش کرنے جا رہے تھے...... میاں احمد یار خان آف دولتانہ اپنی نشست سے اٹھ کر خاص طور پر علامہ صاحب کے پاس آئے اور ان کو بتایا کہ ہم سب چوہدری سر شہاب الدین کا نام سپیکر کے لیے پیش کرنا چاہ رہے ہیں مگر چوہدری صاحب اس پر بضد ہیں کہ وہ صرف اس صورت میں سپیکر کے انتخاب میں حصہ لیں گے جب آپ (علامہ اقبال) ایوان کے سامنے ان کا (چوہدری صاحب) کا نام تجویز کریں گے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ' جن کو کبھی بھی اپنے ذاتی فائدے کی پرواہ نہیں تھی' نے بغیر کسی تردد کے اسی وقت اٹھ کر چوہدری سر شہاب الدین کا نام ایوان کے سپیکر کے لیے تجویز کر دیا اور آپ کے دوست احباب ہاتھ ملتے رہ گئے۔ مگر اپنے اس عمل سے حضرت علامہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ کبھی بھی کسی عہدے کے بھوکے نہیں تھے اور قوم کے لیے ان کی خدمات صرف اور صرف اخلاص پر مبنی تھیں۔ قناعت اور بے نیازی کی ایسی مثالیں' خاص طور پر سیاست کے میدان میں' تو بہت ہی خال خال نظر آتی ہیں''۔

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی یہ سادگی اور دنیاوی جاہ وحشم سے بیزاری اور بے نیازی ہمیشہ قائم رہی اور انہوں نے کبھی

بھی خودداری اور قناعت کا دامن نہیں چھوڑا۔

''ذکر اقبال''

مولانا غلام رسول مہرؔ حقائق سے پردہ سرکاتے ہیں

۱۹۶۹ء کا ذکر ہے کہ ''اقبال درونِ خانہ'' کا پہلا حصہ بزم اقبال' مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر انتظام اشاعت کے مراحل طے کر رہا تھا..... پیش لفظ کے لیے مولانا مہرؔ سے رابطہ کیا گیا چنانچہ اس سلسلے میں متعدد بار ان سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی کیونکہ وہ چند ایک مندرجات کے متعلق تبادلہ خیال کرنا چاہ رہے تھے۔ ان ملاقاتوں میں دوسری باتوں کے علاوہ بزمِ اقبال' ہی کی جانب سے شائع شدہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی سوانح ''ذکرِ اقبال'' مرتبہ مولانا عبدالمجید سالکؔ کا ذکر بھی آیا۔ کیونکہ ''اقبال درونِ خانہ'' میں ''ذکرِ اقبال'' کے چند مندرجات کے متعلق حقائق پیش کیے گئے تھے۔ درحقیقت ''ذکرِ اقبال'' میں بہت سی من گھڑت اور بے بنیاد باتیں شامل ہیں۔ شاید مولانا سالکؔ نے پوری طرح تحقیق مناسب خیال نہ کی یا ان کے پاس وقت بہت مختصر تھا کہ وہ ہر طرح اور پوری ذمہ داری کے ساتھ تحقیق فرماتے اور ہر بات کو شاملِ کتاب کرنے سے پیشتر اس کی پوری طرح چھان پھٹک کر لیتے ..... جو ان کے دل میں آیا اور جیسے انہوں نے مناسب خیال فرمایا' شاملِ کتاب کر لیا اور یوں بہت سی مضحکہ خیز بوالعجبیاں اس میں در آئی ہیں' جن کی تردید بہت ضروری تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں مولانا مہرؔ سے بڑی تفصیلی گفتگو رہی جس کے دوران اصل حقائق کھل کر سامنے آ گئے کہ کس طرح مولانا سالکؔ نے مولانا مہرؔ کے حق پر ڈاکہ ڈالا اور کس طرح بزمِ اقبال کے اس وقت کے کارپردازان سے شاید ساز باز کر کے ''ذکرِ اقبال'' کا معاہدہ لے اڑے اور مولانا مہرؔ جو ایک عرصہ سے اس پر کام کر رہے تھے' منہ دیکھتے رہ گئے۔

درحقیقت پہلے ''ذکر اقبال'' مرتب کرنے کا فریضہ مولانا غلام رسول مہرؔ کو سونپا گیا تھا اور انہوں نے لاہور' سیالکوٹ اور گوجرانوالہ وغیرہ میں بے شمار احباب سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کر کے ان کو مختلف کاپیوں میں درج کیا تھا۔ ان کے مآخذ اور راوی صرف اور صرف مہرؔ صاحب کے علم میں تھے اور کتاب کو مرتب کرتے وقت انہوں نے کس طرح انہیں استعمال فرمانا تھا یہ انہیں ہی معلوم تھا۔ مگر بزمِ اقبال کے اصحابِ بست وکشاد سے معاوضے کے سلسلے میں

معمولی سا اختلاف ہو گیا اور بزم والوں نے بلا سوچے سمجھے یہ کام مولانا مہرؔ کی بجائے مولانا سالکؔ کے سپرد کر دیا کہ وہ شرائط پر پورے اترتے تھے۔ چنانچہ وہ کاپیاں جن میں بے ترتیب معلومات درج تھیں مولانا سالکؔ کے حوالے کر دی گئیں۔ ان کاپیوں میں جمع شدہ واقعات و مشاہدات کے سیاق و سباق سے مولانا سالکؔ بالکل لاعلم تھے اور نہ ہی انہوں نے مولانا مہرؔ سے اس بارے میں کوئی استفسار ہی کیا اور بلا تحقیق سب کچھ شامل کتاب کر دیا اور انتہائی سرعت کے ساتھ ''ذکرِ اقبال'' مرتب کر ڈالی کیونکہ شاید یہ بھی شرائط میں شامل تھا۔

مولانا غلام رسول مہرؔ مرحوم نے یہ تمام حقائق ! دستی لکھ کر میرے حوالے کیے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت سند کے طور پر استعمال ہو سکیں۔ اس وقت ان حقائق کو منظر عام پر لانے کا موقع نہ تھا کہ مولانا مرحوم اس پر راضی نہ تھے اور انہوں نے اس وقت مجھے پابند کر دیا تھا کہ ان کا یہ بیان ان کی وفات کے بعد شائع کیا جائے۔ میں چونکہ کاروبارِ زندگی میں گزشتہ تمام عرصہ بے حد مصروف رہا......۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۶ء تک تو ملک ہی سے باہر رہا......اس لیے ان کو منظر عام پر لانا بالکل ہی ممکن نہ ہو سکا۔ اب جیسے ہی قدرے فراغت نصیب ہوئی اور پرانے کاغذات کی گرد صاف کرنے کا موقع میسر آیا' اولیں فرصت میں زیرِ نظر کتاب میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں اور اس وعدہ سے سبکدوش ہو رہا ہوں جو مولانا مہرؔ سے ۱۹۶۹ء میں کیا تھا۔

امید ہے کہ ان حقائق کو دیکھ کر اہلِ علم ''ذکرِ اقبال'' کے متعلق جناب سالکؔ اور بزمِ اقبال کے اس وقت کے ارباب بست و کشاد کے بے رحمانہ اقدامات کی بالکل صحیح صورت ملاحظہ فرما سکیں گے۔

''ذکرِ اقبال'' مؤلفہ مولانا عبدالمجید سالکؔ کے متعلق مولانا غلام رسول مہرؔ کا وضاحتی بیان

''کتاب کے صفحہ ۱۱۱ پر ایک بیان ہے' جس کی بناء غلط فہمی اور غلط اطلاع پر ہے۔ صحیح واقعات یوں ہیں:

۱۔ سردار عبدالرب نشترؔ مرحوم نے حضرت علامہ مرحوم و مغفور کے سوانح حیات کی ترتیب کے لیے ''بزمِ اقبال'' میں ایک سب کمیٹی بنائی تھی جس میں مجھے بھی شریک کیا گیا۔ یہ ان کی گورنری کا دور تھا۔

۲۔ میں نے اس سب کمیٹی کے پہلے ہی اجلاس میں حضرت مرحوم کے احوال و سوانح کی فراہمی کے لیے چند تجویزیں پیش کی تھیں' جن میں سے ایک یہ تھی کہ حضرت سے ملنے والے جو لوگ ابھی تک زندہ ہیں' ان سے مل کر جتنی

معلومات حاصل ہوں وہ قلمبند کر لی جائیں۔

۳۔ تین چار آدمیوں کی ایک اور سب کمیٹی بنا دی گئی کہ یہ ایسے لوگوں سے مل کر حالات فراہم کرے۔ اس کی سربراہی میرے سپرد ہوئی۔

۴۔ فراہم شدہ معلومات قلمبند کرانا میرا فرض تھا۔ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اس کمیٹی کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

۵۔ میں نے پوچھا کہ آیا جو کچھ سنا جائے وہ مرتب صورت میں لکھا جائے یا روایات بہ الفاظِ راویان قلمبند کی جائیں۔ اگرچہ مختلف راویوں کے بیانات متضاد ہوں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ ہر روایت اصل الفاظ میں لکھی جائے۔

چنانچہ سب کمیٹی نے لاہور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ میں مختلف ذمہ دار احباب سے ملاقاتیں کیں۔ یہ تمام روایتیں راویوں کے الفاظ میں کاپیوں میں لکھ دی گئیں اور قریباً پانچ کاپیاں بڑی کمیٹی کے حوالے کر دی گئیں۔ اس کے بعد کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ترتیب سوانح شروع کر دی جائے اور تحریر کے لیے قرعہ فال میرے نام پڑا۔ میں نے معذرت کی۔ اصرار پر میں نے چند تجویزیں پیش کیں:

۱۔ میں پوری کتاب کی ترتیب کے لیے بارہ ہزار روپے لوں گا۔

۲۔ تین مہینے میں سوانح کا مرتب خاکہ پیش کر دوں گا جس پر مجھے نصف رقم مل جانی چاہیے۔

۳۔ اس کے بعد کتاب شروع کر دوں گا اور کتاب کی تکمیل پر باقی رقم دے دی جائے۔

۴۔ ایک محرر اور ایک سیکرٹری چھ چھ مہینے کے لیے مجھے دیئے جائیں۔ ابتدائی چھ مہینے سیکرٹری درکار ہوگا اور آخری چھ مہینے کے لیے محرر۔

۵۔ میں ہر سوانحی معاملے میں کمیٹی کی رائے قبول کر لوں گا لیکن یہ قبول نہ کروں گا کہ مختلف ارکان اپنے اپنے صوابدید پر مجھے مجبور کریں کیونکہ میں کمیٹی یا بورڈ یا پاکستان کے بڑے بڑے داعیانِ حبِ اقبال میں سے کسی کو بھی اپنے سے زیادہ مخلص اور محبِ (اقبال) نہیں مانتا۔

اس پر بحث شروع ہوگئی اور میں نے معذرت کر دی کہ میں یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ تیز وہ فرماتے تھے کہ ایک ایک باب لکھ کر ان کی رقم بہ حساب بارہ ہزار وصول کرتے جاؤ۔

عین اس موقع پر مرحوم سالک صاحب کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کام

انہیں سونپ دیا گیا ہے لیکن میرا منصب یہ نہ تھا کہ ان سے بات کروں۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر وہ کاپیاں تھیں جن میں روایات درج تھیں اور وہ متضاد و غیر مرتب تھیں۔ انہی کاپیوں کی بنا پر مرحوم نے کتاب مرتب کر دی۔ غالباً انہیں روایات کے تضاد یا کسی روایت کے مستند یا غیر مستند ہونے کا بھی صحیح اندازہ نہ تھا۔ جن لوگوں نے انہیں یہ کام سونپا' انہوں نے غالباً کاپیوں کے مندرجات کی حقیقی حیثیت ان پر واضح نہ کی اور انہیں خود کسی وجہ سے میرے ساتھ بات کرنے میں حجاب ہوا۔ حالانکہ ہر معاملے کے متعلق مشورہ کر لیتے تھے۔ میں اس وجہ سے متامل رہا کہ اگر بات کروں تو شاید وہ میرے نقطۂ نگاہ سے خلافِ مصلحت ہو۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ مرحوم سالکؔ صاحب حضرت علامہ اقبالؒ کے ساتھ عقیدت و نیاز میں کسی سے کم نہ تھے۔ لیکن مختلف روایات کی حقیقی حیثیت سمجھنے میں ان سے فروگزاشتیں ہوئیں۔ یہ ارادی غلطی نہیں تھی صرف اتفاقی فروگزاشت تھی۔ سالکؔ مرحوم اس سے بہت بالا تھے کہ دانستہ یا ارادۃً کوئی ایسی بات لکھتے جو حقائق یا حضرت علامہؒ کے وقار و عظمت کے خلاف ہوتی۔

۶۔۱۲۔۶۹ والسلام

نیاز مند

مہرؔ

مولانا غلام رسول مہرؔ مرحوم و مغفور کے مندرجہ بالا وضاحتی بیان کے بعد کسی مزید تبصرے کی ضرورت تو شاید باقی نہیں رہتی مگر اتمامِ حجت کے طور پر میں یہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اول تو مولانا سالکؔ نے دوست کشی کا ارتکاب کیا اور مولانا مہرؔ سے بالا بالا ہی وہ کام حاصل کر لیا جس میں مہرؔ صاحب کی شبانہ روز کی محنت شامل تھی اور بڑی چابکدستی سے ان کی تمام تر مخلصانہ کوششوں پر بڑی صفائی سے پانی پھیر دیا اور دوسرے وہ محسن کشی کے مرتکب بھی ہوئے اور معمولی سے دنیوی فائدے کے عوض اپنے محسنِ اعظم یعنی حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق بے بنیاد واقعات کو پورے اہتمام کے ساتھ ''ذکرِ اقبال'' میں شامل کیا اور اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جو بزمِ اقبال کے اربابِ بست و کشاد کی شاید لاعلمی کی وجہ سے ان کو میسر آ گیا۔ اگر اس طرح جلد بازی سے یہ کام سالکؔ صاحب کے حوالے نہ کیا جاتا اور مولانا مہرؔ ہی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے تو یقیناً کہیں بہتر اور مستند سوانحِ اقبال معرضِ وجود میں

آئی ہوتی۔ لیکن مولانا مہرؔ مرحوم کو اس کی داد دی جانی چاہئے کہ سب کچھ صاف صاف بیان فرما دینے کے بعد بھی سالکؔ صاحب کی تمام تر زیادتیوں کو نظر انداز فرما دیا اور آخر میں دوستی کی لاج رکھتے ہوئے سالکؔ صاحب کو تمام ثابت شدہ الزامات سے بری الذمہ قرار دینے کی بھرپور کوشش فرمائی۔

ضمیمہ ''ذکرِ اقبال''؟

نومبر ۱۹۷۷ء میں مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے ایک کتاب ''روایات اقبال'' کے نام سے شائع ہوئی جسے ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے ترتیب دیا ہے۔ کتاب مذکورہ کے صفحہ اول پر ایک وضاحتی نوٹ کچھ اس طرح دیا گیا ہے:

''واضح رہے کہ مولانا عبدالمجید سالکؔ مرحوم نے اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' میں ان روایات کا کچھ حصہ اقتباسات کی شکل میں شائع کر دیا ہے' تاہم ایک مستقل تصنیف کے طور پر انہیں ابھی تک شائع نہیں کیا گیا۔ چونکہ ان روایات اور بیانات کی تاریخی اہمیت مسلم ہے اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ انہیں ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ اقبالیات کے طلبہ اور محققین اسے کتاب حوالہ کے طور پر استعمال کر سکیں''۔[1]

مندرجہ بالا وضاحت کے بعد یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا غلام رسول مہرؔ مرحوم نے گزشتہ صفحات میں ''ذکرِ اقبال[2] '' کے سلسلے میں اپنے ''وضاحتی بیان[3] '' میں جن پانچ کاپیوں کا ذکر کیا ہے جن میں مولانا مہرؔ نے متضاد اور غیر مرتب روایات درج فرمائی تھیں۔ مہرؔ صاحب نے ان کاپیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

''میرا اندازہ یہ ہے کہ ان (مولانا سالکؔ) کے پیش نظر وہ کاپیاں تھیں جن میں روایات درج تھیں اور وہ متضاد و غیر مرتب تھیں''......الخ۔[1]

چنانچہ مولانا سالکؔ نے ''ذکرِ اقبال'' ترتیب دیتے ہوئے متذکرہ کاپیوں[2] میں جو روایات باقی چھوڑ دی تھیں اور بوجوہ کتاب میں شامل نہیں کی تھیں' اب وہی کاپیاں کسی طرح ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کے ہاتھ لگ گئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی وہی غلطی دہرائی ہے جو مولانا سالک سے سرزد ہوئی تھی۔ اس لیے ''روایاتِ اقبال'' میں بے تکے اور متضاد واقعات اور بیانات کی بھرمار ہے۔ کئی ایک افرادِ خاندان کے نام تک غلط دیئے گئے ہیں۔ جو کسی نے غلط سلط بتایا تھا بغیر کسی تحقیق کے شاملِ کتاب کر دیا گیا ہے۔ اگر ان تمام اغلاط کی نشاندہی کی جائے تو خاصی طویل

فہرست مرتب ہوسکتی ہے۔ بعض مقامات پر تو بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے کہ انہوں نے کسی دوسرے کی روایات کو کسی دوسرے کے نام کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ اور اس طرح وقت کا حساب بھی بالکل نہیں رکھا۔ جس کی سب سے بڑی مثال کتاب کے صفحہ ۱۸۵ پر ملتی ہے۔ ''خالد نظیر صوفی'' کے عنوان کے تحت تعارف کرواتے وقت انہوں نے میرا اور میری کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے مگر جو واقعات اور روایات مجھ سے منسوب فرمائی ہیں وہ درحقیقت میرے والدِ مرحوم جناب ڈاکٹر نظیر احمد صوفی صاحب سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چند ایک واقعات تو ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں بھی والدِ گرامی کے حوالے سے شائع ہو چکے ہیں۔ درحقیقت مولانا مہر یا مولانا سالک یا ڈاکٹر عبداللہ چغتائی والدِ گرامی سے ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء میں ملے ہوں گے۔

۱۹۵۲-۵۳ء میں راقم الحروف زیادہ سے زیادہ بارہ تیرہ برس کا رہا ہوگا اور مڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ مجھے متذکرہ بالا اصحاب کی اقبال منزل میں آمد یا والدِ گرامی سے ملاقات کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی اس وقت والد صاحب نے اس کے متعلق کبھی ذکر فرمایا۔ ہاں پرانے کاغذات میں البتہ ایک پوسٹ کارڈ ضرور دستیاب ہوا ہے جو نومبر ۱۹۴۳ء میں مولانا سالک نے لاہور سے میرے والدِ گرامی کو تحریر کیا جس میں ۲۸ نومبر ۱۹۴۳ء کو اپنی صاحبزادی کی شادی میں مدعو کیا ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر دونوں میں راہ و رسم تھی۔ ''ذکرِ اقبال'' میں جناب نظیر احمد صوفی صاحب کے حوالے سے جو واقعات اور روایات شامل ہیں' ان کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ صوفی صاحب سے یہ معلومات مولانا مہر یا مولانا سالک یا ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے کب اور کیسے حاصل کیں۔

یہ صرف ایک مثال ہے جس میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب نے اپنی مرضی سے نہ صرف واقعات کو گڈمڈ کیا ہے بلکہ راوی کا نام بھی تبدیل فرما دیا ہے' تو اور کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ اگر مہلت ملی تو انشاءاللہ پھر کبھی ''روایاتِ اقبال'' میں شامل دوسری روایات کے متعلق تفصیلاً ذکر ہوگا۔

محترم سیّد امتیاز علی تاج

چند بھولی بسری یادیں

جن دنوں ''اقبال درونِ خانہ'' کا حصہ اول بزمِ اقبال لاہور میں اشاعت کے مراحل طے کر رہا تھا' سید امتیاز علی تاج وہاں معتمد اعزازی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ ان سے کئی ایک طویل ملاقاتیں رہیں۔ وہ بڑے مرنجان مرنج قسم کی شخصیت تھے۔ شاعرِ مشرق حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی اور وہ ان کا ذکر کرتے کبھی نہ تھکتے تھے۔ گو انہیں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے فیض یاب ہونے کے بہت کم مواقع میسر آئے مگر ایک خصوصی واقعہ کا ذکر انہوں نے تقریباً ہر نشست میں کیا کیونکہ ان کے خیال میں اس سے تفصیلی ملاقات حضرت علامہؒ کے ساتھ شاید ان کی کبھی نہ ہوئی۔

فرہنگِ آصفیہ

وہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے کہ..... ''ایک دفعہ کچھ نصابی کتابیں حکومت کی طرف سے شائع ہونی تھیں۔ میری خوش قسمتی کہ میں بھی حضرت علامہؒ کے ساتھ اس بورڈ کا ممبر تھا جو ان کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں تشکیل دیا گیا تھا۔ متذکرہ بورڈ کے ایک اجلاس جس میں کتابوں کے مندرجات پر بحث ہوئی تھی میں' اسے اتفاق ہی کہیے کہ حضرت علامہ کسی مصروفیت کی بنا پر شامل نہ ہو سکے۔ چنانچہ ہمارے مخالفین نے یہ موقع غنیمت جانا اور ہمیں خوب خوب رگیدا اور بے شمار اغلاط کی نشان دہی کر دی۔ سب بے حد پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ حضرت علامہؒ وہاں موجود تھے نہیں اس لیے کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ واپس آ کر میں نے فوراً ''فرہنگ آصفیہ'' نکالی اور جن جن الفاظ پر اعتراض ہوا تھا ان کے لیے اسناد تلاش کرنے لگا۔ پوری رات ورق گردانی کے بعد آخر تمام اعتراضات کے لیے اسناد حاصل کر لیں۔ ''فرہنگِ آصفیہ'' میں مطلوبہ مقامات پر میں نے پنوں کے ساتھ چٹیں لگا لیں تا کہ ڈھونڈنے میں وقت نہ ہو۔ اس سے فارغ ہو کر صبح سویرے میں سیدھا حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ خوش قسمتی سمجھئے کہ وہ تنہا بیٹھے تھے۔ چنانچہ میں نے جاتے ہی عرض کیا کہ..... ''کل کے اجلاس سے

آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے ساری محنت اکارت گئی اور یار لوگوں نے خواہ مخواہ کے اعتراضات کی بھرمار کر دی۔ ساری رات ''فرہنگِ آصفیہ'' میں اسناد تلاش کرتا رہا ہوں۔ اب آپ بھی ملاحظہ فرما لیں''۔

''مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے اس طرح پریشان ہونے سے علامہ صاحب بڑے محظوظ ہو رہے ہیں اور میرے تفصیلات بتانے کے دوران ہلکا ہلکا مسکرا رہے ہیں۔ ان کے اس رویے نے مجھے اور پریشان کر دیا کہ وہ تو کوئی خاص اثر لے نہیں رہے اور میں ادھر ہلکان ہوا جا رہا ہوں۔ میری گھبراہٹ کو انہوں نے شاید محسوس کر لیا چنانچہ حقہ کا کش لیتے ہوئے فرمایا:

''اچھا ایک ایک کر کے بتایئے''۔ میں نے ایک لفظ انہیں بتایا اور ''فرہنگِ آصفیہ'' سے اس کی سند مطلوبہ جگہ پر پن کی ہوئی چٹ کی مدد سے نکال کر دکھانا چاہ ہی رہا تھا کہ انہوں نے فوراً سب کچھ زبانی بتا دیا۔ اور حیران کن طور پر تمام کی تمام اسناد اسی طرح زبانی بتاتے چلے گئے۔ میں جو اتنی محنت کے بعد نشان لگا کر ''فرہنگِ آصفیہ'' کے ساتھ حاضر ہوا تھا ایک بھی مطلوبہ سند دکھانے میں کامیاب نہ ہو سکا''۔

پوری تفصیلات کے ساتھ واقعہ سننے کے بعد تاج صاحب آخر میں یہ ضرور اضافہ فرماتے کہ: ''میں آج تک حیران ہوں کہ اس شخص کے حافظے کی داد کس طرح دی جائے جسے ''فرہنگِ آصفیہ'' پوری کی پوری ازبر تھی۔ یقین کیجئے میں اس وقت بھی ششدر رہ گیا تھا اور آج تک ہوں''۔

مندرجہ بالا واقعہ سنانے کے بعد ایک بار میں نے تاج صاحب سے دریافت کیا کہ کیا وہ ''فرہنگِ آصفیہ'' آج بھی آپ کے پاس موجود ہے؟ اور اگر ہے تو کیا اس میں ان مقامات پر چٹیں موجود ہیں؟ اور اگر ہیں تو ان کی تفصیل خاصی معلومات افزا اور دلچسپ رہے گی۔ تاج صاحب نے شاید اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا...... اس تجویز پر ایک دم چونکے اور بڑے جوش کے ساتھ کرسی میں سیدھے ہوتے ہوئے فرمایا...... ''چٹیں تو ممکن نہیں کیونکہ یقیناً نکال دی ہوں گی' ہاں البتہ ان صفحات پر پن کرنے کے نشانات یقیناً تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ انشاء اللہ کسی وقت ایک بار پھر تفصیلی ورق گردانی کروں گا۔ شاید کچھ بات بن جائے''۔

مگر افسوس انہیں اس کا موقع نہ مل سکا کہ انہی دنوں وہ راہی ملک عدم ہوئے!۔

ایس تھیں

اسی طرح ''اقبال درونِ خانہ'' حصہ اول میں یہ ذکر دیکھ کر کہ حضرت علامہؒ پنجابی سیالکوٹ کے مخصوص محاورے اور تلفظ کے ساتھ بولتے تھے۔

تاج صاحب نے بتایا کہ ایک پنجابی محاورہ انہوں نے بھی علامہ مرحوم کی زبانی سن رکھا ہے جو شاید سیالکوٹ میں ہی استعمال ہوتا ہوگا کیونکہ یہاں لاہور میں کبھی اس کو کسی دوسرے کی زبان سے نہیں سنا۔

میرے استفسار پر انہوں نے تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا کہ...... ''پنجابی میں گفتگو کرتے ہوئے حضرت علامہؒ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے ''ایس تھیں اے ثابت ہویا''۔(اس سے یہ ثابت ہوا) تاج صاحب کا خیال تھا کہ ''ایس تھیں'' انہوں نے لاہور میں کسی دوسرے کی زبانی کبھی نہیں سنا۔

کچھ عرصہ قبل تک یہ سیالکوٹ میں واقعتاً مستعمل تھا مگر اب مرورِ زمانہ کے ساتھ تقریباً متروک ہو چکا ہے اور یہاں بھی شاید ہی کوئی اب اس کو استعمال کرتا ہو۔

باب دوم

حقائق وبراہین

۱۔ خاندانِ اقبال میں قادیانیوں کی واحد نقب

۲۔ اعلانِ ارتداد پر خاندان کے بزرگوں کا ردِ عمل

۳۔ آخری حسرت

۴۔ والدۂ محترمہ اقبال کا وقتِ آخر

چند چونکا دینے والے حقائق

۵۔ غربت اور امارت

اصل حقیقت

۶۔ بیگمات کا انتقال

اصل تواریخ

۷۔ عروسِ خاندانِ اقبال

۸۔ خاندانِ اقبال کی سب سے یادگار تقریبِ سعید

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ اِلّا اللہ!

(ضربِ کلیم)

خاندانِ اقبال میں قادیانیوں کی واحد نقب

اور اس کا ردِ عمل

یہاں میرے پیشِ نظر یہ بحث بالکل نہیں کہ قادیانیت کن عوامل کے تحت معرضِ وجود میں آئی یا لائی گئی اور اس کا اصل منتہائے نظر کیا تھا...... یا اس کے پس منظر اور پیش منظر میں کون کون اپنے اپنے فوائد کے لیے مصروف عمل رہا...... اس پر اب تلک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور انشاءاللہ آئندہ بھی اسی شد ومد کے ساتھ لکھا جاتا رہے گا۔ مجھے تو یہاں صرف اور صرف اس سے سروکار ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کب "منکرِ ختمِ نبوت" ہونے کا اعلان کیا اور اپنے اس باطل دعویٰ نبوت سے قبل وہ کس حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے رہے۔

اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ مرزا قادیانی نے اپنے قیامِ سیالکوٹ میں' جو ان کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً سات برس اپر محیط رہا' مناظروں کا بازار خوب گرم رکھا۔ اہالیانِ سیالکوٹ کو جو ان دنوں آریہ سماج تحریکوں اور مسیحی پادریوں کی یلغار سے بے حد پریشان تھے اور کسی طور ان سے مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے' بے حد متاثر کر لیا اور ایک طرح سے اس وقت ایک دینی سکالر کی حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ اس دور کے ماحول کے مطابق سیالکوٹ اور خاص طور پر کشمیری محلّہ جس کے کوچہ حسام الدین میں مرزا صاحب کا قیام رہا' کا شاید ہی کوئی گھرانا ایسا بچا ہو جو مرزا قادیانی کی اسلام دوستی سے متاثر نہ ہوا۔ اس وقت تک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک پرہیز گار انسان کی حد تک مذہب میں دخیل تھے اور ممکن ہے کہ وہ ان موافق حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی قسم کے پیری مریدی کے عمل میں بھی ملوث رہے ہوں اور سادہ لوح مسلمانوں سے بیعت تک لیتے رہے ہوں۔ چنانچہ اس وقت کے آثار آج تک یہاں موجود ہیں اور بے شمار ناکردہ گناہ اس الزام سے خود کو بری الذمہ قرار نہیں دلوا سکے کہ وہ مرزا قادیانی کے پیروکار ہیں یا کبھی تھے۔

یہاں اصل حقیقت کو فراموش کر کے مرزا قادیانی کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو مرزائیت یا قادیانیت پر منتج کر دیا جاتا

ہے۔ حالانکہ جو افراد مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے قبل ان کے کسی طور دوست یا ساتھی رہے وہ کسی طرح بھی اس زمرے میں نہیں آتے کہ انہیں منکرین ختم نبوت کی صف میں شامل کیا جائے۔ ہاں جنہوں نے دعویٰ نبوت کے بعد بھی ان سے تعلقِ خاطر منقطع نہیں کیا یا جنہوں نے ان کے اس دعویٰ باطل کے بعد ان کی بیعت کی وہ یقیناً اس زمرے میں آئیں گے اور ان کو ہی ماضی قریب میں غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے اور وہ اب ایک علیحدہ اقلیت کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ''خاندانِ اقبال'' کے کن افراد نے مرزا قادیانی کے ساتھ ان کے دعویٰ نبوت کے بعد تعلق رکھا۔ مرزا صاحب کے ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک کے قیامِ سیالکوٹ[1] میں یقیناً ان کا تعلق خاندانِ اقبال کے ساتھ تھا کیونکہ ایک تو وہ اسی علاقے میں رہائش پذیر رہے دوسرے والدِ اقبال شیخ نور محمد صاحب چونکہ اہل تصوف میں ان دنوں ایک مقامِ خاص کے حامل تھے اور سلسلہ قادریہ میں سائیں عبداللہ قادریؒ سے بیعت[2] تھے' اس لیے ظاہر ہے کہ سیالکوٹ کے مذہبی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت تھے۔ جب مرزا غلام احمد نے اپنے قیامِ سیالکوٹ کے دوران دفاعِ اسلام کا کام شروع کیا اور مناظروں کا بازار خوب گرم کر دیا تو یہاں کے مذہبی حلقوں میں ان کا خوب چرچا ہوا اور وہ ہر مسلمان کی آنکھ کا تارا بنے۔ سیالکوٹ کے بیشتر گھرانے ان دنوں اس جہاد میں برابر کے شریک تھے اور ان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی کے تین ادوار نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ اول وہ امتِ مسلمہ کے ایک سرگرم مبلغ کی حیثیت میں اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ ان دنوں وہ زیادہ سے زیادہ کشف کا دعویٰ کرتے تھے۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے ''مسیح موعود'' ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر ۱۹۰۱ء میں وہ مستقل نبوت کا اعلان فرماتے ہیں جس پر وہ اپنی وفات یعنی ۱۹۰۸ء تک قائم رہے۔ اگر مرزا صاحب کے اس دور کے بیانات و ''الہامات'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے عقلی معیار پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ عجیب و غریب تضادات کا شکار رہے۔ کبھی وہ مشرق کی ہانکتے ہیں تو کبھی مغرب کی۔ ان کو شاید خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دراصل کیا کہنا یا کیا بننا چاہ رہے ہیں۔ یا پھر وہ بڑے چالاک واقع ہوئے تھے کہ لوگوں کو عجیب گومگو کا شکار رہنا کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے تھے اور اس میں شاید وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔

درحقیقت وہ ایک گم کردہ راہ مرید کے مترادف تھے جو تصوف کی بھول بھلیوں میں اس مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں اگر

صحیح رہنمائی میسر نہ آئے تو گمراہ ہو جانا لازم ٹھہرتا ہے...... یہ وہ مقام ہے جہاں ہر طالبِ راہِ سلوک اپنے آپ کو ہر چیز، ہر ہستی کا مثیل سمجھنے لگتا ہے اور ''انا الحق'' تک کا دعویٰ کر دیتا ہے...... جو اس مقام پر پھنس گیا' اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یقیناً مرزا قادیانی بھی اس مقام پر پھنس کر رہ گئے تھے کیونکہ وہ اپنی ولایت اور الہامات کا دعویٰ تو پہلے ہی فرما رہے تھے۔ اگر وہ اس مقام کو درست طریق سے عبور کر جاتے تو یقیناً ایک ولی کامل ہوتے مگر جب وہ اس پر ہی پھنس گئے تو پھر وہ ''سب کچھ'' تھے۔ اسی لیے کبھی وہ دعویٰ نبوت کرتے ہیں اور کبھی رسالت' کبھی وہ ادھر بھاگتے ہیں اور کبھی ادھر۔ کیونکہ ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ آخر ہیں کیا؟ یہاں تک کہ وہ ہندوؤں کے اوتار کرشن اور حضرت عیسیٰ کی ماں مریم تک بننے کو تیار ہیں۔ ان کے اس مقامِ گمراہی سے سب سے زیادہ فائدہ ان کے خلیفہ اول حکیم نور الدین نے اٹھایا اور ان کو کبھی بھی اس گمراہی سے نکلنے کا موقع نہ دیا۔

آمدم برسرِ مطلب دیکھنا یہ ہے کہ مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت یعنی ۱۹۰۱ء کے بعد خاندانِ اقبال میں سے کون ان کے ساتھ منسلک رہا یا اس کے بعد ان پر ''اظہار ایمان'' کیا یا ''بیعت'' وغیرہ کا مرتکب ہوا۔ والدِ اقبال شیخ نور محمد مرحوم کے متعلق خود مرزا غلام احمد کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب ''سیرت المہدی جلد ۳'' کے صفحہ ۲۴۹ پر تحریر کیا ہے کہ انہوں نے ۱۸۹۳ء سے قبل ہی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی یعنی مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے وہ ان سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے جو تعلق بھی تھا' وہ صرف اور صرف تصوف کی وجہ سے تھا۔ یعنی مطلب صاف ہے کہ خاندانِ اقبال کے جن افراد نے مرزا صاحب کا شاید ایک مبلغ اسلام کی حیثیت میں ساتھ دیا' ان کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے ہی ان سے وہ تعلق بھی ختم کر چکے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی بہتان تراشی درست نہیں۔ چنانچہ خاندانِ اقبال کے تمام افراد اس سے بری الذمہ ثابت ہو جاتے ہیں کہ وہ کبھی بھی منکرین ختم نبوت کے گروہ میں شامل رہے۔ البتہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ خاندان کے صرف ایک فرد کو ۱۹۳۱ء! میں جماعت قادیانی کا ممبر بننے اور آخر دم تک اس سے منسلک رہنے اور غیر مسلم قرار دیے جانے کی ''سعادت'' نصیب ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خاندانِ اقبال میں جو واحد نقب قادیانیوں نے لگائی' وہ صرف شیخ اعجاز احمد صاحب کے ذریعے ممکن ہو سکی۔ افرادِ خاندان میں سے کسی نے نہ تو ان سے قبل اور نہ ہی ان کے بعد مرزا قادیانی کی نبوت کا ساتھ دیا اور نہ کبھی انشاء اللہ دیں گے۔ اسی پر بس نہیں کہ خاندان میں سے کوئی ان کا ساتھی نہیں بنا بلکہ ان کے اپنے اہل و عیال نے بھی

ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ممانی چاند مرحومہ (بیگم شیخ اعجاز احمد صاحب) تو قادیانی جماعت کے انتہائی درجہ کے مخالفین میں شامل تھیں اور کبھی کبھی غصے میں آ کر ان کے اندرونِ خانہ حالات و واقعات پر بڑی سیر حاصل روشنی ڈالا کرتی تھیں۔ انہیں بڑے عجیب و غریب حقائق کا علم تھا اور وہ اکثر اوقات بڑے ذومعنی انکشافات اس سلسلے میں فرمایا کرتی تھیں۔ شاید کچھ اور وجوہات بھی رہی ہوں مگر سب سے اہم وجہ بیگم اعجاز صاحب تھیں جو سدِّ راہ بنیں اور کسی بچے کو باپ کی پیروی نہیں کرنے دی۔ ان کا رویہ اس سلسلے میں اس قدر سخت اور واضح تھا کہ انہوں نے تمام بچوں کی شادیاں بھی غیر قادیانیوں میں ہی کروائیں۔

یہاں اس حقیقت سے شاید مفر نہیں کہ متذکرہ بالا نقب جو خاندانِ اقبال میں لگائی گئی غلبۂ مادیت کی بنا پر بصیرت سے محرومی اور خواہش منصب و جاہ کی وجہ سے ہوش و حواس سے تہی دستی کے بعد ہی ممکن ہوئی۔ ع

از چنیں مرداں چہ امید بہی؟

خاندان کے بزرگوں کا ردِ عمل

والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی مرحوم و مغفور اس کے راوی ہیں کہ میرے بڑے ماموں شیخ اعجاز احمد صاحب نے جب ۱۹۳۱ء میں جماعتِ قادیانی میں باضابطہ شمولیت اختیار کی تو ایک اخبار کے صفحہ اول پر بڑے نمایاں طور پر یہ خبر شائع کی گئی اور سب سے اوپر بڑے جلی حروف میں حکیم الامت شاعرِ مشرق کا نامِ نامی پورے القابات کے ساتھ لکھا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے ہی بیعت کر لی ہے مگر نیچے دوسری سطر میں بہت خفی قلم سے شیخ اعجاز احمد کے بیعت کرنے کی خبر تھی۔ اس کی وجہ سے کافی غلط فہمی پیدا ہوئی اور ہر طرف اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

والدِ مرحوم بیان کرتے ہیں کہ ..... "اس واقعہ کے چند روز بعد کی بات ہے' میں بھی اس وقت وہیں بازار میں موجود تھا۔ ابا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) اقبال منزل کے بازار کی جانب والی سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے' جب کسی نے ایک اخبار ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس اخبار میں ایک تو متذکرہ بالا خبر چھپی ہوئی تھی اور دوسرے مرزا بشیر الدین محمود کا ایک بیان تھا جس میں انہوں نے خاص طور پر علامہ صاحب کو مشورہ دیا ہوا تھا کہ انہیں اپنے قابل بھتیجے کی "پاکیزہ جوانی" سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ وغیرہ۔ اخبار شیخ صاحب کے ہاتھ میں دے کر وہ شخص خاص طور پر ان دونوں

خبروں کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنے کا خواہش مند ہوا۔ وہ یقیناً جماعت قادیانی کا فرستادہ تھا اور شیخ صاحب کو جان بوجھ کر زچ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا''۔ میرے والدِ گرامی بتاتے ہیں کہ...... ''بڑے شیخ صاحب اس پر بڑے سیخ پا ہوئے اور انہوں نے سب سے پہلے تو اس تماش بین کی خبر لی اور حسب عادت اس پر خوب برسے۔ پھر مرزا غلام احمد، مرزا بشیر الدین محمود، اپنے خلفِ اکبر اور جماعتِ قادیانی کی ''شان'' میں خوب خوب زہر افشانی فرمائی اور اپنے بڑے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد کو ''ناخلف'' تک کہہ ڈالا۔ اس وقت ان کا چہرہ شدتِ جذبات اور غم کے زیرِ اثر بالکل زرد پڑ گیا تھا اور وہ غصے میں بری طرح کانپ رہے تھے کہ تشویش پیدا ہوگئی کہ کہیں کوئی تکلیف لاحق نہ ہو جائے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں اقبال منزل میں اوپر لے جایا گیا مگر ان کا غصہ کسی طور فرو نہ ہو سکا''۔

اسی ضمن میں، میں اپنی والدہ محترمہ وسیمہ مبارک کے بیان کردہ چند واقعات بھی یہاں درج کرنا چاہوں گا۔ یہ تمام واقعات میرے علم میں بہت پہلے سے تھے مگر ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں اس لیے شامل نہ کیے گئے کہ ان کا ذکر خاندانِ اقبال کے لیے یقیناً کوئی ایسا باعث فخر نہیں تھا۔ شاید یہ تمام واقعات اور حقائق کبھی بھی منظر عام پر نہ لائے جاتے اگر شیخ اعجاز احمد صاحب اپنے بزرگوں کو خواہ مخواہ قادیانی ثابت کرنے پر مصر نہ ہوتے۔

میری والدہ بتاتی ہیں کہ...... ''جس روز اعجاز بھائی جان کی قادیانی بیعت کی خبر اخبار میں شائع ہوئی اور کسی نے شرارتاً ابا جان کو بازار میں وہ اخبار تھما کر طنز کیا تو یوں سمجھیے کہ اقبال منزل پر قیامت گزر گئی...... ابا جان کو جب بڑی مشکل سے بازار میں سے اوپر لایا گیا تو وہ سیدھے اندر زنان خانے میں تشریف لے آئے اور تختوں والی نشست گاہ میں آ کر اس قدر بلند آواز میں گرجے برسے کہ پوری اقبال منزل متزلزل ہو اٹھی۔ ہم سب تو اندر کمروں میں دبکے ہوئے رہے۔ ابا جی کے پاس ماموں غلام نبی صاحب اور پھوپھی کریم بی بی صاحبہ تھیں۔ ابا جی کا غصہ اس روز ساتویں آسمان کی خبر لا رہا تھا اور بار بار ان کا روئے سخن بیچاری بھابھی جی (والدہ صاحبہ) کی طرف ہو ہو جاتا تھا اور وہ بھائی جان اعجاز کا سارا غصہ ان پر ہی نکال دینا چاہتے تھے۔ ماموں غلام نبی صاحب اور پھوپھی کریم بی بی صاحبہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے مگر یہ کسی طور ممکن نہ ہو سکا...... جس بات کا انہیں سب سے زیادہ رنج تھا وہ مرزا بشیر الدین کا وہ بیان تھا جس میں چچا جان (علامہ صاحب) کو اپنے پاکباز بھتیجے سے سبق حاصل کرنے اور اس کی

پیروی میں اپنی عاقبت سنوارنے کا مشورہ دیا گیا تھا''۔

والدہ مزید بتاتی ہیں کہ..... ''میں نے ابا جان کا غصہ بہت دیکھا تھا مگر اس روز ان کی حالت بے حد عجیب ہو رہی تھی اور وہ کسی طرح سنبھل ہی نہیں رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ بھائی جان اعجاز کو اس کی سزا کس طرح دیں۔ اخبار کی وہ کاپی جس میں یہ خبر چھپی ہوئی تھی' ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے پٹخ پٹخ کر سارا غصہ اسی پر نکال رہے تھے اور بار بار اس میں چھپی ہوئی متذکرہ خبریں ماموں جان اور پھوپھی جان کو دکھاتے تھے اور پھر گرجنا اور برسنا شروع کر دیتے تھے۔ اس روز ان کا سارا غصہ اعجاز بھائی کے لیے تھا اور ساتھ میں مرزا غلام احمد' مرزا بشیر' ظفر اللہ خان' چوہدری بشیر' بٹ صاحب اور اعجاز بھائی کے کئی اور دوستوں کے نام لے لے کر انہیں کوستے تھے' جن کے متعلق انہیں پورا یقین تھا کہ اعجاز بھائی کو ورغلانے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ ساتھ ساتھ وہ چچا جان (علامہ صاحب) کا ذکر بھی بار بار کر رہے تھے کہ ''اعجاز ناہنجار کی اس حرکت سے اسے (علامہ صاحب) کس قدر تکلیف اور کوفت ہو گی۔ خدا خدا کر کے ابا جی کا غصہ قدرے کم ہوا تو وہ حسب عادت خط لکھنے بیٹھ گئے...... ان کی یہ عادت بہت پرانی تھی کہ کوئی معاملہ ہوتا فوراً خط لکھ کر سپرد ڈاک کر دیتے اور اپنے خیالات اور مشوروں کا اظہار پوری سچائی کے ساتھ اپنے خطوط میں کر دیا کرتے تھے' خواہ بعد میں اس کے لیے پریشان اور پشیمان ہی کیوں نہ ہونا پڑے' میں نے ابا جی کی یہ عادت کئی دفعہ دیکھی ہے کہ جس وقت غصے میں ہوتے تو ایک دم اپنا فیصلہ صادر کر دیتے اور خوب گرجتے برستے مگر بعد میں جب غلطی کا احساس ہوتا تو اپنے سے چھوٹوں سے بھی معافی مانگنے میں عار نہ سمجھتے' کئی دفعہ ان کی زندگی میں اور اب ان کی وفات کے بعد بھی ان کی اس قسم کی تحریریں جو خطوط کی شکل میں لوگوں کے پاس ہیں' ان کے خلاف استعمال ہوتی رہی ہیں بلکہ اب تک ہو رہی ہیں مگر وہ اپنی اس فطرتِ ثانیہ سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے...... چنانچہ اپنی اسی عادت کے زیرِ اثر انہوں نے اپنا غصہ اس روز بھی خطوط کے ذریعے نکالا اور اعجاز بھائی صاحب کے ساتھ ساتھ دس بارہ دوسرے افراد کو بھی کارڈ تحریر کر کے سپرد ڈاک کر دیئے۔ میرے خیال میں اعجاز بھائی کے ان دوستوں' جن کے متعلق انہیں یقین تھا کہ انہوں نے ہی بھائی صاحب کو گمراہ کیا ہے' کو انہوں نے ضرور خطوط روانہ کیے ہوں گے۔ جن میں خاص طور پر ظفر اللہ خان' ڈاکٹر بشیر احمد بٹ صاحب وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ مرزا بشیر الدین محمود کو بھی لازماً ایک خط گیا ہو گا۔ چچا جان (علامہ صاحب) کو تو وہ تقریباً ہر روز خط لکھتے تھے اس لیے اس واقعہ کی تفصیل بلاشبہ انہیں بھی روانہ کی ہو گی......

ان خطوط میں کیا کچھ لکھا گیا اس کی تفصیل سوائے ابا جی کے شاید ہی کوئی دوسرا جان سکا ہو کیونکہ کس کی اتنی جرائت تھی کہ ان سے اس سلسلے میں دریافت کر سکتا یا ان کے خطوط یا کسی دوسرے کاغذ کو ہاتھ بھی لگا سکتا۔ ہمیں تو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ ابا جی نے سب کو بڑے سخت خطوط لکھے ہیں اور اب باقی کارروائی جوابات آنے کے بعد ہوگی"۔

میری والدہ خلد آشیانی اپنی پھوپھی زینب بی بی صاحبہ کے حوالے سے بتایا کرتی تھیں کہ..... "اعجاز احمد کے قادیانی مذہب اختیار کر لینے سے دونوں بھائی صاحبان (شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال) کو ناقابل برداشت صدمہ ہوا تھا۔ خاص طور پر اقبال بھائی صاحب نے تو اس کو دل پر لگا لیا اور اکثر و بیشتر اس پر غم و غصے کا اظہار فرمایا کرتے۔ میرے خیال میں ان کی بیماری میں بھی اس کی وجہ سے خاصا اضافہ ہوا کیونکہ ان دنوں وہ پہلے ہی کافی علیل رہنے لگے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ سردار بھابھی کی وفات کے علاوہ اعجاز احمد کا یہ فعل ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف کا باعث بنا تھا۔ میرے سامنے انہوں نے کئی بار اس پر دکھ اور رنج کا اظہار کیا اور بڑے بھائی صاحب کو بھی اس سلسلے میں کئی ایک خطوط لکھے اور بالمشافہ بھی تبادلہ خیالات کرتے ہوئے دیکھا جس میں وہ بار بار نبی اکرم ﷺ اور خداوند تعالیٰ کے حضور اس سلسلے میں باز پرس کا ذکر کرتے رہے۔ انہوں نے بڑے بھائی صاحب سے یہاں تک کہا کہ..... "اس سلسلے میں ہم دونوں ہی جوابدہ ہوں گے کہ یقیناً ہم سے ہی اعجاز کی تربیت میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ ہم سب کے لیے روزِ حساب باعث ندامت ثابت ہوگا....."

والدہ محترمہ مزید بتاتی ہیں کہ..... "پھوپھی زینب اپنا ایک چشم دید واقعہ یوں بیان کرتی تھیں کہ..... "ایک روز میں نے دونوں بھائی صاحبان کو دیکھا کہ اقبال منزل میں بڑے بھائی صاحب کے کمرے میں بیٹھے زاروقطار روتے چلے جا رہے ہیں۔ میں سمجھی کہ شاید بے جی اور میاں جی کو یاد کر رہے ہیں مگر جب قریب جا کر بیٹھی تو پتہ چلا کہ اعجاز احمد کا قادیانی ہو جانا زیرِ بحث تھا۔ اقبال بھائی صاحب ہمیشہ کے بڑے رقیق القلب تھے اور آخری عمر میں تو اس میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر رسول مقبول ﷺ کا نام نامی ہی کسی کی زبان پر آ جاتا تو ان کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اعجاز کے مرتد ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

بڑے بھائی صاحب کو بھی اس روز میں نے اس سلسلے میں ان کے ساتھ مل کر زاروقطار روتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑے سخت مزاج تھے مگر بڑھاپے نے بالکل بے بس کر دیا تھا۔ اور وہ اعجاز احمد سے اس سلسلے میں باز پرس کرنے کی پوزیشن

میں نہیں تھے۔ میرا دل بھی اس صورتِ حال پر بھر آیا اور میں بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگی کہ اولاد انسان کو کس طرح بے بس کر دیتی ہے۔ میرے دونوں بھائی' جن میں سے ایک وہ (شیخ عطا محمد) جس کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ انسان تو انسان در و دیوار تک کانپتے تھے' کسی کی کیا مجال تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کا خیال بھی دل میں لا سکے اور دوسرے وہ (علامہ اقبال) جن کو سارا زمانہ پوجتا تھا اور جو عشقِ رسول ﷺ کی زندہ مثال تھے۔ دونوں کو اپنے ہی خون نے بے دست و پا کر دیا تھا اور ان کے پاس سوائے دل و جگر جلانے کے اور کچھ حل اس مسئلہ کا نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے دونوں بھائی اسی جانکاہ حادثہ کی نذر ہوئے اور بہت قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ درحقیقت بارگاہِ خداوندی اور حضور رسالت مآب ﷺ میں بازپرس کا خوف ہی ان دونوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اعجاز احمد نے دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے اپنے باپ اور چچا دونوں کو روزِ محشر بڑی مشکل اور پرازندامت صورتِ حال میں گرفتار کر دیا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ انسان اپنے بچوں کو کتنی محنت سے پالتا ہے پوستا ہے' پڑھاتا ہے لکھاتا ہے تاکہ اس کے بڑھاپے کا سہارا بنیں مگر ہم لوگوں کا سارا زور صرف اور صرف دنیا کے لیے ہی ہوتا ہے۔ بہت کم عاقبت کا خیال رکھتے ہیں اور ایسی اولاد کی تمنا کرتے ہیں جو روزِ محشر باعثِ ندامت ثابت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی پناہ میں رکھے''۔

علاوہ ازیں میرے والدِ گرامی کے بیان کے مطابق ...... ''جب ابا جان (شیخ عطا محمد) کا آخری وقت قریب تھا تو ان کے تینوں صاحبزادگان میں سے کوئی بھی سیالکوٹ میں موجود نہیں تھا چنانچہ مجھے اپنے خسرِ محترم کا مرض الموت میں ہر طرح خیال رکھنا پڑا اور ان کی تیمارداری کا شرف حاصل ہوا۔ ان دنوں میں کئی بار ابا جی (شیخ عطا محمد) نے مجھ سے یہ ذکر کیا کہ ان کا قادیانی جماعت سے بالکل کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان دنوں بھائی اعجاز صاحب کا جو بھی خط آتا تھا' اس میں وہ اپنے والد کو بیعتِ قادیان کی ترغیب دیتے تھے کہ آپ حضرت صاحب کو خط لکھ دیں۔ ہر خط پڑھ کر ابا جی غصے میں لال پیلے ہو جاتے تھے اور مرزا قادیانی' اس کے خلفاء اور ساتھ میں اعجاز صاحب کو بے نقط سناتے تھے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے''۔

والدِ گرامی مزید بتاتے ہیں کہ ''انہی دنوں جب اعجاز بھائی کا ایک خط آیا تو ...... ابا جی (شیخ عطا محمد مرحوم) نے بڑے دکھ کے ساتھ مجھے بتایا کہ ...... ''پہلے تو مجھے رغبت ہی دیا کرتا تھا مگر آج تو اس نا ہنجار نے انتہا ہی کر دی ہے اور لکھا ہے

کہ ''میں (اعجاز احمد) نے آپ کی جانب سے جماعت کو آگاہ کردیا ہے کہ آپ پوری طرح بیعت کے لیے آمادہ ہیں اور بہت جلد اس سلسلے میں خط روانہ کردیں گے''۔ اس روز ابا جی کی حالت دیدنی تھی۔ بیماری کی وجہ سے وہ پہلے ہی بڑے لاچار ہورہے تھے۔ اوپر سے یہ اندوہناک اطلاع...... مجھے یہ سب بتاتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ گھر کے تمام افراد ان کے گرد جمع ہوگئے۔ بھابھی جی (بیگم شیخ عطا محمد) نے مجھ سے پوچھا...... ''نظیر احمد کیا ہوا؟'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی ابا جی چیخ اٹھے...... ''یہ اعجاز کیوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ یہ کیوں میری عاقبت برباد کرنے پر تلا ہوا ہے؟'' بھابھی جی حیران و پریشان کھڑی میری جانب سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں' چنانچہ میں نے انہیں اعجاز بھائی کے خط کے متعلق بتایا تو وہ مزید پریشان ہوگئیں مگر سوائے بے بسی کے ان کے بس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد ابا جی نے اس روز دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور تفصیلاً بتایا کہ......

''مرزا غلام احمد قادیانی نے جب تک نبوت کا دعویٰ نہیں کیا' وہ اچھا کام کر رہا تھا اور یہاں سبھی اس کے ساتھ تھے کیونکہ وہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے اسلام کے حق میں بڑی اچھی طرح چومکھی لڑ رہا تھا اور ہم سب اس کو مبلغ اسلام سمجھا اور کہا کرتے تھے مگر جب اس نے ختم نبوت کا انکار کیا تو تقریباً سب نے اس سے قطع تعلق کرلیا کیونکہ کوئی سچا مسلمان ختم نبوت کا منکر نہیں ہوسکتا۔ میاں جی نے تو بہت پہلے ان کو خط بھی لکھ دیا کہ ہمارا آپ سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر اس اعجاز نے دنیاوی فائدے کی خاطر چوہدری ظفر اللہ' ڈاکٹر بشیر اور اپنے اسی قسم کے قادیانی دوستوں کے بہکاوے میں آکر بیعت کرلی اور ہم سب کے لیے باعث ندامت بنا۔ اس کا چچا (علامہ صاحب) بھی اس کی اسی حرکت کی وجہ سے بے حد غمگین اور سوگوار اس دنیا سے رخصت ہوا اور اس نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ اعجاز نے خاندان کی ناک کٹوادی۔ وہ بیچارہ تو میدان حشر میں رسوائی کے ڈر سے بے حد پریشان تھا۔ اور اب یہ ناہنجار میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں آخر کیوں اور کس طرح اس کی بات مان لوں' میں تو پہلے ہی روز حساب پرسش احوال سے لرزاں ہوں''۔ اس کے بعد حسب عادت انہوں نے دو خطوط لکھ کر حوالہ ڈاک کردیئے۔ ایک اعجاز بھائی کو اور دوسرا قادیانی جماعت کو جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں اس لیے مجھ سے کوئی امید وابستہ نہ کی جائے''۔

میاں جی شیخ نور محمد مرحوم و مغفور کے جس خط کا ذکر نانا جان قبلہ شیخ عطا محمد مرحوم نے کیا اس کی تفصیل یہاں بیان کردینا

مناسب ہوگا۔ اس کا ذکر کئی ایک کتابوں میں پہلے آچکا ہے مگر ایک بار پھر اسے تازہ کر لینے سے کئی ایک شکوک کا ازالہ ہو سکے گا۔ میاں جی کے خط کا متن شاید کسی کے علم میں نہیں مگر اس کا تذکرہ مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب ''سیرت المہدی'' میں اس طرح کیا ہے:

''ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے' ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اس لیے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آگئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔

چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ...... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام لکھا گیا جس میں لکھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں ...... ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نوتعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے' اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈہ تھا''۔ [1]

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک پاس کیا اور کالج میں داخل ہوئے۔ چنانچہ میاں جی نے متذکرہ بالا خط زیادہ سے زیادہ ۱۸۹۵ء میں لکھا ہوگا۔ جب کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۹۰۱ء میں دعویٰ نبوت کیا۔ یعنی مرزا صاحب کے انکار ختم نبوت سے بہت پہلے خاندان اقبال ان سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ شیخ اعجاز احمد صاحب کی پیدائش ۱۸۹۹ء کی ہے یعنی ان کی پیدائش سے کافی عرصہ قبل یہ تعلق ختم ہو چکا تھا اس لیے ان کا یہ فرمانا کہ...... ''بے جی نے ابا جان سے حضرت صاحب کو دعا کے لیے خط لکھوایا [2]۔'' حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور ان کی لاعلمی کا مظہر ہے یا وہ جان بوجھ کر اپنی ولادت کو ''حضرت صاحب'' کی دعا کا نتیجہ ظاہر کر کے تاریخی حیثیت حاصل کرنا چاہ رہے

ہیں۔علاوہ ازیں شاید وقت کا حساب بھی ان سے صحیح نہیں ہوسکا کہ میاں جی کی قادیانی جماعت سے علیحدگی کو تسلیم کر لینے کے باوجود ۱۹۰۲ء[3] تک یہ تعلق قائم ہونے کا بھی دعویٰ کررہے ہیں۔جب کہ یہ رابطہ ۱۸۹۵ء تک منقطع ہو چکا تھا۔

پیشتر اس کے کہ اس سلسلے میں کچھ مزید حقائق بیان کیے جائیں' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب شیخ اعجاز احمد کی تضاد بیانی کا تھوڑا اور ذکر کرلیا جائے۔موصوف اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''۱۹۲۹ء کے غالباً دو ایک سال بعد کی بات ہوگی کہ میں نے بیعت کرلی .....میرے بیعت کرلینے کے بعد شاید دوسرے سال ابا جان نے میرے ہاتھ اپنی بیعت کا خط جماعت احمدیہ کے امام کے نام بھیجا تھا اور حضور نے بیعت منظور کرلی تھی۔پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔دو ایک سال بعد میرے ہمراہ قادیان گئے اور میرے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی۔اس کی خبر روزنامہ الفضل کی ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں درج ہے''۔[4]

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہوتے ہیں:

''ابا جان جماعت احمدیہ میں ابتدائی شامل ہونے والوں میں سے تھے۔وہ ان ۳۱۳ دوستوں میں سے ہیں جن کا نام بانی سلسلہ نے اپنی کتاب ضمیمہ انجام آتھم میں درج کیے ہیں۔اس فہرست میں ان کا نام نمبر ۲۲۴ پر ہے''۔[1]

پھر اسی جگہ تھوڑا آگے چل کر ۱۹۲۹ء میں لکھے گئے ایک خط کے حوالے سے بھی یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش فرمائی کہ ۱۹۲۹ء[2] تک شیخ عطا محمد صاحب قادیانیت پر قائم تھے۔ان کے یہ متضاد بیانات عجب صورتِ حال پیدا کرنے کا

موجب بنتے ہیں کہ پہلے تو بڑے شیخ صاحب کو سابقون میں شامل فرماتے ہیں' پھر ۱۹۲۹ء تک کی سند پیش کرتے ہیں۔حیرت کی بات کہ انہیں اپنی بیعت کی تاریخ بھی یاد نہیں' ان کے بیان کے مطابق انہوں نے غالباً ۱۹۳۱ء میں قادیانی بیعت کی۔دوسرے سال یعنی ۱۹۳۲ء میں اپنے والد صاحب کا نامۂ بیعت اپنے امام صاحب کو پیش کیا۔پھر دو ایک برس بعد یعنی ۱۹۳۴ء میں ان کے والدِ گرامی نے ان کے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی اور اس کے متعلق خبر بھی قادیانی روزنامہ ''الفضل'' کی ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں درج ہوئی۔یعنی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک تمام امور تکمیل پاگئے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔اس سلسلے میں اگر شیخ اعجاز صاحب کے قریبی دوست اور مشہور قادیانی

چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب کا بیان دیکھا جائے تو سارا معاملہ ہی گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''شیخ اعجاز احمد صاحب نے غالباً ۱۹۳۶ء میں حضور کی بیعت کی تھی'' ۔[۳]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ۱۹۳۱ء میں اعجاز صاحب نے بیعت کی تو شیخ عطا محمد مرحوم نے بڑے شدید رد عمل کا اظہار فرمایا جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے اور ان کی اس حرکت پر دونوں بھائی (شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال) بے دست و پا گریہ کناں ہوئے۔ اگر شیخ عطا محمد مرحوم خود قادیانی جماعت کے ممبر تھے اور ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے تو پھر اتنے شدید رد عمل کا اظہار چہ معنی دارد؟ صرف شیخ اعجاز احمد صاحب کے کہہ دینے سے یہ نہیں مانا جا سکتا کہ خاندان کے تمام بزرگ غلط بیانی سے کام لے رہے تھے۔ آخر کیوں؟ اگر شیخ عطا محمد صاحب قادیانی عقائد رکھتے تھے تو انہیں کسی سے چھپانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور اگر ایسا تھا تو حضرت علامہؒ کو ان سے اعجاز صاحب کی شکایت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

اسی طرح غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اعجاز صاحب نے شیخ عطا محمد مرحوم کے جنازے کے متعلق بھی ''مظلوم اقبال'' میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب ان (اعجاز صاحب) سے اجازت مانگی گئی تو انہوں نے بخوشی اجازت ہی نہیں دی بلکہ غیر قادیانیوں کو پہلے جنازہ پڑھنے کی دعوت بھی دے دی۔ انہوں نے بڑی خوبصورتی اور چالاکی سے اس بات کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ درحقیقت جب شیخ عطا محمد مرحوم کا انتقال ہوا تو شیخ اعجاز صاحب نے ان کا جنازہ علیحدہ پڑھنے کی کوشش ضرور فرمائی مگر بری طرح ناکام رہے۔ اس سلسلے میں میرے والدِ محترم بتایا کرتے تھے کہ ''...... جب ابا جی (شیخ عطا محمد صاحب) کا جنازہ مولانا سکندر خاں مرحوم نے پڑھوا دیا تو اعجاز بھائی صاحب اس میں شامل نہیں ہوئے ...... بعد میں اپنے قادیانی ساتھیوں کے ساتھ الگ نماز جنازہ پڑھنے کی جب کوشش کی تو صرف ایک آدمی ان کے ساتھ کھڑا ہوا' جب اعجاز صاحب نے دیکھا کہ کوئی دوسرا ان کے ساتھ شمولیت کے لیے آگے نہیں آ رہا' کیونکہ باقی سب حاضرین تو پہلے ہی نماز جنازہ ادا کر چکے تھے' تو ان کا چہرہ بالکل فق ہو گیا ...... چنانچہ ان کے ایک دوست سے شاید ان کی وہ حالت دیکھی نہ گئی اور حالانکہ وہ صاحب پہلے ایک دفعہ سب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر چکے تھے' دوبارہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح کل تین افراد نے دوبارہ نماز جنازہ ادا کی۔

علاوہ ازیں جب ۱۹۵۹ء[۱] میں شیخ عطا محمد مرحوم کی بیگم صاحبہ محترمہ مہتاب بی بی صاحبہ خلد آشیانی یعنی شیخ اعجاز احمد

صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو اعجاز صاحب نے تمام مسلمانوں کے ساتھ ان کی نمازِ جنازہ ادا کی' کیونکہ اپنے والدِ محترم کے جنازے پر ان کو بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا اور وہ یقیناً اس کا اعادہ نہیں چاہتے تھے۔ یہ راقم الحروف کے سامنے کی بات ہے کہ اعجاز ماموں نے راستے میں ہی اپنے چند جماعتی احباب سے جو جنازہ کے ساتھ موجود تھے' کہہ دیا تھا کہ..... ''میں اپنی ماں کا جنازہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا اس لیے اگر آپ کو سب کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھنا گوارا ہو تو ساتھ چلیں ورنہ یہیں سے واپس ہو جائیں کیونکہ میں سب کے ساتھ نمازِ جنازہ ادا کروں گا''۔ چنانچہ ان کے قادیانی دوست واحباب وہیں سے پلٹ گئے اور اعجاز ماموں نے سب مسلمانوں کے ساتھ انہی مولانا سکندر خان مرحوم جنہوں نے شیخ عطا محمد مرحوم کی نمازِ جنازہ پڑھائی تھی اور جو اقبال منزل کے بالمقابل جہانگیری مسجد کے پیش امام اور حنفی العقیدہ مسلمان تھے' کی اقتدا میں نمازِ جنازہ ادا کی۔

اسی طرح مجھے یہاں ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے کہ کس طرح اعجاز ماموں نے اپنے خسرِ محترم کی نمازِ جنازہ میں شرکت فرمائی تھی۔ یہ راقم الحروف کے سامنے کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ اعجاز ماموں کے خسر وفات پا گئے ہیں۔ چنانچہ خالہ عنایت کے ہمراہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ ماموں اعجاز صاحب بھی کراچی سے تشریف لا رہے تھے۔ وہ بزرگوار ان دنوں اپنے صاحبزادے کے پاس گلبرگ کالونی کے پی بلاک میں مقیم تھے۔ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اعجاز ماموں بھی کراچی سے تشریف لے آئے اور جنازہ گلبرگ کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ جب سب لوگ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوئے تو اعجاز ماموں الگ تھلگ ایک طرف کھڑے رہے۔ اب جن لوگوں کو ان کے عقائد کے بارے میں علم نہیں تھا' وہ بار بار ان کو اشارے کر رہے ہیں کہ آیئے نمازِ جنازہ میں شریک ہو جایئے مگر وہ لاتعلق منہ دوسرے طرف موڑے کھڑے ہیں اور کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سسرالی عزیزوں کو تو یقیناً معلوم ہوگا مگر انہیں بھی شاید اس کا یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک اچھا بھلا سمجھدار انسان جو خاص طور پر کراچی سے لاہور پہنچا ہے تاکہ اپنے خسر کے جنازے میں شرکت کر سکے' وہ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے سے گریزاں ہے۔ اول تو انہیں اس طرح کراچی سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا یا پھر گھر پر ہی ٹھہر جاتے مگر وہ تو اپنی لاتعلقی کا برسرِعام اعلان کرنے ہی کے لیے شاید اتنی دور سے آئے تھے..... آخر جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو مجبوراً مجھے ہی یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا اور میں نے نمازِ جنازہ میں ان کے

شریک نہ ہونے کی وجہ لوگوں کے گوش گزار کر دی۔ سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ شاید ان سب کے لیے وہ پہلا تجربہ تھا کہ قادیانی حضرات کس طرح اپنے عقائد پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ چنانچہ نمازِ جنازہ اعجاز ماموں کے بغیر ادا کی گئی اور انہوں نے اپنے خسرِ محترم کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی نہ سب کے ساتھ اور نہ ہی علیحدہ' کیونکہ ان کے خسر قادیانی عقائد نہیں رکھتے تھے اس لیے ان کے حساب میں ''کافروں'' میں شامل تھے۔

میرے خیال میں قادیانی عقائد رکھنے والے جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو یہ احساس دلا سکیں کہ وہ ایک علیحدہ حیثیت کے مالک اور ایک الگ مذہب کے پیروکار ہیں۔ مگر اب جب انہیں ایک علیحدہ حیثیت مستقل طور پر مل گئی ہے اور انہیں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا ہے تو ان کو برا محسوس ہوا ہے اور اب وہ مسلمانوں میں ہی شامل رہنے پر مصر ہیں۔ اصل میں یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کو یہ کافر بھی قرار دیتے رہیں اور ان میں شامل بھی رہیں۔ یا پھر ان کا خیال یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو ''کافر'' قرار دے کر ''اقلیت'' بنا دیا جائے اور ان کی جماعت کو ''اصل مسلمان'' تسلیم کر لیا جائے۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو ان کی کم عقلی پر ماتم کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

آمدم بر سرِ مطلب' جن دنوں مرزا غلام احمد قادیانی یہاں سیالکوٹ میں ملازمت کر رہے تھے اور کوچہ حسام الدین میں ان کا قیام تھا تو کافی لوگ ان کی اس تحریک میں شامل تھے جو وہ دفاعِ اسلام کے طور پر کر رہے تھے۔ اگر اس دور پر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو سیالکوٹ کے کافی گھرانوں میں ان کے ساتھی مل جائیں گے۔ خاص طور پر محلہ کشمیریاں میں تو ان کا اثر زیادہ ہی نمایاں رہا۔ عام لوگوں کے علاوہ سید زادوں تک ان کے پیروکاروں میں شامل تھے۔ دراصل مرزا صاحب نے اپنے کام کا آغاز گزشتہ صدی کے وسط میں آریہ سماجیوں کی مخالفت اور مناظروں سے کیا۔ پھر انہوں نے اپنا رخ عیسائی پادریوں کی طرف پھیرا اور خوب خوب مناظرے ان سے کیے۔ چنانچہ عام طور پر مسلمان ابتدا میں انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان دنوں سیالکوٹ میں عیسائی مشنریوں کا بہت زور تھا۔ شہر کا سب سے اچھا سکول عیسائی مشنری ہی چلا رہے تھے اور اپنا زہریلا پراپیگنڈہ ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ فوج کی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے کئی ایک گرجا گھر بھی یہاں تعمیر ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو مرزا غلام احمد کی صورت میں ایک بڑا اچھا مقرر مل گیا تھا۔ چنانچہ اس دور کے دینی ماحول میں سب لوگ روزانہ شام کو جمع ہوتے اور دینی امور پر سیر حاصل بحث و تمحیص ہوتی اور مرزا

صاحب کو ان کے مناظروں پر داد دی جاتی اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیا جاتا۔ ان دنوں سیالکوٹ کے باسی انہیں ایک شعلہ بیان مقرر کے طور پر جانتے اور مانتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد مرزا صاحب نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو محدّث اور مجدّد کہلوانا شروع کر دیا۔ اور اپنے عجیب و غریب کشف بیان فرمانے لگے۔ اور کسی حد تک پیری مریدی کا در پردہ سلسلہ بھی قائم کر لیا۔ اس دور میں یہ بڑا عام سا رواج تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی پیر صاحب کی بیعت ضرور کر لیتا تھا۔ خاص طور پر کشمیری خاندان تو پیری مریدی کے بے حد قائل تھے اور ان کے پیر صاحبان تو کشمیر سے بھی آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک کشمیر سے یہ پیر صاحبان تشریف لایا کرتے تھے اور مختلف گھرانوں میں قیام کیا کرتے تھے اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوا کرتی تھی۔ اس ماحول میں مرزا صاحب کی پیری مریدی چلنے کے امکانات خاصے روشن تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا سیالکوٹ میں قیام زیادہ سے زیادہ ۱۸۷۰ء تک رہا۔ قادیان واپس جا کر وہ مختلف مقدمات میں مشغول رہے۔ کتابیں لکھتے اور چھپواتے رہے۔ ۱۸۸۶ء سے انہوں نے عجیب و غریب الہامات شائع فرمانے شروع کیے اور لوگوں کو حیران و پریشان کر دیا۔ ۱۸۹۱ء میں "المسیح الموعود" اور "المہدی المسعود" ہونے کے دعوے داغ دیئے۔ اس کی وجہ سے یہاں سیالکوٹ میں لوگ ان سے متنفر ہونا شروع ہو گئے۔ چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کا رابطہ انگریز حکمرانوں سے بڑا پرانا تھا' اس لیے انہوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرزا مسلمانوں پر خاصے اثر انداز ہو سکتے ہیں ان کو مسلمان اور اسلام کے خلاف استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور مرزا صاحب نے اپنی خاندانی روایات کے عین مطابق فوراً صاد کہہ دیا اور سرکارِ انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا بننا منظور کر لیا اور اسی منصوبہ کے زیرِ اثر ۱۹۰۱ء میں انکارِ ختمِ نبوت کرتے ہوئے دعویٰ نبوت کر دیا اور جہاد کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جیسے ہی ۱۹۰۱ء میں دعویٰ نبوت کیا' ہر طرف ایک شور اٹھا اور صحیح العقیدہ مسلمانوں نے فوراً قطع تعلق کر لیا اور کسی صورت ان کی سازش میں شریک نہیں ہوئے۔ جہاں تک خاندانِ اقبال کا تعلق ہے' میاں جی (شیخ نور محمد مرحوم) بہت پہلے لاتعلقی کا اظہار کر چکے تھے جس کا ثبوت ان کی (قادیانی جماعت) کی کتابوں میں موجود ہے اور گزشتہ صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ انگریز حکومت کے ساتھ مل کر اس جماعت نے لوگوں کو مختلف لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور بہت سے کمزور ایمان والے جلبِ منفعت کے لیے ان کے چکر میں آ

گئے۔ اکثر نے خوب دنیا کمائی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انہی میں شیخ اعجاز احمد صاحب بھی شامل تھے۔ دنیا میں انہوں نے خوب ترقی کی اور سر ظفر اللہ خان' جو ان کے بڑے قریبی دوست تھے' نے انہیں خوب خوب فائدہ پہنچایا۔

مندرجہ بالا تمام حقائق اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے انکارِ ختم نبوت کے بعد خاندانِ اقبال میں سے صرف شیخ اعجاز احمد صاحب نے ان کی بیعت کی اور ۱۹۳۱ء میں ان کی بیعت کے وقت شیخ عطا محمد مرحوم نے جس طرح غم وغصے کا اظہار فرمایا اور چھوٹے بھائی (علامہ صاحب) کے ساتھ مل کر جس طرح اس سانحہ پر ماتم کناں ہوئے اور مرض الموت میں جس طرح جماعتِ قادیانی کو اپنے ''صاحبزادے'' شیخ اعجاز احمد کی طرف سے لکھے گئے خط کے سلسلے میں وضاحتی خط ارسال کیا اور پھر اپنے جنازے کے متعلق میرے والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی مرحوم کو آخری وصیت فرمائی ...... یہ تمام حقائق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ شیخ عطا محمد صاحب کبھی بھی منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل نہیں رہے۔ کیونکہ اگر وہ مرزا قادیانی کے متعلق ذرا سا بھی نرم گوشہ رکھتے تو کبھی بھی اس طرح کا ردِ عمل ظاہر نہ فرماتے۔ کیونکہ انہیں کس کا ڈر تھا کہ وہ اپنا یہ فعل پوشیدہ رکھتے۔ اگر وہ مرزا قادیان کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہتے تو کوئی ان کو منع کرنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت خاندان میں سب سے بڑے تھے۔

چنانچہ یہ کہنا پڑے گا کہ شیخ اعجاز صاحب نے جان بوجھ کر ان پر بہتان لگایا ہے تاکہ خاندان کا کم از کم ایک فرد تو ان کے ساتھ شامل ہو اور ان پر خاندانِ اقبال کا ''اکلوتا قادیانی'' ہونے کا جو لیبل چسپاں ہو گیا ہے' وہ کسی طور ختم ہو سکے اور وہ دعویٰ کر سکیں کہ انہوں نے اپنے والد کی پیروی میں یہ قدم اٹھایا۔ مگر حقیقت کو تبدیل کرنا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا اور سچائی ہمیشہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اب اگر کسی طرف سے کوئی اس قسم کے ''خانہ ساز'' ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تو انہیں جھٹلانا اتنا مشکل نہیں ہوگا۔

اس لیے اب یہ بھی بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت اور تسلیم شدہ ہے کہ خاندانِ اقبال میں سے صرف اور صرف ایک فرد منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہوا اور اس نے بھی ۱۹۳۱ء میں اس میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے پہلے کوئی اس گروہ میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی خاندانِ اقبال کا کوئی دوسرا فرد اس کے بعد اس گروہ میں شامل ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جو تھوڑا بہت تعلق مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ تھا' وہ بھی صرف ان کے مبلغِ اسلام ہونے کے ناطے سے تھا اور ان سے کوئی تعلق کسی اور حوالے سے کسی دور میں نہیں رکھا گیا۔ اگر حضرت علامہ نے اس وقت ان کی

حمایت میں چند اشعار لکھے تو وہ صرف اس لیے کہ اس وقت مرزا صاحب کی حیثیت اسلام کے ایک پر زور مبلغ کی تھی' نہ کہ اسلام کے خلاف دعویٰ نبوت کر کے خود کو ایک نئے فتنہ ارتداد کا بانی ثابت کرنا اور منکرینِ ختم نبوت کا ایک ایسا گروہ تشکیل دینا جس نے آگے چل کر ایک انتہائی متنازع فیہ شکل اختیار کر لی تھی اور جس نے کھلم کھلا فرنگیوں کی حمایت کرتے ہوئے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے دل میں چھپے اس چور کو اس وقت کوئی بھی نہ پہچان سکا کہ دلوں کے بھید صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔ اس لیے سادہ لوح لوگ جن کے دلوں میں اسلام کی سربلندی کی تڑپ تھی' مرزا قادیانی کے اس ہم رنگِ زمین جال کی اصلیت کو نہ جان سکے اور اندھی عقیدت کا شکار ہوتے چلے گئے۔ ان کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب ''ختمِ نبوت'' جو ہر سچے مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہے' کا انکار کیا گیا۔ انکارِ ختمِ نبوت کا یہ اعلان فدایانِ رسالت ﷺ کے لیے تازیانے کا حکم ثابت ہوا اور انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مرزا قادیانی کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔ خاندانِ اقبال تو اس سے بہت پہلے اس گروہ سے کنارہ کش ہو چکا تھا جس کی تائید خود مرزا بشیر احمد ''سیرت المہدی'' میں فرما چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ خاندانِ اقبال کا کوئی دوسرا فرد اس گروہ میں شامل نہیں رہا اور انہوں نے ہمیشہ دنیا پر دین کو ترجیح دی۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا!

(بالِ جبریل)

آخری حسرت

''مظلوم اقبال''میں ''آخری ملاقات'' کے عنوان کے تحت جناب شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنے عظیم چچا جان سے آخری ملاقات کا بڑا عجیب وغریب احوال بیان فرمایا ہے......ذرا ان کے الفاظ ملاحظہ کریں:

''میں نے عرض کیا'میری رخصت آج ختم ہورہی ہے لہٰذا میں رات کی گاڑی سے دہلی جارہا ہوں ......انہوں نے گاؤ تکیہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے مصافحہ کیا تو نحیف آواز میں ''خدا حافظ'' کے الفاظ سنائی دیئے۔ یہ سب باتیں ان کے معمول کے بالکل خلاف تھیں......ان کے ہاں قیام کے بعد جب کبھی رخصت ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پنجابی میں صرف اتنا فرماتے ......''اچھا چلیاں اے'' (اچھا جارہے ہو) وہ نہ تو کبھی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے نہ ہی خدا حافظ کہتے ......رخصت کا یہ خلافِ معمول انداز مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا''۔[1]

اگر آپ کے پاس ایک دردمند دل اور اس میں ہلکی سی تڑپ موجود ہے تو تھوڑا سا یکسو ہونے سے حضرت علامہ کے اس غیر معمولی طرزِ عمل کا جواز کسی حد تک سمجھ میں آجاتا ہے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب نے بھی طرزِ عمل میں غیر معمولی بات محسوس ضرور کی مگر اس پیغام تک رسائی نصیب نہ ہوئی جو ان کو عمِ محترم دینا چاہ رہے تھے۔ یقیناً وہ اس پیغام کی گہرائی تک نہیں پہنچ پائے کہ آخر کیوں یہ عظیم شخصیت جو ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ اس قدر قوی رہی' جس نے اپنی پوری زندگی کفر والحاد کی قوتوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا اور جو اپنی قوم اور ملت کے لیے باطل کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر رہی' جس نے اپنا سب کچھ ملک وقوم کی بھلائی کے لیے ہمیشہ داؤ پر لگائے رکھا اور جس نے کبھی بھی اپنے بڑے سے بڑے فائدے کو سوادِ اعظم پر فوقیت نہیں دی وہ آخر آج اس قدر کمزور کیوں پڑ گئی ......اس کی گرفت اتنی بے جان کیوں ہورہی ہے اور آج اس نے مجھے یہ شرف کیوں بخشا ہے کہ وقتِ رخصت مردہ سا ہی سہی' مگر ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہا......

کاش! اعجاز صاحب اپنے عمِ محترم کی اس وقت کی دلی کیفیت جان سکتے اور ان کی آخری وقت کی وہ خواہش جو انہوں

نے اپنے اس بھتیجے سے کی تھی جو خود کو ان کا بڑا مزاج آشنا سمجھا کرتا تھا اور جس سے انہوں نے اور ان کے برادر بزرگ نے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ مگر نہیں، شیخ اعجاز احمد صاحب کی قسمت میں وہ اعزاز شاید نہیں تھا، جو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اس وقت انہیں حاصل کر لینے کا اشارہ دیا۔

تھوڑا سا اس غیر معمولی طرزِ عمل کی گہرائی میں جانے کی کوشش کیجئے۔ ذرا ایک حساس دل سے اس صورتِ حال کا موازنہ کریں کہ کس طرح ایک کمزور بلکہ مردہ سا ہاتھ اعجاز صاحب کے ہاتھ میں دے کر حضرت علامہؒ ان سے کیا کہنا چاہ رہے تھے...... یقیناً اس وقت تک حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو اپنے وقتِ آخرت کے بالکل قریب ہونے کا پورا پورا ادراک ہو چکا تھا اور انہیں یہ بھی احساس تھا کہ اعجاز کے ساتھ یہ ان کی آخری ملاقات ہے...... انہوں نے کسی دوسرے سے کیوں اس طرح مصافحہ نہیں کیا اور نہ ہی خدا حافظ کہا؟ حالانکہ دمِ واپسیں تک لوگ ان کے قریب موجود تھے۔

کیا اس وقت اپنے غیر معمولی طرزِ عمل سے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ اچھا اب میرا دمِ واپسیں ہے، شاید دوبارہ ملاقات ممکن نہ ہو...... خدا حافظ میرے بیٹے! میرے حال پر رحم کھاؤ اور مجھے اس ندامت سے بچا لو جس کے تابل میں خود کو نہیں پا رہا...... میرا دل اس وقت کے خوف سے بیٹھا جا رہا ہے، جب مجھ سے تمہارے بارے میں بازپرس ہو گی، وہاں میں کیا جواب دوں گا...... یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے اور میرے ہاتھوں پیروں سے ابھی سے ہی جان نکل رہی ہے۔ خدا جانے وہاں میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ اور یہ سب کچھ تمہاری اور صرف تمہاری وجہ سے ہو گا، صرف تم ہی مجھے اس گرداب سے نکال سکتے ہو کہ تم نے جو داغ میرے ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کے نصیب پر لگایا ہے، خدارا اسے ختم کر دو کیونکہ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے کہ روزِ محشر میں کس منہ کے ساتھ اس عظیم ہستی کا سامنا کروں گا کہ جس کے ساتھ تم نے، میرے اپنے خون نے، بے وفائی کی......؟

میرے بیٹے! میں نے ساری زندگی جس کی عظمت کے گن گائے اور جس کی محبت میرا سب سے عزیز سرمایہ حیات ہے اور جس کی شفاعت پر میں تکیہ کیے بیٹھا ہوں اور میدانِ حشر میں "دارد امید شفاعت ز محمد اقبال" مگر تم نے یہ کیا کر دیا، اسی کے سامنے میری رسوائی کا سامان کر دیا...... میں اب کس طرح وہاں شفاعت کے لیے دستِ سوال دراز کر سکوں

گا ..... میری نگاہ تو یہاں نہیں اٹھ رہی، وہاں کیا بنے گا .....؟

مگر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے جو پرحسرت نگاہیں اعجاز صاحب پر ڈالی تھیں اور بے جان سا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر خدا کی پناہ کے لیے سوالی بنے تھے، اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور اعجاز صاحب بغیر کوئی خاص اثر قبول کیے وہاں سے رخصت ہو گئے ..... اور صرف چند گھنٹوں بعد یعنی ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء صبح صادق کے وقت اس عظیم شخصیت نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور اس عظیم روح کو اپنی اس آخری حسرت کو شرمندۂ تعبیر دیکھنا نصیب نہ ہو سکا کہ وہ اپنے خون کو منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ سے الگ دیکھ کر سرخرو اور سربلند اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب کوچ کرتی ..... کاش!

مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں شاعرِ مشرق نے اپنے بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے والدِ بزرگوار کی زبانی جو نصیحت بیان فرمائی ہے، اس کا ایک حصہ مندرجہ بالا صورتِ حال پر بھی بڑی اچھی طرح منطبق ہوتا ہے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

اے صراطت مشکل از بے مرکبی ․․․ من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ
''حق جوانے مسلمے با تو سپرد ․․․ کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نشد ․․․ یعنی آں انبارِ گِل آدم نشد''
در ملامت نرم گفتار آں کریم ․․․ من رہینِ خجلت و امید و بیم
اند کے اندیش و یاد آر اے پسر ․․․ اجتماعِ امتِ خیر البشرؐ
باز ایں ریشِ سفید من نگر ․․․ لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن ․․․ پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

حضرت علامہؒ نے جس دردناک انداز میں اپنے والدِ گرامی کی طرف سے یہ کہا ہے کہ جب روزِ محشر نبی کریم ﷺ مجھ سے بازپرس فرمائیں گے کہ ..... ''ہم نے ایک مسلمان تمہارے سپرد کیا تھا کہ اسے صحیح طور پر انسان بناؤ مگر یہ آسان کام بھی تم سے مکمل نہ ہو سکا اور مٹی کے اس ڈھیر کو تم انسان نہ بنا سکے؟'' میرے خیال میں اب یہی صورتِ حال علامہ علیہ الرحمۃ کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے اور ان سے بھی اسی قسم کے سوالات شیخ اعجاز صاحب کے بارے میں

پوچھے جائیں گے اور یقیناً وہ اسی وجہ سے لرزاں اور ترساں تھے اور وقتِ آخر زبانِ حال سے یہی استدعا کر رہے تھے کہ میرے بیٹے! مجھے اس سے بچالے اور میرے ان سفید بالوں پر ترس کھاؤ اور مجھے میرے مولا کے حضور رسوانہ کرو...... کیونکہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے!

"والدہ مرحومہ" کا وقتِ آخر

ماں کے مرض الموت میں مبتلا ہونے پر علامہ اقبالؒ کی بے چینی اور بے بسی

یہ ۱۹۱۴ء کے موسمِ گرما کا ذکر ہے کہ بے جی (والدۂ اقبال) جواب خاصی کمزور ہو چکی تھیں اور گزشتہ چند برسوں سے کسی نہ کسی وجہ سے علیل چلی آ رہی تھیں...... دردِ گردہ کی شکایت تو خدا جانے کب سے تھی اور اس کے لیے پتہ نہیں کیا کیا اور کون کون سے نسخہ جات ان کے زیرِ استعمال رہ چکے تھے۔ اسی تکلیف کی بنا پر ایک عرصہ سے وہ روزے رکھنے سے معذور ہو چکی تھیں اور ہر سال فدیہ رمضان دیا کرتی تھیں۔ ان دنوں چونکہ موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں' اس لیے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ بھی سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ ایک روز بے جی کو ہلکا سا بخار ہوا اور چند روز میں اس نے موسمی بخار بن کر خاصی شدت اختیار کر لی۔ کمزور تو وہ پہلے ہی تھیں جس کی وجہ سے قوتِ مدافعت تقریباً ختم ہو چکی تھی' چنانچہ بالکل چارپائی سے جا لگیں۔ گھر کے تمام افراد بے حد فکرمند ہو گئے۔ علامہ صاحب کی خواہش تھی کہ بے جی کو علاج کے لیے لاہور لے جائیں لیکن وہ کسی قیمت پر سیالکوٹ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ چنانچہ یہیں پر جیسا ممکن تھا' علاج معالجہ ہوتا رہا۔ مگر کمزوری تھی کہ دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ حضرت علامہؒ تعطیلات کے اختتام پر بادل نخواستہ لاہور واپس چلے گئے کیونکہ کئی ایک کام وہاں پر رکے ہوئے تھے۔ مگر تقریباً روزانہ خیریت معلوم کرنے کے لیے خط ان کا آتا تھا یا کسی اور ذریعے سے والدہ کی خیریت معلوم کرتے تھے۔ ان دنوں ابھی ٹیلیفون اتنا عام نہیں ہوا

تھا' البتہ تار کی سہولت موجود تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی تار کے ذریعے بھی احوال دریافت کر لیتے تھے۔

بخار نے کسی طرح بے جی کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ بخار صرف ایک بہانہ ہے اور درحقیقت وہ آہستہ آہستہ مرض الموت میں مبتلا ہوتی جا رہی ہیں۔ اکتوبر کے وسط تک ان کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی اور کمزوری اس قدر بڑھ گئی کہ ہلنا جلنا تک ممکن نہ رہا۔ علامہ علیہ الرحمۃ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ پہلی فرصت میں سیالکوٹ پہنچ گئے۔ والدہ کی دن بدن بگڑتی ہوئی صحت نے انہیں بے حد پریشان کر دیا۔ وہ اپنی پیاری ماں کے لیے اس قدر بے چین تھے کہ دن رات ماں کے سرہانے سے اٹھتے ہی نہ تھے۔ وہ سیالکوٹ میں میسر ڈاکٹروں اور حکیموں کے علاج سے مطمئن نہ تھے' اس لیے لاہور سے اپنے دوست ڈاکٹروں کو بلوا لیا مگر کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔

نومبر کے شروع میں بے جی بالکل بے سدھ ہو چکی تھیں..... کوئی غذا حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔ بس پانی کے چند قطرے باقی تھے۔ دن بدن پیار کا وہ چاند جو گزشتہ ۸۰ برس سے اپنی پیاری اور مہربان کرنیں چار سو بکھیرتا اور ہر کسی پر نچھاور کرتا رہا تھا اور جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں ''بالے''ؒ نے اپنا بچپن اور جوانی بتائی تھی' آہستہ آہستہ ڈھلتا جا رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ مہربان چہرہ اب بہت جلد آنکھوں سے اوجھل ہونے کو ہے..... ہمیشہ کے لیے..... پھر کبھی نظر نہ آنے کے لیے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اس صورتِ حال سے اس قدر سراسیمہ اور بے بس تھے کہ ان کو کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ کس طرح اپنی اس عزیز ترین ہستی کو سفرِ آخرت سے روک لیں.....!

انسان آج ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے..... یہ ایجادات' یہ سائنس کی عظیم کامیابیاں اور بلند بانگ دعوے..... مگر اس مقام پر آ کر انسان بے بس ہو جاتا ہے' کوئی طاقت' کوئی بڑی سے بڑی ایجاد' کوئی دعویٰ' کچھ یہاں کام نہیں آتا۔ یہاں ہر کوئی بے دست و پا ہو جاتا ہے..... کسی کے بس میں کچھ بھی تو نہیں رہ جاتا..... ہر انسان اپنے پیاروں کو بچھڑتا ہوا دیکھتا ہے مگر کچھ نہیں کر سکتا..... کچھ بھی تو نہیں..... یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کو اپنی حیثیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس عظیم و قدیر کے سامنے تمام قوتیں پرکاہ کے برابر ہیں۔ تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور بے بس انسان کے بس میں ایک دوسرے کو تلقینِ صبر کے سوا کچھ بھی نہیں رہ جاتا.....!

انہی دنوں عید الاضحیٰ بھی آئی مگر وہاں عید اور قربانی کا کسے ہوش تھا۔ اقبال منزل پر تو موت کا سناٹا چھایا تھا۔ پورا گھر

اپنی مالکن کے لیے سوگوار تھا۔ وہ مالکن جو ایک طویل مدت سے اس گھر پر حکومت کرتی رہی تھی، کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا...... پورا گھرانہ بلکہ اڑوسی پڑوسی محلّہ داران کی نیک اور پیاری عادات کے دیوانے تھے۔

ماں کا احسان

یہاں مجھے پھوپھی کریم بی بی خلد آشیانی سے شنید ایک واقع یاد آ رہا ہے، جو ان دنوں سے متعلق ہے جب بے جی مرض الموت میں مبتلا تھیں۔ وہ بتایا کرتی تھیں کہ:

''جن دنوں بے جی شدید بیمار ہوئیں، میں سیالکوٹ میں موجود نہیں تھی۔ جیسے ہی مجھے اطلاع ملی میں لشتم پشتم سیالکوٹ پہنچی۔ گھر میں داخل ہوئی تو یوں محسوس ہوا کہ ہر طرف موت کا سکوت طاری ہے۔ بے جی کے کمرے میں پہنچی تو ان کو دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بستر میں بے ہوش پڑی تھیں اور چہرے پر موت کی زردیاں کھنڈ رہی تھیں۔ زینب! چیخ کر میرے گلے لگی تو میری بھی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے بے جی کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور زاروقطار رونے لگی۔ بھابھی ؒ جی نے مجھے گلے سے لپٹا کر دلاسا دیا اور صبر کی تلقین کی۔ پھر آہستہ سے میرے کان میں کہا...... ''جاؤ میاں جی سے مل لو تمہارے دونوں بھائی بھی وہیں ہیں''۔

میں افتاں وخیزاں میاں جی کے کمرے میں پہنچی اور ان کی گود میں سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی۔ انہوں نے رونے سے منع کرتے ہوئے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا کے لیے تلقین کی۔ دونوں بڑے بھائی عطا محمد صاحب اور محمد اقبال صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ بھائی عطا محمد صاحب تو بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر روئے چلے جا رہے تھے۔ میرے وہاں پہنچنے سے ان کا رونا مزید تیز ہو گیا۔ میاں جی بے چارے بار بار انہیں منع کر رہے تھے مگر ان پر کچھ اثر نہیں ہو رہا تھا اور وہ بے دست و پا بس روئے ہی چلے جا رہے تھے۔

تینوں باپ بیٹے اس وقت بے حد پریشان تھے اور بے جی کی بیماری میں آفاقے کی بجائے شدت نے ان سب کو ہلکان کیا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ بے جی کی عظیم شخصیت کے متعلق بھی رطب اللسان ہو رہے تھے اور گن گن کر ان کی خوبیاں بیان کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو اقبال بھائی ایک دم بڑے جذباتی ہو گئے اور فرمایا...... ''میاں جی! میں تو اپنی ماں کے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکوں گا، جو اس نے میرا دودھ بند کر کے مجھ پر کیا تھا''۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں چھلکنے کے قریب تھیں اور بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کی اس بات پر میاں جی خاموش اور

دلگیر سے بیٹھے رہے مگر بھائی عطا محمد زور زور سے سر ہلاتے جا رہے تھے اور مزید شدت سے روتے چلے جا رہے تھے۔

اس بار میاں جی نے ذرا سختی سے انہیں ڈانٹا..... ''عطا محمد بس خاموش ہو جاؤ..... یہ عورتوں کی طرح رونا دھونا اب بند کرو''۔ چنانچہ بھائی صاحب نے زور سے رومال میں ناک صاف کیا اور دبا دبا کر آنکھیں صاف کرنا چاہیں مگر آنسو تھے کہ کسی طور تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے..... وہ بے چارے بے بس تھے۔

اقبال بھائی صاحب نے بے جی کے جس احسان کا ذکر کیا تھا مجھے اس کے متعلق بس واجبی سا معلوم تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً تین برس بڑے تھے' اس لیے ان کی شیر خواری کے زمانے کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں۔ میں نے میاں جی کی طرف سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ میں میاں جی کی بڑی لاڈلی تھی اور وہ ہر بات مجھے بتا دیا کرتے تھے مگر اس کے متعلق انہوں نے کبھی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ میاں جی بولے..... ''یہ بڑی پرانی بات ہے اور بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کیونکہ تمہاری بے جی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ میں نے ابھی ابھی اس کا تفصیلی ذکر شاید پہلی بار تمہارے دونوں بھائیوں سے کیا ہے۔ اب تمہیں بھی سنائے دیتا ہوں۔ جن دنوں اقبال ابھی کمسن تھا اور ماں کا دودھ پیتا تھا' تمہاری بے جی کو یہ وہم ہو گیا کہ میری کمائی میں کچھ ملاوٹ ہے۔ دراصل ان دنوں میں ایک جگہ ملازمت کر رہا تھا اور امام بی بی[1] کو یہ خیال ہوا کہ جو تنخواہ مجھے وہاں سے ملتی ہے' وہ درست ذرائع سے حاصل نہیں ہوتی۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور اگر ہے بھی تو میں تو پوری دیانتداری سے اور محنت سے اپنا کام انجام دیتا ہوں۔ اس لیے میری کمائی پر شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ مگر ان کی تسلی کسی طرح نہ ہو سکی اور انہوں نے فوراً اقبال کو اپنا دودھ پلانا بند کر دیا۔ اپنا کچھ زیور فروخت کر کے ایک بکری خرید لی اور اس کا دودھ اقبال کو تب تک پلایا' جب تک پوری طرح تسلی نہ ہو گئی کہ میری آمدن بالکل پاک صاف ہے۔ اس دوران تمہاری ماں[2] نے اقبال کو اپنا دودھ بالکل نہیں پلایا اور اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ بچپن سے ہی اس کے لیے رزق حلال کا پورا پورا اہتمام کیا اور مشتبہ کمائی سے دودھ کا ایک قطرہ بھی اس کے جسم میں نہیں جانے دیا''۔

داغ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا
سجدہ وہ کر کہ روئے زمیں پر نشاں رہے

(اقبال)

۹ نومبر ۱۹۱۴ء[1] کا دن شاید حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی زندگی کا تاریک ترین دن رہا ہوگا کہ آخر وہ گھڑی آن پہنچی، جب ان کی عزیز ترین ہستی، ان کی والدہ محترمہ ان سے بچھڑ گئیں۔ اور وہ مجبور اور بے بس کچھ بھی تو نہ کر سکے ...... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اپنی بے بسی کا اظہار انہوں نے اپنی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جس میں انہوں نے اپنی والدہ کا مرثیہ لکھا' کی ابتدا میں یوں کیا:

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیء تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے، شمس و قمر مجبور ہیں
انجمِ سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچے کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبورِ نمو گلزار میں
نغمہء بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اسی زنجیرِ عالمگیر میں ہر شے اسیر!
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سرِّ مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل پر اشک کا سیلِ رواں
قلبِ انسانی میں رقصِ عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطفِ زیر و بم رہتا نہیں
علم و حکمت رہزنِ سامانِ اشک و آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دلِ آگاہ ہے!
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دارِ اشکِ عنّابی نہیں

جانتا ہوں آہ! میں آلامِ انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز
میرے لب پر قصہء نیرنگیء دوراں نہیں
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریہء پیہم کی ہے
آہ! یہ تردید میری حکمتِ محکم کی ہے

(بانگِ درا)

میاں جی نے اپنی رفیقہء حیات کا کفن خود سیا اور خواتین کو میت پر واویلا کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ چنانچہ بہوؤں اور بیٹیوں کی آنکھوں سے خاموش آنسوؤں کی برسات تو ہوتی رہی مگر کسی کی آواز نہ نکلی...... مگر بے جی کے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد صاحب کسی طور نہیں مان رہے تھے اور اپنی ماں کے لیے بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے جا رہے تھے...... چھوٹا بھائی (علامہ صاحب) بڑے کو سمجھاتا اور تسلیاں دیتا رہا، وہ خود اپنے عظیم والد کی طرح رضائے الٰہی پر شاکر و صابر رہا مگر چہرے پر حزن و ملال چھایا رہا۔ ضبطِ گریہ نے دونوں باپ بیٹے کا برا حال کر دیا مگر صبر کا دامن کسی طرح نہ چھوڑا۔

آہ! یہ ضبطِ فغاں غفلت کی خاموشی نہیں!
آگہی ہے یہ دلآسائی، فراموشی نہیں!

(بانگِ درا)

وفات کے دوسرے روز یعنی ۱۰ نومبر کو فوتیدگی کی اطلاع سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے شعبہ پیدائش و اموات کو دی گئی۔ اس کے لیے میاں جی یا شیخ عطا محمد نے علی محمد صاحب کو روانہ فرمایا۔ چنانچہ میونسپل ریکارڈ میں ۱۰ نومبر ۱۹۱۴ء کو مندرجہ ذیل اندراج ریکارڈ ہوا جس کی فوٹو کاپی شاملِ کتاب ہے۔ اندراج کی تفصیلات اس طرح ہیں:

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ بے جی کی شدید علالت کی وجہ سے ان کی وفات سے کافی روز پہلے ہی سیالکوٹ تشریف لے آئے تھے اور ان کی وفات کے بعد کافی روز یہیں مقیم رہے اور رواج کے مطابق اقبال منزل کے سامنے گلی میں ''پھوڑی'' [1] ڈال کر فاتحہ خوانی کے لیے بیٹھے رہے۔ ماں کی وفات کا دکھ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا مگر والدِ گرامی شیخ نور محمد صاحب کی تقلید میں صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور مردانہ وار اس عظیم غم کو برداشت کیا اور اپنے والد کے لیے باعثِ تقویت ہوئے۔ تین روز بعد ''سوم'' کی رسم ادا کی گئی اور رواج کے مطابق ختمِ قرآن دلوایا گیا۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو ختمِ قل سے فراغت کے بعد علامہ علیہ الرحمۃ نے ایک خط اپنے دوست سر کشن پرشاد کے جواب میں تحریر کیا اور اس حادثہ جانکاہ کی خبر دی:

سیالکوٹ

۱۱ نومبر ۱۹۱۴ء

سرکارِ والا تسلیم!

سرکار کا برقی پیام مبارکباد عید اور اس کے بعد منظوم عید کارڈ دونوں چیزیں مل گئی تھیں۔ امسال میرے لیے عید محرم کا حکم رکھتی تھی۔ والدہ مکرمہ چھ سات ماہ سے بیمار تھیں۔ ۹ نومبر کی صبح کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی علالت کی پریشانی اور بے اطمینانی کی وجہ سے اس سے پیشتر آپ کی خدمت میں خط نہ لکھ سکا۔ کئی دنوں سے سیالکوٹ میں مقیم ہوں۔ آج ان کا سوم ہے۔ کل یا پرسوں لاہور واپس جاؤں گا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ پریشان ہوں اور بس دعا کیجیے۔

والسلام

آپ کا اقبال [2]

چند روز مزید قیام کے بعد علامہ صاحب واپس لاہور تشریف لے گئے۔ وقتِ رخصت جب بڑے بھائی کے گلے لگے تو شیخ عطا محمد مرحوم کچھ اس شدت سے روئے کہ علامہ صاحب کی آنکھوں کے بندھی ٹوٹ گئے اور اتنے روز کا ضبطِ گریہ آخر ختم ہو گیا اور دونوں بھائیوں نے رو رو کر خوب دل ہلکا کیا۔ میاں جی بھی خاموش اور دلگیر بیٹھے رہے اور حسبِ عادت کسی کو رونے سے منع نہ کیا۔ شاید وہ خود بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھے اور ان کا دل بھی خون

کے آنسو رو رہا تھا۔ آخر کافی دیر بعد انہوں نے ہمت کر کے دونوں بیٹوں کو دلاسا دیا تو ان کو کچھ قرار آیا۔

دسمبر کے آخری ہفتہ میں چہلم کی رسومات ادا کی گئیں اور حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے بھی ان میں شرکت فرمائی۔

سوئے اتفاق کہ انہوں نے چہلم سے متعلق بھی سر کشن پرشادی کو ۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کو یوں اطلاع دی:

لاہور

۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء

سرکار والا! تسلیم:

آپ کا نوازش نامہ عین اس وقت ملا جب کہ میں سیالکوٹ سے لاہور کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

والدہ مرحومہ کا چہلم تھا جو بخیر و خوبی ختم ہوا۔ ابھی لاہور پہنچا ہوں۔

آپ کا خادم　　　محمد اقبال لاہور!

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی مشہور اور شاہکار نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کا ہر شعر اپنی جگہ ایک علیحدہ جہان لیے ہوئے ہے۔ دنیا مانتی ہے کہ اس سے پر اثر اور با معنی مرثیہ شاید ہی کسی نے اپنی ماں کی یاد میں کہا ہو۔ مگر اس کے اختتامی مندرجہ ذیل اشعار میں انہوں نے اپنی والدہ کو جس طرح نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے، وہ واقعی فقید المثال ہے:

دامِ سیمینِ تخیل ہے مرا آفاق گیر
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر!

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخمِ عمل کے واسطے
نورِ فطرت ظلمتِ پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکارِ انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب‌تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا!
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

(بانگِ درا)

اے رو بہک چرانہ نشستی بجائے خویش
باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

(بیدل)

غربت اور امارت

خاندانِ اقبال کی غربت اور ناداری اور حضرت علامہؒ کی گجرات والی سسرال کی امارت کے تذکرے آج کل بہت سی کتابوں میں کیے جا رہے ہیں اور ایک مخصوص طبقہ یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ جس وقت حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی پہلی شادی ہوئی تو ان کا خاندان ان کی سسرال کے مقابلے میں بالکل کوئی حقیقت اور حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ شیخ نور محمد مرحوم بے چارے ٹوپیاں بنانے کا کاروبار کرتے تھے بلکہ یہاں تک کہ:

''شیخ نور محمد جو ٹوپیاں سی کر اپنے خاندان کا پیٹ پالتے تھے''[1]

یہ ذکر کچھ اس طرح کیا جا رہا ہے کہ حقارت کا پہلو صاف نظر آتا ہے۔ یعنی ایک ٹوپی سینے والے کی یہ جرأت کہ ''رئیسِ گجرات'' کے خاندان کی نازونعم میں پلی ہوئی بیٹی کے ساتھ اپنے فرزند کی شادی رچالی ...... وہی طبقاتی عصبیت وہی اسلام کے منافی خیالات۔ شیخ نور محمد صاحب اگر ٹوپیاں سیتے تھے تو اپنے دو ہاتھوں سے حلال کمائی کرتے تھے۔ کسی کے آگے دستِ سوال تو دراز نہیں کرتے تھے۔ کیا محنت کر کے حلال روزی کمانا جرم ہے؟ رزق حلال کے حصول کے لیے ہمارے بزرگوں نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ماضی قریب کی ایک مثال شہنشاہ ہند حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کی ہے جو اپنے لیے کتابت کر کے اور ٹوپیاں سی کر رزق حلال پیدا کرتے تھے۔ اگر شیخ نور محمد اپنے اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے رزق حلال اپنے دو ہاتھوں کی محنت سے اپنے بچوں کے لیے مہیا کرتے تھے تو اس میں حقارت کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟

مندرجہ بالا موضوع پر کئی ایک کتابوں میں غلط بیانیاں کی گئی ہیں مگر آج جو کتاب یہاں موضوعِ سخن ہے وہ حال ہی میں ''اقبال اور گجرات'' کے عنوان کے تحت اشاعت پذیر ہوئی ہے اور اس کے فاضل مصنف نے جو خود کو کسی ''بقراط'' سے کم تصور نہیں فرماتے بڑے عجیب و غریب اعتراضات اور الزامات خاندانِ اقبال کی مالی حیثیت پر کیے ہیں اور حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے خسرِ محترم جناب خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد صاحب (سول سرجن) کی امارت کے اس قدر چرچے فرمائے ہیں کہ زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے بھی گریز نہیں کیا[2]۔ اگر موصوف ''رئیس گجرات''[1] تھے تو

خاندانِ اقبال کو اس سے کیا۔ اس سے خاندانِ اقبال کو کون سا اور کیا فائدہ ہوا؟ کیا کہیں ایسا کوئی ذکر ابھی تک آیا ہے کہ کوئی غیر معمولی جہیز انہوں نے اپنی صاحبزادی کو دیا یا کوئی اور فائدہ ان سے حاصل کیا گیا؟ جب اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی' تو انہوں نے یہ کیسے لکھا کہ:

''اس موقع کو خان بہادر نے نہیں بلکہ شیخ نور محمد نے ''زریں موقع'' جانا ہوگا''۔[۲]

''زریں موقع'' چہ معنی دارد؟ اس موقع سے کون سے زریں فوائد خاندانِ اقبال کو حاصل ہوئے؟ پھر دوسری جگہ فرمایا...... ''ڈاکٹر عطا محمد کی جاہ وحشم نے شیخ نور محمد صاحب کو بہت متاثر کیا''۔[۳] کیسی جاہ وحشم؟ اور اگر کچھ تھی بھی تو شیخ نور محمد صاحب کو اس سے کیا فائدہ ہوا؟ ان کے بیٹے کو کیا کوئی مالی یا دوسرا فائدہ ان کے خسر نے پہنچایا؟ کہتے ہیں کہ سچ وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ چنانچہ اسی کے مصداق یہ ''بقراط'' خود مانتے ہیں:

''حق مہر دو ہزار روپے مقرر کیا گیا جس میں سے ایک ہزار اسی وقت ادا کیا گیا جب کہ ایک ہزار موجل قرار پایا۔ اس دور کے لحاظ سے حق مہر کی رقم خاصی خطیر تھی''۔[۴]

حیرت ہے کہ ایک طرف تو خاندانِ اقبال کو ایک غریب اور نادار خاندان ثابت کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف خود ہی یہ اعتراف بھی فرمایا جا رہا ہے کہ ''حق مہر کی رقم خاصی خطیر تھی''۔ ان کی عقلِ نارسا پر ماتم کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے...... واقعتاً اس دور کے حساب سے دو ہزار کا حق مہر کوئی معمولی بات نہیں تھی اور پھر ایک ہزار اسی وقت ادا بھی کر دیا گیا...... آخر کیسے؟ ایک نادار اور غریب خاندان کے لیے یہ کیسے ممکن ہوا؟

میرے خیال میں اس پر کسی طویل تبصرے کی شاید ضرورت نہ پڑے۔ صرف اتنا تجزیہ کافی رہے گا کہ جس خاندان کو ''غریب گھرانہ''[۵] کہا جا رہا ہے' وہ تو حقِ مہر میں خطیر رقم باندھتا ہے اور امیر وکبیر خاندان جس کی امارت اور محل نما کوٹھی[۶] اور پتہ نہیں کس کس چیز کے متعلق لاف زنی فرمائی جا رہی ہے' کی کل جائیداد جس میں وہ محل نما کوٹھی بھی شامل تھی' کی قیمت صرف چودہ ہزار (۱۴۰۰۰)[۷] روپے لگتی ہے...... حیرت ہے' کیا اس کو امارت کہتے ہیں؟

اس کے علاوہ حضرت علامہؒ کی بارات کی روانگی کا ذکر فرماتے ہوئے انہوں نے خود ہی ایسا سماں باندھا ہے کہ حیرت

ہوتی ہے کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انہیں خاندانِ اقبال ایک غریب گھرانہ ہی نظر آ رہا ہے۔

''بارات گجرات روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ بارات میں کوئی ساٹھ ستر افراد شامل ہیں''۔[۱]

اس دور میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں بارات لے جانا ہی بڑا مشکل ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اتنی بڑی بارات ...... ساٹھ ستر افراد کو سیالکوٹ سے گجرات لے کر جانا' یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ آخر ایک غریب گھرانے نے کیسے اس کا انتظام کیا۔ پھر انہی کے فرمانے کے مطابق:

''پسرور کی مشہور کنچنی پیر اندتی کو بھی ساتھ لے کر گئے''۔[۲]

کیا محترمہ پیر اندتی خیر سگالی کے طور پر بارات کے ہمراہ چلی گئی ہوگی؟ آخر سیالکوٹ کے اس غریب گھرانے کے ہاتھ یہ قارون کا خزانہ کہاں سے آ گیا کہ وہ اس طرح اسے لٹا رہا تھا؟

اس کے علاوہ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ صاحب نے علامہ علیہ الرحمۃ کی اس شادی سے پہلے کے کچھ حالات پر بھی اظہار خیال فرمایا ہے۔ مثلاً ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کا مندرجہ ذیل اقتباس ان کو بڑا ''مضحکہ خیز'' محسوس ہوا ہے۔

''وہ امتحان دینے گجرات گئے ہوئے تھے کہ وہاں کے سول سرجن خان بہادر عطا محمد صاحب نے انہیں دیکھا اور پسند فرمایا اور اپنی صاحبزادی کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کیا۔ چنانچہ اس وقت کے رواج کے مطابق والدین نے شادی طے کر دی''۔[۳]

بلکہ اس بات کا بڑا دکھ بھی ہوا کہ ''گجرات'' کے ایک ''خطاب یافتہ'' سرجن کو جو عزت و امارت کے اعتبار سے اس وقت عروج پر تھے' اس قدر ''بے بس'' کیوں دکھایا گیا کہ بے چاروں کو خود ہی سلسلہ جنبانی شروع کرنا پڑا۔[۴]

گجرات کے یہ بقراط اس بات پر بھی سیخ پا ہوئے ہیں کہ آخر کیوں گجرات کے ایک اعلیٰ اور ارفع خاندان کی اس طرح بے قدری کی گئی جب کہ سیالکوٹ کا خاندان مقابلے میں مالی حالت اور سماجی حیثیت میں بالکل بے وقعت تھا۔[۵]

اگر یہ سب کچھ درست تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ''خان بہادر صاحب'' نے کیوں ایک انتہائی معمولی حیثیت کے خاندان میں اپنی شہزادیوں جیسی نازونعم! میں پلی صاحبزادی کا رشتہ طے کیا' جب کہ لڑکا اس وقت نویں یا

دسویں جماعت کا طالب علم تھا؟ سوچنے کی بات ہے کہ آخر کیا مجبوری تھی ..... کیا واقعی لڑکی کی عمر ڈھل [2] نہیں رہی تھی؟ اس زمانے میں جب چھوٹی عمر کی شادیوں کا رواج تھا' کیا ان کی صاحبزادی کافی بڑی نہیں تھی *؟ آخر کچھ تو ہو گا کہ اتنے "امیر و کبیر" خاندان کی بیٹی کو رشتہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر کیوں خان بہادر صاحب نے اپنی اتنی اچھی بیٹی کو اس طرح بلاسوچے سمجھے ایک نویں جماعت کے معصوم کے پلے باندھ دیا؟ ڈاکٹر سلیم خود فرما رہے ہیں کہ:

"خان بہادر کی باقی چار بیٹیاں جن خاندانوں میں بیاہی گئیں' وہ سب اقبال کے خاندان سے مالی لحاظ سے مستحکم تھے"۔ [3]

تو پھر آخر کیوں بے چاری بڑی صاحبزادی کو ہی غریبوں کے حوالے کیا؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے!

مندرجہ بالا حقائق کے بعد یہاں صرف اس قدر وضاحت کر دینا کافی ہو گا کہ خاندانِ اقبال کی طرف سے اب تک شائع ہونے والی کتابوں' جن میں سب سے پہلے "اقبال درونِ خانہ" پھر "زندہ رود" اس کے بعد ڈاکٹر نظیر صوفی صاحب کی "حیات و پیامِ علامہ اقبال" اور سب سے آخر میں شیخ اعجاز احمد صاحب کی "مظلوم اقبال" ان سب میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی گئی جو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی گجرات والی سسرال کے خلاف جاتی ہو۔ حالانکہ علامہ اقبال صاحب کی پہلی شادی کے بارے میں ایسے حقائق موجود تھے جنہیں منظر عام پر لا کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا جا سکتا تھا ..... مگر نہیں' ایسا سوچا بھی نہیں گیا۔ بزرگوں کے توسط سے جو معلومات میرے پاس موجود ہیں' انہیں نہ تو "اقبال درونِ خانہ" (حصہ اول) میں شامل کرنا مناسب خیال کیا اور نہ ہی زیرِ نظر کتاب یعنی "اقبال درونِ خانہ" (حصہ دوم) میں شائع کر سکوں گا کیونکہ میرا ضمیر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنے خاندان کی بہو کے بارے میں وہ سب کچھ لکھ دوں' جو علامہ صاحب کی اہلی زندگی کے اس تاریک پہلو کو منظر عام پر لے آئے جو اصل میں ان کی پہلی شادی کی ناکامی کا حقیقی باعث بنا۔ کیونکہ گھر کی بہو جو خاندان کی عزت ہوا کرتی ہے' پر حرف زنی خود اپنے خاندان کو بدنام کرنے کے مترادف ہو گا۔ صرف اسی وجہ سے ہم میں سے کسی نے اب تک کوئی ایسی بات کسی کتاب میں شامل نہیں کی ..... "اقبال درونِ خانہ" میں تو اس کا معمولی سا بھی ذکر نہیں کہ آخر کیوں خان بہادر اور سول سرجن صاحب نے اپنی اس "عظیم حیثیت [1]" سے اس قدر نیچے اتر کر ایک غریب گھرانے میں اپنی نازونعم کی پلی اور

بہترین تربیت سے "مزّیّن صاحبزادی[2] " بیاہ دی جب کہ لڑکا (علامہ صاحب) ابھی صرف ہائی سکول میں پڑھ رہا تھا اور بے چارے کا باپ ٹوپیاں سی کر پورے خاندان کی کفالت کرتا تھا۔ جاوید ماموں نے بھی "زندہ رود" میں اس موضوع سے ہر ممکن طریق سے پہلوتہی مناسب سمجھی۔ میرے والدِ مرحوم جناب ڈاکٹر نظیر احمد صوفی نے بھی "حیات و پیامِ اقبال" میں صرف اشارتاً اس کا ذکر فرمایا اور شیخ اعجاز صاحب نے تو "مظلوم اقبال" میں یہاں تک احتیاط برتی کہ علامہ صاحب کے خطوط میں سے وہ حصے تک حذف فرما دیئے جن میں انہوں نے اپنی "اہلی زندگی" کے متعلق معمولی سا ذکر بھی کیا ہوا تھا۔

"اقبال درونِ خانہ" میں جناب ڈاکٹر منیر احمد سلیچ کو جو باتیں "مضحکہ خیز"[3] نظر آئیں ان کی وجہ بھی یہی احتیاط تھی کہ اس کا ذکر جس قدر ممکن ہو، اختصار سے کیا جائے تاکہ اس سلسلے میں کوئی ایسی تفصیل منظرِ عام پر نہ آنے پائے جو کسی کے لیے بھی باعثِ شرمندگی یا پشیمانی ہو۔ کیونکہ کسی کا دل دکھانے سے شاید بڑا گناہ کوئی دوسرا نہیں۔ مگر کچھ احباب شاید دوسروں کے اشاروں پر خواہ مخواہ اقبال کی کھال کھینچنے کے درپے ہیں اور عجیب و غریب توجیہات کا سہارا لے کر صورتِ حال کو الجھانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اب جب کہ "اقبال درونِ خانہ" کا حصہ دوم زیرِ ترتیب ہے تو خیال تھا کہ اس سلسلے میں تمام "رازہائے درونِ خانہ" طشت از بام کر دیئے جائیں مگر ابھی تک خود کو اس کے لیے تیار نہیں کر پا رہا ہوں اور شاید میرا ضمیر اس کی اجازت نہ دے کیونکہ میں اس فرق کو برقرار رکھنا چاہوں گا جو ابھی تک میرے خاندان اور "دوسروں" کے درمیان پایا جاتا ہے کیونکہ ہماری تربیت انہی خطوط پر کی گئی ہے۔

آخر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیچ صاحب کی تھوڑی سی اصلاح ضرور کرنا چاہوں گا تاکہ وہ آئندہ محتاط رہیں اور ہر کسی کی پگڑی اچھالنا اپنا وطیرہ نہ بنائیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ "خان بہادر صاحب" سے بے حد متاثر ہیں اور انہیں پوری کائنات ان کے سامنے ہیچ نظر آ رہی ہے مگر ان کا کیا خیال ہے کہ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد صاحب (مرحوم) پہلے اور آخری خطاب یافتہ انسان تھے۔ اگر گجرات میں صرف ایک خطاب یافتہ شخصیت پیدا ہو گئی تو وہ کیا چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے...... اب انہیں کون سمجھائے کہ فرنگی حکمرانوں کے یہ خطابات کیا حیثیت رکھتے تھے اور ان کا کیا مطلب ہوا کرتا تھا۔ خاص طور پر "خان صاحب" اور "خان بہادر" قسم کے خطابات کن کو عطا کیے جایا کرتے تھے اور فرنگی حکمران کیا فوائد اس سے حاصل کیا کرتا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ڈاکٹر عطا محمد مرحوم یقیناً اس قسم کے

لوگوں میں شامل نہیں تھے مگر آپ کا طرزِ عمل ان کے نیک اعمال کو ضائع کر دے گا۔ خدارا اگر آپ کو اپنی عاقبت کی کوئی فکر نہیں ہے تو کم از کم اس شریف اور نیک انسان کا ہی کچھ خیال فرمالیں اور اس خدا کے بندے کی عاقبت کو اس طرح داؤ پر نہ لگائیں...... مجھے یہ سب کچھ لکھنا اچھا تو نہیں محسوس ہو رہا مگر اس کی ضرورت اس لیے ناگزیر ہوگئی کہ آپ نے اپنی متذکرہ کتاب ''اقبال اور گجرات'' میں متعدد بار ایسا طرزِ تحریر اپنایا ہے کہ جو مندرجہ بالا زمرے میں آتا ہے۔
یہاں صرف ایک اقتباس محض نمونے کے طور پر پیش کرنا چاہوں گا تاکہ سند رہے۔ باقی آپ ''عاقل و بالغ'' ہیں یقیناً اپنی اصلاح خود کرنا جانتے ہوں گے۔

ذرا غور فرمائیے' آپ نے ایک بزرگ کے متعلق کس قدر ''حقارت آمیز'' طرزِ تحریر اپنایا ہے:
''(تیسری بات یہ کہ) ایک خطاب یافتہ سول سرجن' مصروف بھی ہو' ایک سکول ماسٹر کے پاس کیا لینے جائے گا؟ (یاد رہے کہ اس وقت تک مولوی میر حسن ایک اچھے سکول ماسٹر سے زیادہ کوئی مقام نہ رکھتے تھے)''!

یہاں اس سے بحث نہیں کہ اس وقت سید میر حسن صاحب (مرحوم و مغفور) کا کیا مقام تھا اور بعد میں وہ کس مقام پر پہنچے' بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ آپ نے جس طرح ایک قابلِ احترام بزرگ کا ذکر ''فرمایا'' کیا وہ کسی طور قابلِ تعریف ہے؟ آج کی نوجوان[2] نسل کا المیہ یہی ہے کہ انہیں بزرگوں کی عزت کرنے کا سلیقہ کسی نے نہیں سکھایا...... یا پھر زیادہ

درست یہ ہے کہ یہ اس قسم کی سلیقہ مندی سیکھنا ہی نہیں چاہتے کیونکہ یہ شاید خود کو عقلِ کل سمجھتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ کے ممدوح سول سرجن صاحب نے جو اتنی ترقی فرمائی اور حکومت کی طرف سے انہیں خطاب سے نوازا گیا تو وہ یقیناً اس لیے ممکن ہو سکا کہ انہیں کسی اچھے ''ماسٹر'' نے بہتر تربیت دی۔ ان کو اچھی طرح پڑھایا لکھایا اور حیوانِ ناطق سے ایک اچھا انسان بننے میں مدد و معاون ہو' وگرنہ شاید خان بہادر صاحب کی کوئی پہچان بھی نہ ہوتی۔ اور آپ یہاں ایک استاد[1] (ماسٹر) اور سب سے بڑھ کر ایک بزرگ کو ایک ''خطاب یافتہ'' کے مقابلے میں جس طرح ذلیل

کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں' اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ خدا آپ کو عقلِ سلیم سے نوازے اور آئندہ تحریروں میں ''پگڑی اچھالنے'' کے فن سے محفوظ رکھے۔
یہاں ریکارڈ کی درستگی کے لیے ایک غلط بیانی کی اصلاح بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ علامہ صاحب کے نکاح کے

گواہوں کا تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا گیا:

''دیگر گواہوں میں حکیم کرم دین ولد عبد الغفار ساکن وزیر آباد (اقبال کی بڑی بہن کے خسر)''[۲]

حکیم کرم دین صاحب وائیں ولد عبد الغفار صاحب وائیں ساکن وزیر آباد حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی بڑی ہمشیرہ کے نہیں' بلکہ سب سے چھوٹی بہن محترمہ زینب بی بی خلد آشیانی کے خسر تھے۔

آخر میں ''جناب ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ صاحب'' سے ایک بار پھر گزارش کروں گا کہ.....دوسروں پر بہتان تراشیوں سے پیشتر عقلمند اپنے چاک گریبانوں کو ضرور دیکھ لیا کرتے ہیں۔

اتنا نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

(شیفتہ)

بیگماتِ اقبال کا انتقال

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی وہ دونوں بیگمات جن سے انہوں نے اپنی پسند کی شادی کی' ان کی حیات میں ہی راہیٔ ملک عدم ہوئیں اور انہوں نے دونوں کے لیے خود مادہ ہائے تاریخ نکالے اور لوحاتِ مزار تیار کروا کر ان کی قبور پر نصب کروائے' یہاں تک کہ ان میں سے ایک یعنی محترمہ مختار بیگم خلد آشیانی کا تو جنازہ تک خود پڑھایا' مگر سب سے بڑی بیگم جن سے ان کی شادی کم عمری میں ہوئی یعنی محترمہ کریم بی بی مرحومہ (والدہ آفتاب)' ان کی وفات کے تقریباً نو برس بعد تک حیات رہیں۔

وہ دو بیگمات جو علامہ صاحب کی حیات میں داغِ مفارقت دے گئیں' ان میں سے محترمہ مختار بیگم مرحومہ جن کا تعلق لدھیانہ کے مشہور ''نولکھا خاندان'' سے تھا' ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء بمطابق ۱۳۴۳ھ کو لدھیانہ میں وفات پا گئیں۔ ان کی نمازِ جنازہ حضرت علامہؒ نے بنفسِ نفیس پڑھائی۔

اس سلسلے میں علامہ صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ محترمہ کریم بی بی مرحومہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مندرجہ ذیل تحریر! ان کے کاغذات سے دستیاب ہوئی ہے:

''حضرت علامہ اقبال کی لدھیانہ والی بیگم کا انتقال ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء بمطابق ۱۳۴۳ھ کو لدھیانہ میں ہوا۔ اقبال نے جنازے کی نماز خود پڑھائی اور ذیل کا قطعہ تاریخ ارشاد فرمایا' جو لدھیانہ کے قبرستان میں مرحومہ کی لوح مزار پر کندہ ہے ؎

اے دریغا زمرگِ ہم سفرے
دل من در فراق او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخنِ پاکِ مصطفےٰ آورد

بہرِ سال رحیلِ او فرمود

"شہادت رسید و منزل کرد"

۱۳۴۳ھ

اس سلسلے میں توجہ طلب حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے تاریخ ہائے وفات یعنی "سرودِ رفتہ" مرتبہ غلام رسول مہر میں ۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء[۱] اور "روزگارِ فقیر" (جلد دوم) میں ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء[۲] درج ہیں۔ مگر مندرجہ بالا تحریر میں بالکل مختلف تاریخ یعنی ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۴ء محفوظ کی گئی ہے۔ "روزگارِ فقیر"[۳] (جلد دوم) کے مصنف کے خیال میں کتابت کے وقت "۲۱" کا "۱" لکھنے سے رہ گیا یا سنگسازی اور طباعت کے مرحلوں میں یہ عدد شاید اڑ گیا۔ لیکن حقیقت میں یہاں اسی عام غلطی کا اعادہ کیا گیا ہے کہ ۱۲ اکتوبر لکھتے وقت "۱۲" اور "اکتوبر" کا عدد "ا" اور حرف "ا" آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں اور ہمیشہ ہی کی طرح دو "ا" کی بجائے صرف ایک "ا" لکھا گیا اور اس طرح ۱۱۲ اکتوبر صرف ۲ اکتوبر رہ گیا۔ اس لیے "۲۱" یا "۲" کی بجائے "۱۲" کا عدد زیادہ درست معلوم ہو رہا ہے۔

۲۳ مئی ۱۹۳۵ء بمطابق ۱۳۵۴ھ کو شام پانچ بجے محترمہ سردار بیگم خلدآشیانی (والدۂ جاوید) بھی اس دارِ فانی سے کوچ فرما گئیں۔ اس سلسلے میں بھی علامہ صاحب کی چھوٹی ہمشیرہ کریم بی بی (مرحومہ و مغفورہ) کی یادداشتوں کی نوٹ بک میں مندرجہ ذیل تحریر[۴] دستیاب ہوئی ہے:

"دوسری بیگم یعنی والدۂ جاوید کا انتقال ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء بمطابق ۱۳۵۴ھ کو شام ساڑھے ۵ بجے ہوا اور اسی رات انہیں بی بیاں پاک دامناں، ایمپرس روڈ، لاہور کے مشہور قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ جہاں ایک بلند ٹیلے پر ان کی پختہ قبر موجود ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل قطعہ نصب ہے ؎

راہی سوئے فردوس ہوئی مادرِ جاوید

لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پر داغ

ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار

اقبال نے تاریخ کہی "سرمہ ٔ مازاغ"

۱۳۵۴ھ

اس طرح حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی دوسری اور تیسری بیگم ان کی حیات میں ہی انتقال فرما گئیں' البتہ ان کی پہلی بیگم ان کی وفات کے بعد تقریباً نو برس تک زندہ رہیں اور ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ۷۴ [۵] برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئیں اور لاہور کے معراج دین قبرستان [۶] میں سپردِ خاک کی گئیں۔

یہاں والدہ آفتاب کی تاریخ وفات اور عمر کے سلسلے میں تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔ ان کی قبر کا کتبہ جس کی تصویر "علامہ اقبال اور ان کے فرزندِ اکبر" نامی کتاب کے صفحہ ۷۹ پر دی گئی ہے' پر تاریخ وفات ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء اور عمر ۷۴ برس لکھی گئی ہے۔ اگر اس کو درست مانا جائے تو ان کی پیدائش ۱۸۷۳ء میں جا نکلتی ہے جو اس لیے درست نہیں کہ گجرات میونسپل کمیٹی ریکارڈ کے مطابق وہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء [۱] کو پیدا ہوئیں۔ چنانچہ میونسپل ریکارڈ کے مطابق ان کی ولادت اور ان کی قبر پر نصب کتبہ پر کندہ تاریخ وفات کے حساب سے انہوں نے ۷۲ برس ۱۱ ماہ اور ۶ دن کی عمر میں وفات پائی۔

عروسِ خاندانِ اقبال

کچھ خاندانوں میں ''فرسٹ کزن میرجز'' کا بہت رواج پایا جاتا ہے۔ مگر خاندانِ اقبال میں شروع شروع میں اس قسم کی شادیاں بہت کم ہوئیں۔ ہاں البتہ بعد میں ایسی شادیاں بھی ہوئیں' خاص طور پر خالہ اکبری مرحومہ کے بچوں میں اس کا بہت زیادہ رواج ہوا اور انہوں نے بے شمار شادیاں آپس میں ہی کیں۔ مخصوص حالات میں چند ایک ایسی شادیاں دوسرے گھروں میں بھی ہوئیں مگر ان کی تعداد کافی محدود رہی۔ یہاں خاندانِ اقبال میں ہونے والی چند ایسی شادیوں کا ذکر دلچسپی کا باعث رہے گا' جن میں سے بعض تو ''تجدیدِ تعلق'' کا حکم رکھتی ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے جو شادی خاندان کے دو افراد میں ہوئی وہ خالہ اکبری مرحومہ کی تھی۔ جنہیں ان کی پھوپھی محترمہ فاطمہ بی بی کے بڑے صاجبزادے محترم فضل الٰہی کے ساتھ منسلک کیا گیا۔ اس کو ''فرسٹ کزن میرج'' کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ دوسری شادی میرے والدین کی تھی جس میں محترمہ وسیمہ مبارک مرحومہ و مغفورہ کو ان کی پھوپھی طالع بی بی خلد آشیانی کے پوتے جناب نظیر احمد صوفی مرحوم و مغفور کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کیا گیا۔

۳۔ تیسری شادی پھوپھی کریم بی بی مرحومہ کے چھوٹے صاجبزادے محمد سرور مرحوم کی زبیدہ بیگم سے ہوئی۔ زبیدہ بیگم' شیخ غلام محمد مرحوم (علامہ صاحب کے حقیقی چچا) کی نواسی مہراں بی بی مرحومہ کی نواسی ہیں۔ ان کی والدہ کا نام فاطمہ بی بی ہے۔

۴۔ اسی طرح چوتھی شادی راقم الحروف کی خالدہ بیگم سے انجام پائی۔ خالدہ بیگم بھی مرحومہ مہراں بی بی کی نواسی ہیں' البتہ ان کی والدہ محترمہ رضیہ بیگم مرحومہ تھیں۔

۵۔ پانچویں شادی آپا بانو (محترمہ منیرہ صلاح الدین۔ علامہ صاحب کی صاجبزادی) کے سب سے چھوٹے صاجبزادے اقبال صلاح الدین کی ہوئی' جو شیخ اعجاز احمد صاحب کی نواسی رابعہ ظفر کے ساتھ ہوئی۔ یہ اعجاز صاحب کی بڑی بیٹی عاصمہ ظفر کی صاجبزادی ہیں۔

۶۔ اسی طرح مختار ماموں کی پوتی اور زوار احمد کی بیٹی کی شادی خالہ عنایت صاحبہ کے نواسے یعنی عذرا بیگم کے بیٹے سے ہوئی۔

۷۔ محترمہ طالع بی بی مرحومہ کی پوتی نذیر بیگم کی شادی ان کی بڑی بہن محترمہ فاطمہ بی بی کے پوتے عبدالمجید کے ساتھ ہوئی۔ یہ فاطمہ بی بی کے چھوٹے بیٹے فضل الحق کے فرزند تھے۔

۸۔ مرحومہ مہراں بی بی کی نواسی یعنی محترمہ رضیہ بیگم مرحومہ کی بڑی صاحبزادی سلیمہ بیگم نے اپنی بڑی بیٹی لبنیٰ بیگم مرحومہ کی شادی اپنی خالہ اصغری بیگم مرحومہ کے سب سے چھوٹے بیٹے عابد منظور سے کی۔

یہ شادیاں ایسی تھیں جو دو مختلف گھرانوں میں طے پائیں مگر اس کے بعد جتنی بھی شادیاں میرے علم میں آئی ہیں، تقریباً سب کی سب خالہ اکبری مرحومہ کی اولاد میں ہی ہوئیں، جن میں کافی سے زیادہ "فرسٹ کزن میرج" کے زمرے میں آتی ہیں۔

۹۔ ان میں اکبری بیگم کی صاحبزادی زبیدہ بیگم کی بیٹی نازلی بیگم، اکبری بیگم کی بڑی بیٹی صغریٰ بیگم کے چھوٹے بیٹے زبیر احمد سے بیاہی گئی۔

۱۰۔ پھر اکبری بیگم کی بیٹی صغریٰ بیگم کے منجھلے بیٹے فاروق احمد کی شادی اکبری بیگم کی بیٹی زہرہ بیگم کی چھوٹی بیٹی عذرا بیگم سے ہوئی۔

۱۱۔ اسی طرح صغریٰ بیگم کے بڑے بیٹے محمد احمد کی شادی زہرہ بیگم کی بڑی بیٹی طاہرہ بیگم سے ہوئی۔

۱۲۔ پھر صغریٰ بیگم کی بیٹی طاہرہ بیگم زہرہ بیگم کے بیٹے آصف احمد سے بیاہی گئی۔

۱۳۔ زہرہ بیگم کا بیٹا جمیل احمد حمیدہ بیگم کی بیٹی نسیم بیگم سے منسلک ہوا۔

۱۴۔ اسی طرح اکبری بیگم کے منجھلے صاحبزادے عبدالوحید نے اپنے بیٹے کی شادی عذرا بیگم جو زہرہ بیگم کی بیٹی تھی، کی صاحبزادی سے کر دی۔

۱۵۔ اسی طرح زبیدہ بیگم کی بیٹی ناز بیگم جو صغریٰ بیگم کے بیٹے سے بیاہی گئی تھی، کی صاحبزادی مومنہ کی شادی صغریٰ بیگم کی بیٹی طاہرہ کے بیٹے سے ہوئی۔

۱۶۔ اسی طرح پھوپھی کریم بی بی کے پوتے یعنی محمد سرور کے بڑے بیٹے ندیم سرور کی شادی اس کی خالہ اختر بیگم کی

بیٹی سے ہوئی۔

۱۷۔ اسی طرح زہرہ بیگم کی بڑی بیٹی طاہرہ کے بیٹے کی شادی اکبری بیگم کی بیٹی حمیدہ کی بیٹی نسیم جو زہرہ بیگم کی بہو تھی ' کی بیٹی نوشین سے ہوئی۔

مندرجہ بالا چند شادیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں 'ویسے خدا جانے انہوں نے اب تک کتنی ہی ایسی شادیاں کی ہیں۔

۱۸۔ آخر میں ایک ایسی شادی کا تذکرہ بھی شاید دلچسپی کا باعث ہو جو خاندان کے دو افراد میں تو نہیں ہوئی مگر یہاں اس کا اندراج اس لیے ضروری ہے کہ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علامہ صاحب کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کی تینوں صاحبزادیاں اپنی پھوپھیوں کے گھرانوں میں بیاہ کر گئیں۔

(الف) پہلے سب سے بڑی صاحبزادی محترمہ اکبری بیگم مرحومہ کی شادی اپنی پھوپھی محترمہ فاطمہ بی بی مرحومہ کے بڑے صاحبزادے محترم فضل الٰہی مرحوم سے انجام پائی۔

(ب) دوسرے سب سے چھوٹی صاحبزادی محترمہ وسیمہ مبارک مرحومہ ومغفورہ کی شادی اپنی پھوپھی محترمہ طالع بی بی خلد آشیانی کے پوتے اور شیخ خورشید احمد کے فرزندِ اکبر محترم نظیر احمد صوفی مرحوم سے ہوئی۔

(ج) تیسرے منجھلی صاحبزادی محترمہ عنایت بیگم صاحبہ کی شادی اپنی پھوپھی محترمہ زینب بی بی مرحومہ کے منہ بولے بیٹے جناب غلام محی الدین مرحوم سے ہوئی۔ حقیقتاً محترمہ زینب بی بی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی مگر انہوں نے اپنے میاں شیخ غلام رسول کی دوسری بیوی سے ایک بیٹے کو منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا اور انہی کے ساتھ وہ اپنی بھتیجی عنایت بیگم کو بیاہ کر لے گئیں۔

چنانچہ اس طرح شیخ عطا محمد مرحوم کی تینوں صاحبزادیاں ان کی ہمشیرگان کے خاندانوں میں بیاہ کر گئیں۔

سب سے منفرد اور یادگار شادی

خاندانِ اقبال میں منعقد ہونے والی وہ تمام تقریبات عروسی جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ''عروسِ خاندانِ اقبال'' کے تحت کیا گیا' مختلف اوقات اور ادوار میں بزرگوں کے آشیرباد کے تحت بخیر وخوبی انجام پاتی رہیں۔ یہ تمام تقریباتِ سعید باقی شادیوں سے اس لحاظ سے مختلف اور قابلِ ذکر قرار پائیں کہ ان کی وجہ سے خاندانِ اقبال ہی کے دو افراد ایک دوسرے سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے اور شاید اس طرح خاندان میں وسعتِ فکر ونظر کا موجب بنے۔ خاندان کے اندر ہونے والی ان شادیوں میں متذکرہ بالا قدر تو ضرور مشترک رہی مگر عام طور پر یہ تمام شادیاں کسی ایسی منفرد حیثیت کی حامل قرار نہ دی جاسکیں کہ ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کیا جاتا۔ یہ تمام شادیاں بھی تقریباً ویسی ہی تھیں جیسی کہ عام طور پر ایسی تقریبات ہوا کرتی ہیں مگر ان تمام میں سے صرف ایک شادی ایسی ضرور تھی جس کا تذکرہ ہمیشہ ہی بڑی خصوصیت اور پوری تفصیلات کے ساتھ خاندان کے اندر ہی نہیں' بلکہ خاندان سے باہر بھی ہوتا آیا ہے۔

متذکرہ بالا تقریب سعید کے دولہا اور دلہن کے نام جان کر آپ کے اذہان میں یہ خیال یقیناً ابھر سکتا ہے کہ اس کا تفصیلی تذکرہ صرف اس لیے کیا جارہا ہے اور اس کو محض اس لیے خصوصی اہمیت دی جارہی ہے اور شاید باقی تمام تقریبات کو عام سی شادیوں سے تعبیر کر کے خواہ مخواہ سب کچھ بڑھا چڑھا کر ضبطِ تحریر میں لایا جارہا ہے کیونکہ یہ شادی میرے اپنے والدین کی شادی تھی ......مگر امیدِ واثق ہے کہ جب آپ اس تقریب کے مکمل حالات وواقعات ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ بھی اس سے متفق ہوجائیں گے کہ واقعتاً اس میں کسی قسم کی کوئی مبالغہ آرائی نہیں کی گئی۔ آج بھی چند ایک ایسے احباب اور بزرگ حیات ہیں جنہوں نے ۱۹۳۴ء میں منعقد ہونے والی اس تقریب سعید میں شمولیت فرمائی اور تمام واقعات بقائمی ہوش وحواس ملاحظہ فرمائے۔ ان میں خاص طور پر میری خالہ عنایت بیگم صاحبہ (آپ میری والدہ سے تقریباً چار برس بڑی ہیں) جو آج بھی بعمر ۹۳ برس بقیدِ حیات ہیں۔ میرے چچا جان ڈاکٹر نصیر احمد صاحب جن کی پیدائش ۱۹۲۰ء کی ہے اور وہ اپنے بڑے بھائی کے شہہ بالا بنے۔ ان کے علاوہ خاندان میں چند مزید افراد بھی بقید

حیات ہیں جو کو اس وقت کم عمر تھے مگر کافی باتیں انہیں یاد ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال منزل کے اڑوس پڑوس میں بھی ابھی چند ایک لوگ بقید حیات ہوں گے جو اس کے عینی شاہدین میں شامل ہوں گے۔

اگر اس شادی کی تفصیلات بیان کرنے سے پیشتر تھوڑا سا پس منظر اس سلسلے میں بیان کر دیا جائے تو واقعات کو سمجھنے میں خاصا ممد ومعاون ثابت ہو سکتا ہے۔ میرے پر دادا شیخ غلام محمد جنہوں نے کشمیر سے سیالکوٹ وارد ہو کر سب سے پہلے میاں جی (والدِ اقبال) کے پاس قیام کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی اور کام سیکھنے کے بعد وہیں میاں جی کی دکان پر ٹوپیاں سینے کا کام کرنے لگے۔ میاں جی شیخ نور محمد مرحوم نے اپنی صاحبزادی محترمہ طالع بی بی جو ان کی تیسری اولاد تھیں اور حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے تقریباً تین برس[1] بڑی تھیں، کا عقد انہی شیخ غلام محمد مرحوم سے تقریباً ۱۸۸۵ء میں کر دیا۔ صرف ۱۷ برس ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد عین عالمِ شباب میں صرف ۳۲ برس کی عمر میں چار چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر یہ ۱۹۰۲ء[2] میں راہی ملک عدم ہوئیں۔ ان کے چاروں بیٹے شیخ نور احمد، شیخ خورشید احمد، شیخ ظہور احمد اور شیخ منظور احمد بالکل کم سن تھے۔ سب سے بڑا بھائی بمشکل بارہ تیرہ برس کا تھا۔ شیخ غلام محمد مرحوم کے لیے چار چھوٹے بچوں کی پرورش بے حد مشکل ہو گئی۔ چنانچہ ساس اور سسر کی اجازت سے انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ میاں جی اور بے جی یعنی والد اور والدۂ اقبال ان کی دوسری بیوی کو بالکل اپنی بیٹی کا مقام دیا کرتے تھے اور شیخ غلام محمد صاحب اسی طرح خاندانِ اقبال کے ایک فرد تھے، جس طرح میری پردادی محترمہ طالع بی بی خلد آشیانی کی حیات میں ہوا کرتے تھے۔ اس لیے میاں جی نے جب اپنے ٹوپیوں کے کاروبار کو خیرباد کہا تو اس کو اپنے اسی داماد کے سپرد کر دیا۔

پر دادا جان (شیخ غلام محمد مرحوم) نے بڑی محنت کر کے چاروں بیٹوں کو پالا پوسا خدا خدا کر کے چاروں جوان ہو گئے تو انہیں قدرے سکھ کا سانس آیا۔ بڑے صاحبزادے نور احمد صاحب اپنی پسند کی دلہن لے آئے۔ دوسرے بیٹے شیخ خورشید احمد صاحب کی شادی والد نے اپنی برادری میں طے کی۔ میری دادی جان محترمہ مہتاب بی بی[3] حکیم پروفیسر جمشید علی صاحب کے بڑے بھائی کی صاحبزادی تھیں۔ ان دنوں میرے دادا جان شیخ خورشید احمد صاحب زیادہ سے زیادہ بیس برس کے رہے ہوں گے۔ یہ شادی تقریباً ۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں ان کے ہاں پہلا بچہ تولد ہوا جس کا

نام نظیر احمد رکھا گیا۔ ان دنوں تک یہ لوگ اپنے آبائی گھر جو کوچہ حسام الدین میں ہے ہی میں قیام پذیر تھے۔ شادی کے تقریباً پانچ برس بعد خورشید احمد اور مہتاب بی بی جو نام کے لحاظ سے تو سورج چاند کی جوڑی تھے ہی' مگر اب قسمت کے لحاظ سے بھی ایک انتہائی درخشاں اور تاباں مستقبل کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ مختلف مقامات پر چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے کرتے تقریباً ۱۹۱۵ء میں شیخ خورشید احمد صاحب نے اپنی بیگم مہتاب بی بی کے صائب مشورہ پر صاد کہتے ہوئے اپنا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا۔ محترمہ مہتاب بی بی خلد آشیانی بڑی سمجھدار اور سگھڑ خاتون تھیں۔ اس تنگی ترشی کے دور میں بھی انہوں نے کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیا تھا اور وہی معمولی سی رقم دادا جان کے کاروبار کا اولیں سرمایہ بنی اور بالکل معمولی پیمانے پر سپورٹس کے سامان کا کاروبار شروع کیا گیا۔ سیالکوٹ میں یہ Credit انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے لیگ گارڈ بنانے کی ابتدا کی اور ہاکی اور کرکٹ کے لیگ گارڈز یہاں بنانے کی بنیاد ڈالی۔

میرے والدِ محترم بتایا کرتے تھے کہ جب شروع شروع میں والد صاحب (شیخ خورشید احمد) نے اس کام کی ابتدا کی تو وہ خود مشین پر دن رات لیگ گارڈ کی سلائی کیا کرتے تھے اور ان میں روئی ہماری والدہ اپنے ہاتھوں سے بھرا کرتی تھیں۔ صرف دو آدمیوں کے لیے خاصا مشکل کام تھا مگر دونوں میاں بیوی نے ہمت نہیں ہاری اور بے حد محنت کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دن رات ایک کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محنت رنگ لائی اور گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل شروع ہوگئی۔ تقریباً ۱۹۲۰ء میں شیخ خورشید صاحب نے اپنی کمپنی ''شیخ خورشید احمد اینڈ سنز'' کے نام سے قائم کر لی اور اب صرف سیالکوٹ میں لیگ گارڈز فروخت کرنے کی بجائے ہندوستان کے طول و عرض میں نئے گاہک تلاش کرنے شروع کر دیے۔ چند ہی برسوں میں ان کا نام سارے ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ اب صرف لیگ گارڈز ہی نہیں بلکہ سپورٹس کا ہر قسم کا سامان سپلائی کیا جاتا تھا۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ ان دنوں روزانہ ایک بوری بھر کر خطوط اور کیٹلاگ سپردِ ڈاک کیے جاتے تھے۔ ایک کلرک صرف ایڈریس لکھنے پر مقرر تھا جو پورا دن لفافوں پر پتے لکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ ''شیخ خورشید احمد اینڈ سنز'' کا دفتر مارکیٹ کی سب سے اونچی بلڈنگ جو ان کی اپنی ملکیت تھی اور ''خورشید بلڈنگ'' کہلاتی تھی' میں قائم تھا۔ آج بھی یہ عمارت اپنی جگہ پر قائم ہے گو اب اردگرد بڑی بڑی دوسری عمارات بننے سے اس کی وہ شان تو نہیں رہی' دوسرے امتدادِ زمانہ نے اس کو بالکل بوسیدہ کر دیا ہے مگر پھر بھی اپنے شاندار ماضی کی امین یہ سیالکوٹ شہر کے گرین وڈ سٹریٹ کے چوراستے پر پوری شان سے ایستادہ ہے۔ ان دنوں ہر قسم

کا سپورٹس کا سامان ''شیخ خورشید احمد اینڈ سنز'' کے اپنے کارخانے میں تیار ہوتا تھا اور متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں سپلائی ہوتا تھا۔ اسی دوران ''سن بیم سپورٹس'' کے نام سے ایک برانچ بھی کلکتہ میں قائم کر دی گئی اور شیخ خورشید احمد نے اپنے فرزندِ اکبر شیخ نظیر احمد کو وہاں پر منتظم اعلیٰ مقرر کیا۔

تقسیم ہندوستان سے قبل سیالکوٹ میں تقریباً تمام کاروبار خاص طور پر سپورٹس گڈز کی مارکیٹ ہندوؤں اور سکھوں کے قبضے میں تھی۔ زیادہ تر مسلمان جو بے چارے اس کام سے وابستہ تھے' محنت مزدوری کرتے تھے اور روزانہ بڑی قلیل مزدوری ان کو ملتی تھی۔ شاید چند ایک مسلمان ایسے تھے جن کا سپورٹس کے سامان کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا۔ یہ ظلم صرف سیالکوٹ میں ہی نہیں تھا بلکہ تقریباً پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا یہی حال تھا۔ چند ایک پڑھے لکھے یا خاندانی رئیسوں کو چھوڑ کر ہر جگہ مسلمان کی حالت بہت پتلی تھی۔ انگریز حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو اس قدر ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ یہ دراصل ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی سزا کے طور پر تھا۔ مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے یہ دونوں قومیں اس قدر خوفزدہ تھیں کہ ان کی پوری کوشش یہی تھی کہ دوبارہ کبھی بھی مسلمان اس کی جرأت نہ کر سکے۔ اس زمانہ کسمپرسی میں شیخ خورشید احمد صاحب شاید واحد

مسلمان تھے جو سیالکوٹ کی کاروباری برادری میں ہندوؤں کی برابر کی ٹکر کے تھے۔ دوسرے مسلمان بھی یقیناً سیالکوٹ میں دوسرے کاروبار میں یا کسی اور رنگ میں امیر و کبیر ضرور ہوں گے مگر یہاں بات خصوصی طور پر سپورٹس کے سامان کا کاروبار کرنے والوں کے متعلق ہو رہی ہے۔ والد صاحب بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ سیالکوٹ مسلم لیگ والے چندہ لینے کے لیے آئے تو والد صاحب نے اپنی موٹر گاڑی ہی ان کو چندے میں دے دی۔ ان دنوں شاید ہندوؤں میں بھی صرف چند ایک کے پاس موٹر گاڑی ہوتی تھی۔ مگر شیخ خورشید صاحب کے پاس ایک چھوڑ دو دو گاڑیاں تھیں۔ ''شیخ خورشید احمد اینڈ سنز'' کا کاروبار دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا اور شہر میں کئی ایک جائیدادیں خریدی گئیں۔ بازار پنساریاں میں ایک بہت بڑی تین منزلہ حویلی ''خورشید منزل'' کے نام سے کھڑی ہو گئی۔ اس زمانے میں پورے علاقے میں یہ سب سے بلند عمارت تھی۔ ''خورشید منزل'' آج بھی اسی شان سے ایستادہ ہے۔ چند برس قبل مرمت کے دوران اس کی اوپری منزل کے چھت پر بنائی گئی بلند شہ نشین کو اتار لیا گیا ہے کیونکہ مرورِ زمانہ کے باعث اس کا بوجھ چھتوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کو اتار لینا مناسب سمجھا گیا۔ قابلِ ذکر

بات یہ ہے کہ صرف اس شہ نشین' جو صرف سجاوٹ کے طور پر بنائی گئی تھی' میں سے پوری دس ہزار اینٹ برآمد ہوئی۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں' اس وقت سیالکوٹ میں معدودے چند لوگ اور خاص طور پر مسلمان اس پوزیشن میں تھے۔کاروبار میں اس قدر کامیابی اور دولت کی ریل پیل نے یقیناً شیخ خورشید احمد صاحب کو مغرور کر دیا ہوگا۔ یہ شاید فطری امر بھی تھا کہ اس طرح امیر وکبیر بن جانے والا انسان جو خود شبانہ روز محنت کر کے اس مقامِ بلند پر پہنچا ہو' کو خواہ مخواہ کے تفاخر کا شکار ہونے سے کون روک سکتا تھا۔ چنانچہ جن رشتہ داروں اور عزیزوں نے کبھی انہیں درخورِ اعتناء نہ سمجھا تھا اب ان کے برابر بلکہ ان سے بھی امارت میں آگے نکل جانے پر کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور پڑنا ہی چاہئے تھا۔ چنانچہ شیخ خورشید احمد صاحب کے اپنے ننھیال والوں کے ساتھ' جن کے ساتھ پہلے ہی کچھ ان بن تھی' مزید کھچاؤ پیدا ہو جانا لازمی امر تھا۔ چنانچہ میرے دادا جان شیخ خورشید احمد صاحب کے اپنے سگے ماموؤں یعنی شیخ عطا محمد صاحب اور حضرت علامہ اقبالؒ کے ساتھ کچھ ایسے خوشگوار تعلقات ان دنوں نہیں تھے۔ اس کی وجوہات کئی ایک ہو سکتی ہیں' جن میں سے ایک کا ذکر تو حال ہی میں میرے بڑے ماموں شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبالؒ'' میں اس طرح کیا ہے:

''ہمارے پھوپھا غلام محمد (جن کے ساتھ ہماری منجھلی پھوپھی بیاہی ہوئی تھیں) کا ذکر میاں جی کے ذکر میں کیا جا چکا ہے۔ ہماری یہ پھوپھی میرے لڑکپن میں ہی چار بیٹے چھوڑ کر فوت ہو گئی تھیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کو پھوپھا جی نے میڈیکل سکول امرتسر میں داخل کرنا چاہا۔لیکن یہ خیال انہیں اس وقت آیا جب سکول میں داخلہ بند ہو چکا تھا۔ سکول کے پرنسپل میر ہدایت اللہ تھے۔ پھوپھا جی کے کہنے پر میاں جی نے چچا جان کو لکھا کہ وہ لڑکے کے داخلے کے لیے پرنسپل کو لکھیں۔ چچا جان نے جواب دیا کہ سکول میں داخلہ بند ہو جانے کے بعد اب کسی طالبِ علم کا داخل کیا جانا شاید ممکن نہ ہو لیکن تعمیلِ ارشاد میں ڈاکٹر میر ہدایت اللہ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا وہی جواب آیا جس کی توقع تھی۔ اس پر میاں جی کو یہ خط لکھا۔ پھوپھا جی کو عمر بھر یہ شکوہ رہا کہ میرے بیٹے کے داخلے میں مدد نہیں کی۔

قبلہ وکعبہ ام۔السلام علیکم

کئی دن ہوئے ایک خط غلام محمد کے لڑکے کے بارے میں آپ کی خدمت میں لکھا تھا۔ جس کا مفہوم اعجاز کہتا ہے' کہ میں نے اسے سمجھا دیا تھا۔ آج میر ہدایت اللہ صاحب کا جواب آیا ہے۔ جو میرا خیال تھا' صحیح نکلا۔ ڈاکٹر میر ہدایت

اللہ لکھتے ہیں کہ کالج وسکول کا داخلہ بند ہو چکا ہے اب کسی کے اثر ورسوخ سے کوئی لڑکا سکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اطلاعاً عرض ہے۔ اب اس کو یا تو اسلامیہ کالج میں داخل ہو جانا چاہئے یا ایک برس انتظار کرنا ہوگا اگر وہ میڈیکل سکول میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔

محمد اقبال

لاہور ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۹ء [1]

اس کے علاوہ یقیناً کچھ مزید چھوٹی موٹی وجوہات بھی ہوں گی جن کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں اختلافات کی خلیج حائل ہوئی۔ دوسرے چونکہ میری پردادی جان محترمہ طالع بی بی خلد آشیانی [2] ۱۹۰۲ء میں وفات پا چکی تھیں، اس لیے بھی قدرتاً تعلقات میں سرد مہری کا پیدا ہو جانا فطری امر تھا۔ اور پھر دولت کی ریل پیل کی وجہ سے اب شیخ غلام محمد صاحب اور ان کے صاحبزادگان بھی اپنی امارت کے گھرے میں تھے، مگر وہاں شاید اب بھی کوئی انہیں کوئی خاص اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا کیونکہ اپنی جس امارت پر یہ اترا رہے تھے، ننھیال والے اس سے مرعوب ہونے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ کیونکہ ان کا شمار یقیناً اس دور کے نو دولتیوں میں ہوتا ہوگا اور لازماً نو دولتیوں والی تمام ناپسندیدہ حرکات اور اطوار ان میں بھی سرایت کر گئے ہوں گے کہ بے شمار دولت انسان کا رنگ ڈھنگ بدل ہی دیا کرتی ہے۔ ہر سال موسمِ گرما میں شیخ خورشید احمد صاحب مع اہل وعیال اپنی موٹر کار پر کشمیر چلے جاتے اور بڑی ٹھاٹھ سے وہاں سیزن گزار کر واپس آتے تو پورے خاندان کو خواہ مخواہ مرعوب کرنے کی کوشش کی جاتی۔ دروازے پر گائے بھینس بندھی رہتی، اخراجات کی کوئی پرواہ نہ تھی اور شاہ خرچیوں کی خوب چرچا تھی۔

میری دادی جان محترمہ مہتاب بی بی خلد آشیانی بڑے کھلے دل اور سخی ہاتھ والی خاتون تھیں۔ ہر کس وناکس کی مدد پر ہر وقت کمر بستہ رہنا انہیں بہت پسند تھا جس کی وجہ سے ساری برادری اور محلّہ داری میں ان کا کلمہ پڑھا جاتا تھا۔ بڑی ملنسار اور خوفِ خدا رکھنے والی ہستی تھیں۔ انہوں نے پورے خاندان اور برادری سے بڑے اچھے تعلقات قائم کر رکھے تھے اور آہستہ آہستہ شیخ خورشید احمد صاحب کی ننھیال کو بھی رام کر رہی تھیں اور اب وہ لوگ بھی کچھ کچھ ان کے معترف ہونے لگے تھے اور دونوں گھرانوں میں لاتعلقی کی خلیج کسی حد تک کم ہوتی جا رہی تھی۔ ''خورشید منزل'' میں منتقل ہو جانے کے بعد یہ کام اب زیادہ آسان ہو گیا تھا اور انہوں نے اپنی جداگانہ حیثیت میں خاندانِ اقبال سے

تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اپنی ممانی ساس یعنی ''بھابھی جی[۳]'' سے ان کی بڑی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ گھرانے کی باقی مستورات سے بھی ان کے اب خاصے اچھے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اپنی دونوں خالہ ساسوں محترمہ کریم بی بی اور محترمہ زینب بی بی سے خوب دوستی تھی۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ جب بھی سیالکوٹ تشریف لاتے تو میری دادی جان خاص طور پر ''اقبال منزل'' ان سے ملنے کے لیے جاتیں اور اپنی ممانی ساس محترمہ سردار بیگم (والدہ جاوید) سے گھنٹوں ملاقات رہتی۔ موسمِ گرما کی تعطیلات میں جب علامہ علیہ الرحمۃ سیالکوٹ میں طویل قیام فرماتے تو کم از کم ایک بار ضرور ''خورشید منزل'' میں ان کو کھانے کی دعوت دی جاتی جس میں تقریباً ''خاندانِ اقبال'' کے تمام افراد شمولیت کرتے۔ محترمہ مہتاب بی بی یعنی بیگم خورشید احمد کی کوششیں آہستہ آہستہ بارآور ہوتی جارہی تھیں اور شیخ خورشید احمد صاحب کو ننھیال میں اب کچھ کچھ پذیرائی ملنے لگی تھی۔ یہ تمام مراحل طے کر لینے کے بعد اب میری دادی اماں یہ خواہش کرنے لگیں کہ ان تعلقات کو مزید تقویت دینے کے لیے دونوں گھرانوں میں کوئی نئی رشتہ داری بھی ہونی چاہئے۔ ان دنوں شیخ عطا محمد صاحب کی دونوں چھوٹی صاحبزادیوں محترمہ عنایت بیگم اور محترمہ وسیمہ بیگم کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور ان میں سے ایک کا رشتہ اپنے بڑے صاحبزادے شیخ نظیر احمد کے ساتھ کرنے کی ان کی دلی خواہش تھی۔ محترمہ عنایت بیگم تو شیخ نظیر احمد صاحب سے تقریباً پانچ برس بڑی تھیں ہی' یہاں تک کہ وسیمہ بیگم بھی ان سے ایک برس[۱] کے قریب بڑی تھیں۔ جب بھی رشتے کی بات چلائی جاتی تو سب سے پہلے یہی اعتراض خاص طور پر سامنے آتا کہ لڑکا عمر میں چھوٹا ہے' مگر دادی اماں نے بھی ہمت نہ ہاری اور اپنی دھن میں لگی رہیں۔ اسی دوران خالہ عنایت بیگم کی بھی شادی ہو گئی۔ اب صرف سب سے چھوٹی بیٹی یعنی میری والدہ ماجدہ محترمہ وسیمہ مبارک باقی تھیں جو شروع سے ہی لاہور میں اپنے چچا جان (علامہ علیہ الرحمۃ) کے پاس رہ رہی تھیں۔ کیونکہ ۱۹۱۴ء میں جب علامہ صاحب' محترمہ سردار بیگم صاحبہ (والدۂ جاوید) کو رخصت کروا کر سیالکوٹ لائے تو میری والدہ تقریباً دو اڑھائی برس کی تھیں اور سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھر بھر کی لاڈلی تھیں۔ خاص طور پر اپنے چچا جان کی بہت پیاری تھیں۔ چنانچہ والدہ جاوید نے انہیں اپنی منہ بولی بیٹی بنالیا اور اپنے ساتھ لاہور لے گئیں۔ اس طرح وہ وہیں پلی بڑھیں اور اپنے عظیم المرتبت چچا جان کی ''درونِ خانہ'' حیات کے لمحے لمحے کی شاہد ٹھہریں۔

دادی جان محترمہ مہتاب بی بی مرحومہ کی نظرِ انتخاب اب انہی پر رکی ہوئی تھی اور وہ ہر قیمت پر ان کو اپنی بڑی بہو کے

روپ میں دیکھنے کی متمنی تھیں۔ تمام افرادِ خاندان تقریباً راضی ہو چکے تھے البتہ شیخ عطا محمد صاحب نے آخری اڑچن یہ رکھی تھی کہ اقبال سے پوچھ لیا جائے کیونکہ وہ وسیمہ کو اپنی منہ بولی بیٹی کہتا ہے ...... آخری فیصلہ اسی کا ہوگا۔ جیسے ہی انہوں نے عندیہ دیا محترمہ مہتاب بیگم فوراً شیخ خورشید صاحب کو ساتھ لے کر لاہور علامہ صاحب کے ہاں جا پہنچیں اور اپنے ماموں سسر اور ممانی ساس کو صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے استدعا کی کہ میری دلی خواہش پوری کرنا اب آپ دونوں کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ ان کی بیقراری کو مدِنظر رکھتے ہوئے علامہ علیہ الرحمۃ نے حامی بھر لی اور ان کو تسلی دی کہ اس برس موسمِ گرما کی تعطیلات میں جب سیالکوٹ آئیں گے تو بھائی صاحب (شیخ عطا محمد صاحب) سے تفصیلاً بات کر کے منگنی وغیرہ کی رسم ادا کر دی جائے گی۔ چنانچہ حسبِ وعدہ منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا ہو گئی۔ اس کامیابی پر دادی اماں پھولی نہیں سما رہی تھیں اور ہر ایک سے مبارک بادیاں وصول کرتی نہ تھکتی تھیں۔ دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ خاص طور پر میرے ددھیال والے اس تقریب کو ایک یادگار اور منفرد تقریب بنانے کے لیے بھرپور انداز میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

یہ تقریبِ سعید ۱۶ مارچ ۱۹۳۴ء بمطابق ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ بروز اتوار منعقد ہوئی اور میری دادی جان محترمہ مہتاب بی بی نے جس طرح اپنے ارمان نکالے، وہ ایک بڑی عجیب اور دلچسپ داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ سیالکوٹ میں کسی مسلمان گھرانے میں اس قدر شاندار تقریبِ شادی اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ تقریب ایک طویل عرصہ تک زبان زدِ عوام رہی اور لوگ اس کا ذکر ہمیشہ ہی حیرت و استعجاب کے ملے جلے جذبات سے کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ راقم الحروف جس کی پیدائش اپنے والدین کی شادی کے پانچ برس بعد یعنی ۱۹۳۹ء میں ہوئی، نے بھی اپنے لڑکپن اور جوانی میں اس کے متعلق بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز حکایات لوگوں کی زبانی سنی ہیں۔ میری دادی اماں کو اس رشتے کی اس قدر خوشی تھی کہ انہوں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور اس تقریب کو ایک یادگار تقریب بنانے کے لیے اپنی سی پوری پوری کوشش کی کہ "اقبال منزل" والے کسی طرح یہ نہ سوچیں کہ ان کی بیٹی کسی معمولی گھر بیاہ کر جا رہی ہے۔ دوسرے "خورشید منزل" والوں کے لیے اپنی امارت کے اظہار کا یہ ایک سنہری موقع تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے' تا کہ پورے خاندان اور برادری کو ان کی دولت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

اس وقت کے امیر و کبیر ہندوؤں کے رواج کے مطابق رات کو بارات نکالی گئی۔ گیس کے ہنڈولوں کے جلو میں جب

دلہا میاں کمخواب کی شیروانی اور سر پر سونے کا سہرا سجا کر شنیل کی سلمہ ستارے کے کامدانی کام کی بھاری چادر سے مزیّن گھوڑے پر سوار ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے ستاروں کی محفل میں چاند نکل آیا۔ کمخواب کی شیروانی سونے کا سہرا اور گھوڑے کی چادر یہ سب چیزیں دادی اماں نے خاص طور پر اس موقع کے لیے تیار کروائی تھیں۔ یہ سب کچھ روشنیوں میں اس طرح چمک رہا تھا کہ آنکھیں چندھائی جا رہی تھیں۔ بارات میں شہر اور برداری کے معززاور امیر و کبیر تجار شامل تھے۔ بارات پر نچھاور کرنے کے لیے چاندی کے روپے خاص طور پر ڈھلوا کر خوب چمکائے گئے تھے۔ دیکھنے والے بتایا کرتے تھے کہ یہ روپے ایک بڑی تھیلی میں شیخ خورشید صاحب کے چھوٹے بھائی شیخ ظہور احمد صاحب کے سپرد کیے گئے تھے جو بڑے جوش میں انہیں لٹا رہے تھے۔ اسی دوران لوٹنے والوں کی دھکم پیل میں مذکورہ تھیلی ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور بہت سے چمچماتے ہوئے روپے ایک چھناکے کے ساتھ زمین پر بکھر گئے۔ جب انہوں نے چاہا کہ ان کو اٹھا کر دوبارہ تھیلی میں ڈالیں تو میرے دادا جان شیخ خورشید احمد صاحب نے ایسا کرنے سے منع فرمایا کہ ہم نے تو لٹانے ہی ہیں۔ ویسے نہیں تو ایسے ہی سہی اور لوٹنے والوں کو وہیں زمین پر سے لوٹ لینے کا اشارہ کر دیا۔ چاندی کے یہ روپے خاص طور پر دلہن کے گھر کے قریب بہت بڑی تعداد میں نچھاور کیے گئے۔ اردگرد محلے کے گھروں کے صحنوں اور چھتوں پر روپوں کی بارش کر دی گئی۔ کئی ایک ان گھروں کی اونچی منڈیروں پر جا اٹکے اور تقریب کے کافی عرصہ بعد تک کئی بار ایسا ہوا کہ کسی گھر کے آنگن میں کسی پرندے کے اڑنے کی وجہ سے منڈیر پر اٹکا ہوا کوئی سکہ ''ٹن'' کی آواز کے ساتھ آن گرا تو مستورات اور بچوں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ ''ٹوپیوں والوں'' کی بیٹی کی شادی پر لٹائے گئے روپوں میں سے ایک ہے۔

''بری'' میں خدا جانے دادی اماں نے کہاں کہاں کی سوغاتیں یکجا کر رکھی تھیں۔ کمخواب شنیل اور ولایتی جارجٹ کے سلمہ ستارے سے لدے ہوئے جوڑے بنارسی ساڑھیاں ولایتی جوتے اور کشمیر کی شالیں۔ ایک خاص بات ان کی ایک جیسی تعداد تھی یعنی ۲۱ جوڑے ۲۱ ساڑھیاں ۲۱ جوتے ۲۱ شالیں وغیرہ۔ زیورات اور سنگھار بکس خاصے کی چیز تھے جو کشمیر سے منگوائے گئے تھے اور اخروٹ کی لکڑی سے منقش بنے ہوئے تھے۔ خاص طور پر سنگھار بکس جس کا پورا سامان خالص چاندی کا تھا۔ یہ سنگھار بکس آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ غرض دنیا جہان کے تحفے دلہن کے لیے جمع کیے گئے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر لوگ انگشت بدنداں تھے۔ زیورات کا شمار نہیں تھا اور شاید اس زمانے میں پہلی بار کسی

مسلمان دلہن کو یہاں سیالکوٹ میں سونے کا تاج پہنایا گیا تھا۔ ان تمام زیورات کا وزن ایک سوتولہ سے زیادہ تھا۔ اس قدر دولت خرچ کی گئی کہ پورا سیالکوٹ دنگ رہ گیا۔ ''اقبال منزل'' والے شاید ''خورشید منزل'' والوں کی امارت سے مرعوب تو نہ ہوئے ہوں مگر میرے خیال میں انہوں نے ایک بار تو یہ ضرور سوچا ہو گا کہ خورشید احمد کے ہاتھ شاید قارون کا خزانہ لگ گیا ہے۔

میری والدہ محترمہ بتایا کرتی تھیں کہ ''بھابھی چاند (شیخ اعجاز احمد صاحب کی بیگم) جن کا تعلق امرتسر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا اور کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں' بھی بڑی مرعوب ہوئیں اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئیں کہ وسیمہ کے لیے چڑھاوے کے کپڑے اور زیورات بہت ''بڑھیا'' قسم کے آئے ہیں اور اس کی سسرال والوں نے تمام ارمان نکال دیئے ہیں۔''

''اقبال منزل'' میں بارات کا بڑا شاہانہ استقبال کیا گیا اور بڑے شاندار طریقے سے خاطر و مدارت کی گئی۔ بڑا پرتکلف کھانا پیش کیا گیا۔ اقبال منزل میں اس سے قبل بہت سی شادیاں ہوئیں' بہت سی باراتیں اتریں اور بہت سی چڑھیں مگر ایسی ''بے نظیر'' بارات صرف اور صرف یہی نظیر احمد صاحب کی تھی۔ نہ اس سے پیشتر اور نہ ہی اس کے بعد کبھی کوئی ایسی بارات وہاں آئی نہ گئی۔ سارا کشمیری محلہ اس کا گواہ تھا کہ شیخ غلام محمد کے بیٹے شیخ خورشید احمد نے اپنے بڑے بیٹے شیخ نظیر احمد کی شادی جس شان و شوکت کے ساتھ کی' وہ نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی۔ اس زمانے میں ہندوؤں میں تو اس قسم کی باراتیں اور شادیاں کبھی نہ کبھی منعقد ہوتی ہی تھیں کیونکہ وہ لوگ بھی بڑے کھلے دل سے شادیوں پر دولت لٹاتے تھے اور خوب نمائش کرتے تھے کیونکہ ان کے پاس بے حد و حساب دولت تھی بلکہ سارے ملک کی دولت انہی کے ہاتھوں میں تھی' مگر اس دور کے بیشتر مسلمان جو بے چارے نانِ جویں کے لیے بھی ترستے تھے اور زیادہ تر ہندوؤں کے دستِ نگر تھے...... ایک مسلمان گھرانے کی طرف سے ہندوؤں کے مقابلے میں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر دولت کی فراوانی پر احساسِ تفاخر کے ساتھ ساتھ شاید احساسِ کمتری میں بھی مبتلا تھے۔ چنانچہ ان شاہ خرچیوں کے گھر گھر چرچے ہوئے' دادی اماں محترمہ مہتاب بی بی کے سگھڑاپے کے تمام شہر میں ڈنکے بجے۔ خاص طور پر ان کے میکے اور برادری میں تو اس کا خوب خوب چرچا ہوا۔ کچھ ان کی اس امارت سے شاید مرعوب ہوئے مگر زیادہ تر جل کر کباب ہو گئے اور حسد کے ماروں نے کیا کیا باتیں نہ بنائیں...... خیر یہ تو دستورِ زمانہ ہے' اس کا کیا گلہ!

میری والدہ کو جہیز بھی خوب لد پھند کے ملا۔ چونکہ آخری بچی کی شادی تھی اور پھر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی منہ بولی بیٹی کی شادی' اس لیے بے شمار زیورات اور ملبوسات اور دوسرا انتہائی قیمتی سامان دیا گیا۔ جن میں ایک عدد گائے اور اس کی بچھیا بھی شامل تھی۔ زیورات میں ایک خاص سیٹ جو علامہ صاحب کی طرف سے پہنایا گیا تھا' آج تک ہمارے خاندان میں موجود ہے ...... یہ سونے کا سیٹ حضرت علامہ کو شاہِ افغانستان نے تحفتاً دیا تھا۔ اس کے علاوہ سردار چچی جان کی طرف سے ۸ تولہ سونے کی پازیبیں اپنی منہ بولی بیٹی کو پہنائی گئیں۔

میری دادی اماں نے اپنی بہو کے استقبال کے لیے بھی بڑے شاندار انتظامات کر رکھے تھے۔ حجلۂ عروسی کو جس طرح مزیّن کیا گیا تھا' وہ بھی اس زمانے کے لحاظ سے ایک بڑی عجیب اور نئی بات تھی کیونکہ اس دور میں شاید اس قسم کی باتیں ابھی اتنی عام نہیں تھیں' اس لیے سب کے لیے اور خاص طور پر مستورات کے لیے یہ سب کچھ بے حد عجیب و غریب اور بالکل انوکھا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شادی واقعتاً اسی دنیا میں ہو رہی ہے یا کوئی پرستانی خواب ہے۔ کہتے ہیں کہ حجلۂ عروسی کی دیواروں تک کو مخمل اور جارجٹ سے سجایا گیا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر مخمل کے پردے آویزاں تھے اور چھپر کھٹ پر کمخواب کی چادر ...... پھر ان تمام پر سلمہ ستارے کا بھاری کامدانی کام کیا گیا تھا جو روشنیوں میں چاند ستاروں کی طرح جھلملاتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس عظیم خاتون نے کہاں سے اس قدر گراں چیزیں مہیا کی تھیں اور یہ سجاوٹیں اور بناوٹیں کہاں سے سیکھی تھیں؟ یہ سب سن سن کر شک ہوتا ہے کہ محترمہ مہتاب بی بی میں شاید کسی مغلیہ شہزادی کی روح حلول کر گئی تھی کہ ان تمام چیزوں کا علم اور استعمال معلوم تھا۔ میری والدہ کے میکے کی عورتیں حجلۂ عروسی کی سجاوٹ دیکھ دیکھ کر حیران اور پریشان ہوتی رہیں اور کئی ایک نے تو یہاں تک دلہن سے پوچھ لیا کہ ...... ''وسیمہ! کیا یہ سب کچھ اصلی ہے؟''

میرے والدِ ماجد جناب نظیر احمد صوفی نے کمخواب کی جو شیروانی شادی میں زیبِ تن فرمائی اور سونے کا وہ سہرا جو ان کے سر پر سجایا گیا اور گھوڑے کی وہ سلمہ ستارے سے جڑی مخملی چادر اب بھی خاندان میں موجود ہیں۔ آنے والی نسلوں نے ان کا بطور تبرک دیدار ضرور کیا مگر آج تک کسی کو ان کو استعمال کرنے کی شاید جرأت نہ ہوئی۔ کمخواب کی شیروانی

ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے مگر ہم میں سے بھی کسی نے اسے استعمال نہیں کیا۔ میری والدہ محترمہ کی بری کے ملبوسات بھی جو کمخواب اور مخمل سے بنائے گئے تھے اور جن پر سچے (اصلی) سلمہ ستارے کا کام کیا گیا تھا' صندوقوں

میں بند پڑے رہے اور انہوں نے اپنی بیٹی بشریٰ اور بڑی بہو خالدہ کو ان کی شادیوں پر یادگار تحفوں کی شکل میں دیے۔ ان میں سے چند ایک چیزیں اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ گو ان کا کپڑا اب خاصا پرانا ہو جانے کی وجہ سے قدرے بوسیدہ ہو گیا ہے مگر اس کی چمک دمک اور شان میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ان کپڑوں کو ان شادیوں میں دینے کے لیے میری والدہ مرحومہ نے نکالا تو ان میں سے کچھ اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ ناقابلِ استعمال تھے چنانچہ ان کو جلا کر ان پر کیے گئے سلمہ ستارے کے کام میں سے خالص چاندی حاصل کی گئی تھی جو اچھی خاصی قیمت پر فروخت ہوئی۔

والدِ محترم اپنی دعوتِ ولیمہ کے متعلق بھی بڑی دلچسپ تفصیلات بتایا کرتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ...... ''بڑی شان و شوکت کے ساتھ ولیمہ کی دعوت ہوئی' سیالکوٹ کی تقریباً ساری کاروباری شخصیات مدعو تھیں ...... خاص طور پر ہندو اور سکھ حضرات' گوشت میں پکے ہوئے کھانے چکھنے کے لیے آئے تھے۔ جن میں خاص طور پر مشہور سردار گنڈا سنگھ جن کی سپورٹس کا سامان بنانے کی بڑی مشہور فیکٹری تھی جس کا نام تو Uberoi Sports تھا مگر شہر میں ''گنڈا سنگھ دا کارخانہ'' کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس دور میں سیالکوٹ کے تقریباً آدھے سے زیادہ کاریگر وہاں کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ''ڈائنا سپورٹس'' کے بابو لچھمن داس ڈھینگرہ صاحب اور نانک سنگھ بیدی۔ ایس ریال کمپنی کے مالک کندن لال۔ پلے ٹائم سپورٹس کے انت رام اور کو بندیہ فیملی کے موہن راج' گڈ ایئر سپورٹس کے شرما صاحب' سردار سندر سنگھ بلدیو' لالہ ملکراج کھتری' مدن لعل' لالہ مادھو رام' لالہ رام لبھایا اور لالہ میگھراج کھتری شامل ہوئے''۔

والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ...... ''چونکہ ان ہندوؤں اور سکھوں نے چھپ کر گوشت کھانا تھا' اس لیے ان سب کے لیے علیحدہ پردہ دار نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ باہر تو وہ سب سبزی خور مشہور تھے اور گوشت کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے' مگر پردے کے پیچھے انہوں نے خوب ڈٹ کر گوشت اڑایا اور بے حد داد دی۔ بعد میں بھی وہ سب اس دعوت کو یاد کر کے والد صاحب (شیخ خورشید احمد صاحب) اور مجھے داد دیا کرتے تھے اور ان ذائقوں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ولیمہ کا کھانا پکانے کے لیے سرینگر کشمیر سے خاص باورچی بلائے گئے تھے جنہوں نے کشمیر کے مشہور اور منفرد کھانوں کو اس مہارت سے یہاں پنجاب میں تیار کیا تھا کہ سیالکوٹ میں بیٹھ کر کشمیر کی دعوتوں کی یاد تازہ ہو گئی۔

اس شادی پر میرے دادا جان محترم شیخ خورشید احمد صاحب اور دادی اماں محترمہ مہتاب بی بی صاحبہ نے جس طرح

دولت پانی کی طرح بہائی' وہ کافی عرصہ تک سیالکوٹ میں ایک ضرب المثل کے طور پر مشہور رہی۔ اب بھی کبھی کسی ایسے بزرگ سے ملاقات ہو جائے جنہوں نے اس شادی میں کسی طور شمولیت کی تو وہ ان محیّر العقول واقعات کا تذکرہ بڑی تفصیل اور دلچسپی سے فرماتے ہیں اور ''خورشید منزل'' کی اس منفرد تقریب کا احوال بیان کرتے ان کی زبانیں نہیں تھکتیں۔ یہاں تک کہ اس دور کے امیر و کبیر ہندو تاجروں نے بھی جو خود تقریبات پر بے اندازخرچ کیا کرتے تھے' شیخ خورشید احمد صاحب کو بے حد داد دی اور بعد میں بھی اصرار کر کے گوشت میں پکے کھانوں کی دعوتیں اڑاتے رہے۔ والدِ محترم بتایا کرتے تھے کہ...... ''ان کا ہمیشہ یہی مطالبہ ہوا کرتا تھا کہ کھانا اسی قسم کا ہونا چاہئے جیسا نظیر احمد کے ولیمہ کا تھا کیونکہ گوشت کھانے کا جو چسکا انہیں ولیمہ کی دعوت میں پڑا تھا' وہ تمام عمر ان کا پیچھا کرتا رہا اور انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی کہ گوشت کھانے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا۔

اگر یہاں کسی طور یہ سمجھا جائے کہ مندرجہ بالا تمام واقعات اور تفصیلات کے بیان سے کسی قسم کا اظہارِ تفاخر مطلوب ہے تو یقین کریں ایسا کوئی مقصد میرے پیشِ نظر نہیں۔ ان محیّر العقول واقعات اور نا روا اسراف کے متعلق تفصیلات پیش کرنے سے درحقیقت اس خوامخواہ کے مقابلے کے رجحان کا بیان مقصود تھا۔ ذاتی طور پر میں اس سے کسی قسم کے تفاخر یا غرور کا شکار نہیں ہوں۔ اور اگر ایسا کوئی خیال بھی میرے دل کے کسی گوشے میں موجود ہے تو خداوند تعالیٰ مجھے اس کے لیے معاف فرمائیں اور ایسی اسراف زدہ کارروائیوں کے اعادے سے مجھے اور میری آنے والی نسلوں کو محفوظ و مامون رکھیں۔ آمین!

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکمِ او اندر تن و تن فانی است

(رموزِ بے خودی)

باب سوم

مباحث

۱۔ تاریخِ ولادتِ اقبالؒ
چونکا دینے والے چند مزید حقائق

۲۔ مقامِ اقبالؒ
خودنوشتِ اقبال کی روشنی میں

۳۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
پیشگوئی یا حکمنامہ؟

گر شب پرہ چشم روز نہ بیند
چشمہء آفتاب را چہ گناہ

تاریخِ ولادتِ اقبالؒ

چونکا دینے والے چند مزید حقائق

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) جو ۱۹۷۱ء میں پہلی بار بزمِ اقبال لاہور کی طرف سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی بالکل درست تاریخِ ولادت یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ کے حوالے سے پیش کی گئی تھی۔ اس سے پیشتر اس سلسلے میں مختلف تواریخ مروّج تو تھیں لیکن کسی ایک پر اتفاقِ رائے مفقود تھا۔ چنانچہ اس مبنی بر حق تحقیق کے بعد ایک بار پھر ہر طرف علامہ علیہ الرحمۃ کی بالکل درست تاریخِ پیدائش مقرر کرنے کی ضرورت کے متعلق غوغا اٹھا اور مختلف حلقوں نے اس کے لیے بڑی تگ ودو فرمائی' بے شمار مقالات تحریر ہوئے اور مختلف اقسام کے شواہد جمع کیے گئے کیونکہ ۱۸۷۳ء کے حساب سے ۱۹۷۳ء بالکل سر پر آن پہنچا تھا اور اربابِ بست وکشاد صد سالہ جشن کی تقریبات کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔

دوسرا تازیانہ جو اس قبیل کے اصحاب کے لیے بے حد تکلیف کا باعث ثابت ہوا' یہ تھا کہ ہمسایہ ملک بھارت نے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو درست تاریخِ ولادت قرار دیتے ہوئے صد سالہ جشن کا اعلان کر دیا اور ۱۹۷۳ء کے پورے سال کو ''اقبال صدی'' کی تقریبات منعقد کرنے کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس سلسلے میں یہاں پاکستان میں بھی تقریبات منعقد تو ہوئیں مگر محدود پیمانے پر خاص طور پر مجلس ترقی ادب اور بزمِ اقبال لاہور نے بھی ایک ایسی ہی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرماویں:

''بعض پاکستانی محققین کے مطابق ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء صحیح تاریخِ پیدائش تھی' چنانچہ بعض حلقوں نے اس کے مطابق صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا۔ پروفیسر حمید احمد خان کے انصرام میں مجلس ترقی ادب اور بزمِ اقبال نے بعض قابلِ قدر مطبوعات اور ''صحیفہ'' کا ایک ضخیم اقبال نمبر (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی) شائع کیا۔ ۲۹ دسمبر کی شام ایک تقریب منعقد ہوئی جس کے اختتام پر اقبال پر نادر کتابوں کی نمائش دکھائی گئی''۔!

اسی طرح ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اپنے مقالے "علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء" میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجلسِ ترقی ادب کے اہتمام سے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی بنیاد پر جشنِ صد سالہ کی تقریب وزیرِ تعلیم جناب عبدالحفیظ کاردار کی صدارت میں ۱۳ فروری ۱۹۷۴ء کو منائی گئی۔"[1]

اسی طرح بھارت میں بھی ۱۹۷۳ء میں کئی ایک تقریبات منعقد ہوئیں۔ مگر پاکستان کے زیادہ تر سرکاری اور غیر سرکاری حلقے خوابِ خرگوش سے بیدار ہوئے تو ۱۹۷۳ء اختتام پذیر ہو چکا تھا' چنانچہ ایک دفعہ پھر کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں قائم فرمائی گئیں اور بڑی طویل و عریض بحثوں کے بعد آخر اس پر اتفاق ہو ہی گیا کہ اقبال صدی تقریبات ۱۹۷۷ء میں منعقد ہوں گی تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ ہو سکے جو ۱۹۷۳ء کے حوالے سے ہو چکی تھی۔

مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں کہ آخر کیوں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی درست تاریخ ولادت وہ مقرر نہیں ہوئی جو سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ کے مطابق ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے حصے کا کام پوری دیانتداری اور احسن طریقے سے سرانجام دے دیا تھا اور میونسپل ریکارڈ سے پوری طرح تحقیق کے بعد بالکل درست تاریخ ولادت یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء پیش کر دی تھی ...... اب ماننا یا نہ ماننا جن کا حصہ ہے' وہ جانیں۔ اس میں یقیناً میرا یا میرے والد مرحوم کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں' یہ تو ایک تحقیقی عمل تھا اور تحقیق کا کام تو چلتا ہی رہتا ہے کیونکہ تحقیق میں بہت سی باتیں حتمی نہیں ہوا کرتیں۔ محققین آج بھی اس سلسلے میں سرگرمِ عمل ہیں اور حال ہی میں بزمِ اقبال لاہور ہی کی جانب سے ایک مکمل کتاب "علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت" کے عنوان سے شائع کی گئی ہے۔

یہاں کسی نئی اور طویل بحث میں الجھنے کی بجائے میں صرف ان اعتراضات کے سلسلے میں چند حقائق پیش کرنا چاہوں گا جو وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں کیے جاتے رہے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ ان تمام احباب کی تشفی ہو سکے گی جو اس تمام عرصہ میں گومگو کا شکار رہے ہیں۔ البتہ اس بات کا افسوس ہمیشہ رہے گا کہ ایک طویل عرصہ' تقریباً بیس برس[2]

ملک سے باہر قیام کی وجہ سے خاصی تاخیر اس سلسلے میں ہو گئی اور میرے دونوں "ممدوحین" جناب پروفیسر محمد عثمان صاحب اور محترم شیخ اعجاز احمد صاحب اس دارِ فانی سے اس عرصے میں رحلت فرما گئے۔

سب سے پہلے سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ میں تاریخ ولادت کے اندراج ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے اطلاع کنندہ علی محمد کے

سلسلے میں کچھ عرض کروں گا۔ شیخ اعجاز صاحب نے یہ اعتراض کیا اور حلفیہ بیان فرمایا ہے کہ اس نام کا کوئی رشتہ دار یا فرد خاندانِ اقبال میں سرے سے موجود ہی نہیں رہا۔ پہلے انہوں نے اس کا ذکر اپنے چند فاضلانہ مضامین میں کیا اور پھر اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اس کا اعادہ بھی فرمایا۔ ''اقبال درونِ خانہ'' میں علی محمد صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ یقیناً مجھے اپنے والدین کے توسط سے معلوم ہوا۔ اگر شیخ صاحب درست فرما رہے ہیں تو میرے والدین کو بھی غلط بیانی کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ آخر اس میں کس قسم کا ذاتی فائدہ پوشیدہ تھا؟

اب تیس برس بعد یعنی ۱۹۶۹ء سے ۱۹۹۹ء جب ''اقبال درونِ خانہ'' کا دوسرا حصہ ترتیب دے رہا ہوں تو مختلف موضوعات پر تحقیق کے دوران ایک بالکل مختلف موضوع یعنی ''والدۂ اقبال کا وقت آخر'' پر کام کرتے ہوئے اتفاقاً ان کی تاریخ وفات کا اندراج سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ سے حاصل کیا اور ایک عجیب اتفاق اور دلچسپ انکشاف کو اپنا منتظر پایا۔ کتاب زیرِ نظر کے گزشتہ صفحات میں اس اندراج کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ سہولت کے لیے ایک بار پھر یہاں اس کو دوہرایا جا رہا ہے:

رجسٹر اموات، محکمہ حفظانِ صحت، میونسپلٹی سیالکوٹ

اس میں تمام اندراجات بالکل درست ہیں اور کسی قسم کا کوئی اعتراض شاید ممکن نہیں۔ مگر جو بات سب سے زیادہ دلچسپ اور غور طلب ہے، وہ ہے اس کا اطلاع کنندہ..... جس کا نام ایک بار پھر ''علی محمد'' ہے اور اس بار یقیناً اس علی محمد صاحب کو یہ کہہ کر مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ ''نہ کبھی دیکھا نہ کبھی سنا'' کیونکہ خاندانِ اقبال کے تقریباً تمام افراد اور بزرگ وہاں موجود تھے یعنی والدِ اقبال شیخ نور محمد صاحب، برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد صاحب اور خود حضرت علامہ اقبالؒ اور یقیناً ان سب کے ایماء پر ہی علی محمد صاحب اس اندراج کے لیے میونسپلٹی کے دفتر تشریف لے گئے ہوں گے۔

والدۂ اقبال کا انتقال ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا اور یہ اندراج دوسرے روز یعنی ۱۰ نومبر ۱۹۱۴ء کا ہے۔ علامہ علیہ الرحمۃ بے جی کی علالت میں ہی سیالکوٹ تشریف لا چکے تھے اور ختمِ سوم تک بلکہ چند روز بعد تک سیالکوٹ میں موجود تھے۔ ان دنوں سیالکوٹ میں موجودگی مندرجہ ذیل تحریر سے ثابت ہے جو انہوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کو ۱۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو ایک خط کی صورت میں انہیں ارسال کی۔

''کئی دنوں سے سیالکوٹ میں مقیم ہوں۔ آج ان کا سوم ہے۔ کل یا پرسوں لاہور واپس جاؤں گا''۔

اب انتہائی دلچسپ صورتِ حال یہ پیدا ہوگئی ہے کہ حضرت علامہؒ کی ولادت جو ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کی ہے کے اطلاع کنندہ علی محمد اور ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی والدہ کی فوتیدگی کی اطلاع دینے والے بھی علی محمد۔ اگر یہ دونوں صاحبان ایک ہی شخصیت نہیں ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خاندانِ اقبال میں اس نام کے کتنے افراد موجود تھے یا پھر یہ علی محمد صاحب کون ہیں جو ہر تقریب میں لازماً موجود ہوتے ہیں اور پھر خاص طور پر انہیں ہی یہ ذمہ داری آخر کیوں سونپی جاتی ہے کہ وہ میونسپل کمیٹی میں پیدائش یا فوتیدگی کا اندراج کروائیں۔

دوسری دلچسپ بات اس اندراج میں یہ ہے کہ پروفیسر عثمان صاحب نے خاص طور پر اس پر زور دیا کہ چونکہ شیخ نور محمد صاحب محلّہ چوڑیگراں میں رہائش رکھتے تھے' اس لیے صرف اسی اندراج کو تسلیم کیا جائے گا جس میں محلّہ چوڑیگراں درج ہوگا۔ یہاں تک کہ محلّہ کشمیریاں بھی معترضین کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ اس اندراج میں محلّہ کا نام دیکھیں' یہ نہ تو محلّہ چوڑیگراں ہے اور نہ ہی کشمیریاں بلکہ ایک بالکل مختلف محلّہ اس میں درج ہوا ہے یعنی ''محلّہ وہاب والا''۔ باقی تمام تفصیلات یعنی شیخ نور محمد عرف نتھو' ان کی اہلیہ کا نام مسماۃ امام بی بی' تاریخ وفات وغیرہ تمام اندراجات بالکل درست ہیں۔ اب فرمائیے کیا صرف ''محلّہ وہاب والا'' کی وجہ سے اس کو مسترد کیا جاسکتا ہے؟ اس اندراج کو بغور دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں درج تمام تفصیلات بالکل والدۂ اقبال کی فوتیدگی کے متعلقہ ہیں۔ اگر رہائش محلّہ چوڑیگراں کی بجائے محلّہ وہاب والا میں بتائی گئی ہے تو صرف اس کی بنا پر اس کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ایک اور اندراج جو رجسٹر پیدائش سے دستیاب ہوا اور علامہ صاحب کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی پیدائش کے متعلق ہے اس لیے دلچسپی کا باعث ہے کہ اس میں بھی رہائش محلّہ وہاب والا ہی میں دکھائی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

رجسٹر پیدائش۔ محکمہ حفظانِ صحت' میونسپلٹی سیالکوٹ

ایک لڑکا جو ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر سر محمد اقبال ولد شیخ نور محمد کے ہاں تولد ہوا' جاوید اقبال کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ مگر رہائش یہاں بھی محلّہ چوڑیگراں کی بجائے ''محلّہ وہاب والا'' درج ہے تو کیا صرف اس بنا پر اس کو مسترد کردیا جائے؟

اب صورتِ حال بڑی عجیب ہوگئی ہے کہ ہمارے پاس ایک نہیں بلکہ دو اندراجات میں اطلاع کرنے والے صاحبان اگر ایک ہی شخصیت نہیں تو ہم نام ضرور ہیں۔ اور یہ کیسا عجیب اتفاق ہے' میرے دونوں ماموں جان یعنی شیخ اعجاز احمد

صاحب اور ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کسی ''علی محمد'' کے وجود کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ جاوید صاحب تو خیر اعجاز صاحب کی اندھی تقلید میں اس سے پہلو تہی فرما رہے ہیں' مگر شیخ اعجاز احمد صاحب تو بذاتِ خود دوسرے موقع پر موجود تھے۔ وہ بے جی کے جنازے کا احوال تحریر فرماتے ہوئے ''مظلوم اقبال'' میں اپنے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''اس ہنگامے میں پندرہ سولہ سال کا ایک دبلا پتلا لڑکا جسے بے جی نے ڈھیروں پیار دیا' ان کے قدموں سے لپٹا بلک رہا ہے''۔!

یعنی جس وقت اعجاز صاحب کی دادی اماں کا انتقال ہوا ہے تو یہ پندرہ سولہ برس کے عاقل و بالغ تھے۔ اس لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ علی محمد صاحب جو پورے خاندان کے معتمد تھے کہ انہیں میونسپل کمیٹی میں فوتیدگی کے اندراج کے لیے بھیجا گیا' شیخ اعجاز احمد صاحب نے نہ تو ان کو اس وقت گھر میں دیکھا اور نہ ہی وہ انہیں جانتے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اطلاع کنندہ کے نام کو بنیاد بنا کر کیا کیا طومار باندھے گئے۔

ایک دوسرا اعتراض جو ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں پیش کردہ پھوپھی کریم بی بی صاحبہ کی ولادت کے متعلقہ اندراج کے بارے میں میرے ''ممدوحین'' جناب پروفیسر عثمان' شیخ اعجاز احمد صاحب اور ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کو ہے' وہ یہ ہے کہ کس طرح حضرت علامہؒ کے دادا جان کا نام محمد رفیق کی بجائے ''محمد رفیع'' لکھا گیا۔ ''اقبال درونِ خانہ'' میں اس کی یہ وجہ لکھی گئی تھی کہ ''سہواً'' ایسا ممکن ہے۔ مگر ان تمام اصحاب نے یہ کہہ کر اس کو مسترد کر دیا کہ ''سہو'' کا سہارا یہاں نہیں لیا جا سکتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ صرف اور صرف اپنے مطلب کی بات تسلیم کرنے کے کیوں خواہش مند ہیں اور ہر وہ بات جو انہیں ناپسند ہے یا ان کے خلاف جاتی ہے' کو مسترد کیے چلے جاتے ہیں۔ یہ دوہرا معیار آخر کس کا قائم کردہ ہے؟ وہ کیوں اپنی ہر بات دوسروں پر ٹھونسنے کے درپے رہتے ہیں۔ ''سہو'' کا احتمال تو نماز تک میں ہوتا ہے اور اسی لیے ''سجدہ سہو'' کی اجازت دی گئی ہے۔ کیا کوئی انسان غلطیوں سے مبرّا ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ تو صرف ایک معمولی سی غلطی ہے کہ سننے اور لکھنے میں تھوڑی سی غلط فہمی کی بنا پر ایسا ہوا ہوگا۔ یہاں جناب مالک رام کے مقالے ''اقبال کی تاریخِ ولادت'' سے ایک حقیقت افروز اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جو ''فلسفہ سہو'' کو بڑی خوبصورتی سے بیان کر رہا ہے۔

''جناب خالد نظیر صوفی کی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ محمد رفیق کی جگہ محمد رفیع سہواً لکھا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

''ق'' اور ''ع'' دونوں حلقی حرف ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں صحیح مخرج سے ادا نہ کرے تو سننے والے کے لیے امتیاز کرنے میں ''سہو'' عین ممکن ہے' لہٰذا وہ ایک کی جگہ آسانی سے دوسرا حرف لکھ جائے گا۔ کیا علامہ کے والد شیخ نور محمد (نتھو) صحیح مخرج سے یہ حرف ادا کرنے کے اہل تھے؟''[1]

مندرجہ بالا وضاحت کے بعد شاید کسی مزید دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی مگر پھر بھی اتمامِ حجت کے طور پر ''مظلوم اقبال'' سے دو ایسے واقعات ضرور پیش کیے جا سکتے ہیں' جو اس پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

''میاں جی کی اس خصوصیت کا ذکر میرے حوالے سے روزگارِ فقیر حصہ دوم جو ۶۴ء میں شائع ہوئی' میں بھی کیا گیا ہے۔ ہماری پھوپھی کریم بی بی نے روزگارِ فقیر میں یہ ذکر پڑھا تو ایک دن مجھے بتلایا.........''[2]

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ پھوپھی کریم بی بی مرحومہ جن کا انتقال ۱۹۵۸ء[3] میں ہو چکا تھا' ۱۹۶۴ء میں شائع ہونے والی کتاب پڑھ کر شیخ اعجاز احمد صاحب کو اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اگر شیخ صاحب خود غلط بیانی فرمائیں اور واقعات کو اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر پیش کریں تو سب جائز لیکن دوسرے اگر سہواً کچھ غلطی کا ارتکاب کر جائیں تو ناقابلِ قبول؟ اسی طرح علامہ صاحب کی بیرسٹری کی سند کا ذکر فرماتے ہوئے شیخ صاحب ''مظلوم اقبال'' میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''چچا جان کو ۱۹۰۸ء میں جو بیرسٹری کی سند دی گئی' اس میں ان کے ولدِ گرامی کا نام انگریزی میں نور محمد کی بجائے میر محمد لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ سند تیار کرنے والے انگریز کارکن نے اسلامی ناموں سے ناواقفیت کی وجہ سے نور کو میر پڑھا اور وہی لکھ دیا''[4]

اسی سلسلے میں آگے چل کر مزید وضاحت فرما رہے ہیں:

''بیرسٹری کی سند میں میر محمد' سند لکھنے والے کارکن کی غلطی سے لکھا گیا''[1]

یہاں پھر وہی پرانی بات دوہرانی پڑے گی کہ اگر ایک انگریز غلطی کرے تو ہم اس کو فوراً معاف کر دینے کے لیے کوئی نہ کوئی جواز خود ہی تراش لیتے ہیں کیونکہ یہ ہم سے برداشت ہی نہیں ہوتا کہ ''آقا'' سے کوئی غلطی سرزد ہو کیونکہ ہماری

تربیت ہی ایسی ہوئی ہے کہ فرنگی کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ اور ہماری غلامانہ ذہنیت ابھی تک اسی ٹریک پر چل رہی ہے۔ یہاں ایک انگریز کو اس لیے قابلِ معافی سمجھا جا رہا ہے کہ بے چارا اسلامی ناموں سے واقف نہیں مگر اس کو اپنی زبان سے تو یقیناً واقفیت ہوگی اور وہ 'N' اور 'M' کا فرق بخوبی جانتا ہوگا اور پھر ''Noor'' اور ''Mir'' میں تو ویسے بھی خاصا فرق ہے کہ ایک میں چار اور دوسرے میں تین حروف آتے ہیں۔ اور پھر انہوں نے تو کہیں پر لکھے ہوئے سے کاپی کرنے میں غلطی کی' جب کہ دوسرے سے سننے میں سہو ہوا۔ اگر یہاں یہ کہا جائے کہ فرنگی کو لکھنے میں سہو ہوا اور انہوں نے ''سہواً'' Noor کو Mir لکھ دیا تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ غلطی کو ہی عربی میں سہو کہتے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ فرنگی صاحب بہادر کا سہو معاف مگر ایک بے چارے پنجابی کو اس کی اجازت نہیں۔ ایک انگریز کو اپنی زبان میں بھی غلطی کی اجازت مگر بے چارا پنجابی' عربی کے لفظ یا نام خواہ وہ اسلامی ہی ہوں' صرف سن کر اگر لکھنے میں سہو کر جائے تو وہ اس کا حقدار نہیں۔ حالانکہ ''رفیق'' اور ''رفیع'' میں اس بے چارے نے حروف میں تخفیف بالکل نہیں کی' بلکہ صرف بولنے والے کی وجہ سے شاید ایک حرف کی آواز کے صوتی اثرات اس تک صحیح نہیں پہنچ پائے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جہاں جو چیز ان کے حق میں جاتی ہو وہ تو ''لکھنے والے کارکن کی غلطی'' کے طور پر تسلیم مگر جہاں سہواً نتھو ولد محمد رفیق کی بجائے ''نتھو ولد محمد رفیع'' لکھا جائے' وہ ان کو نا منظور...... ایں چہ بوالعجبی است؟

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا کہ آج کے دور میں ایک عام فہم طالبِ علم زیادہ سے زیادہ پندرہ یا سولہ برس میں میٹرک کر لیتا ہے مگر کیا علامہ اقبالؒ اتنے کند ذہن واقع ہوئے تھے کہ انہوں نے بیس برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا؟ یہ اس لیے کہ اگر علامہ صاحب کی تاریخ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء درست مان لی جائے تو میٹرک پاس کرتے وقت ان کی عمر بیس برس کے قریب تھی۔

اس سلسلے میں صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ آج کل بچے کو پانچ یا چھ برس کی عمر میں سکول میں داخل کیا جاتا ہے اس لیے پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں میٹرک تک پہنچ جانا واقعتاً درست ہے۔ مگر اس دور میں جب تعلیم' خاص طور پر سکول کی تعلیم کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور تقریباً ہر بچے کو سکول سے پہلے مسجد یا مدرسے میں بھیجا جاتا تھا اور اس بنا پر سکول میں دیر سے پہنچتا تھا۔ اس دور میں سکول میں دیر سے داخل ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ان دنوں میں کئی ایک دوسرے مشاہیر کے متعلق بھی یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ میٹرک پاس کرتے وقت بیس برس سے بھی بڑے تھے۔

مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق کے متعلق سب جانتے ہیں۔صرف اس وجہ سے کسی کو کند ذہن قرار دینا درست نہیں ہو گا کیونکہ اس دور کے مطابق اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔اگر بچہ دیر سے سکول پہنچے گا تو ظاہر ہے کہ میٹرک تک پہنچنے میں کم از کم دس برس کا عرصہ تو صرف ہوگا۔ہاں اس صورت میں کند ذہنی کا الزام لگ سکتا ہے جب سکول میں داخلے کے بعد میٹرک تک پہنچنے میں دس برس سے زیادہ کا عرصہ لگایا جائے .....آج کے ترقی یافتہ دور میں بچوں کو تین یا چار برس کی عمر میں ہی سکول بھیجا جارہا ہے۔عین ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں بارہ تیرہ برس کے بچے میٹرک پاس کرنے لگیں تو کیا ان تمام بزرگوں کو جنہوں نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں میٹرک کیا تھا' کند ذہن قرار دے دیا جائے گا؟

اس کے لیے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ایک مثال تو گھر میں ہی موجود ہے۔حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے اپنے فرزندِ ارجمند جناب آفتاب اقبال صاحب نے ۱۸ برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔آفتاب ماموں کی تاریخ پیدائش ۲۳ جون ۱۸۹۸ء[1] ہے اور انہوں نے ۱۹۱۶ء[2] میں میٹرک پاس کیا۔یعنی میٹرک کرتے وقت ان کی عمر ۱۸ برس تھی۔کیا اس وجہ سے وہ کند ذہن طلبا کی فہرست میں شامل کیے جائیں گے؟

اس تاریخ ولادت یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو مسترد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ میں اس اندراج کی تفصیلات میں حضرت علامہؒ کے والدِ گرامی کا پیشہ ''خیاط'' لکھا گیا ہے' جو ان اصحاب کے خیال میں بالکل غلط ہے۔دراصل کچھ افراد اس حقیقت سے نظریں ملانے سے کترا رہے ہیں کیونکہ وہ شیخ نور محمد صاحب کو ''خیاط'' کے روپ میں دیکھنا پسند نہیں فرماتے۔آخر اس میں کیا قباحت ہے .....کیا خیاط کہلانا کوئی گالی ہے؟ یا یہ پیشہ اختیار کرنا گناہِ عظیم میں شمار ہوتا ہے؟ کیا یہ امر باعثِ فخر نہیں کہ ہمارے بزرگ اپنی ہی انگلیوں کی محنت سے[3]

رزقِ حلال کماتے تھے .....وہ کبھی بھی کسی غلط کام میں ملوث نہیں ہوئے اور نہ ہی انہوں نے اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے کبھی لقمۂ حرام کی خواہش کی۔انہوں نے ہمیشہ مقدور بھر محنت کی اور یہ حقیقت ہمارے لیے باعثِ فخر ہونی چاہئے کہ ہمارے بزرگ خود پرداختہ قسم کے محنتی اور دیانتدار لوگ تھے اور انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود علم کی شمع سے محبت کی اور ''مجددِ العصر'' اور ''حکیم الامت'' جیسے مقاماتِ بلند پر فائز ہونے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں وارد ہونے والوں نے مہاجر ہونے کا کوئی غلط یا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بجائے محنت مزدوری کو اپنا شعار بنایا اور اکثریت نے کسی قسم کی بھی محنت سے جی نہیں چرایا اور ہر پیشہ اپنا کر اپنے جینے کا سامان مہیا کیا۔ اس لیے اگر بنظرِ غائر دیکھیں تو کشمیر کے لوگ ہر پیشہ میں موجود ملتے ہیں اور چونکہ یہ قوم بے حد محنتی واقع ہوئی ہے اس لیے ہر جگہ خوب ترقی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ دراصل کشمیری ہونا نہ تو کوئی پیشہ ہے اور نہ ہی کوئی ذات ...... یہ تو کشمیر جنت نظیر سے تعلق کی بنا پر ہے۔ کیا کشمیر میں لوگ درزی' بڑھئی' لوہار' موچی' نائی وغیرہ کا کام نہیں کرتے ...... محنت میں کوئی عار نہیں ...... رزق حلال کے لیے کوئی پیشہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کام سے منع فرمایا ہے وہ صرف حرام کمائی ہے' اور اس سے ہر صورت بچنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس میں کشمیری یا کسی دوسرے میں کوئی تخصیص نہیں۔

سیالکوٹ کے میونسپل ریکارڈ میں ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے اندراج میں شیخ نور محمد عرف نتھو کا جو پیشہ ''خیاط'' لکھا گیا' وہ یقیناً اطلاع کنندہ کی فراہم کردہ معلومات کے تحت درج ہوا۔ شیخ اعجاز صاحب نے خصوصیت کے ساتھ اس سلسلے میں بے حد ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس اندراج میں چونکہ والد کا نام نتھو اور پیشہ خیاط لکھا گیا ہے اس لیے یہ کسی صورت شیخ نور محمد صاحب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ یہ کوئی دوسرا نتھو ہے جو ''خیاط برادری'' سے تعلق رکھتا تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں ''میاں جی'' اصل میں ''ٹوپیاں والے'' کے نام سے مشہور تھے اور کبھی بھی ان کو کسی نے ''خیاط'' کہہ کر نہ پکارا نہ جانا۔ حالانکہ اگر ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچا جائے تو اس میں پکارے جانے یا مشہور ہونے کا تو کوئی پہلو نکلتا ہی نہیں۔ یہ تو دراصل اطلاع دینے والے کے بیان کو مختصراً رجسٹر پیدائش میں درج کرنے کا معاملہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص میونسپل کمیٹی میں کسی پیدائش یا فوتیدگی کے اندراج کے لیے جاتا ہے تو متعلقہ اہلکار مذکورہ رجسٹر میں تفصیلات درج کرنے کے لیے اس سے مختلف سوالات کرتا ہے کہ...... ''نام؟ ولدیت؟ تاریخ؟ سکونت؟ والد کا پیشہ مذہب قوم وغیرہ؟ اب اطلاع کنندہ جو جوابات جس طرح ان سوالات کے دیتا ہے متعلقہ اہلکار ان کو اسی طرح لکھتا ہے ...... چنانچہ متذکرہ بالا اندراج کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ استعمال کیا گیا اور جب متعلقہ اہلکار نے اطلاع کنندہ سے یہ دریافت کیا کہ...... ''بچے کے والد کا پیشہ مذہب یا قوم کیا ہے؟'' تو یقیناً اطلاع کنندہ نے جواب دیا ہوگا کہ ''وہ مسلمان ہیں اور برقعوں کے لیے کپڑے کی ٹوپیاں سینے اور بنانے کا کام کرتے ہیں''۔ اب

اگر کمیٹی کا اہلکار یہ پوری تفصیل لکھنا بھی چاہتا تو یہ ممکن نہیں تھا' کیونکہ رجسٹر میں اتنی طویل وعریض تفصیل لکھنے کے لیے جگہ موجود نہیں' چنانچہ متعلقہ اہلکار نے بڑی عقلمندی سے اپنے ''صوابدیدی اختیارات'' استعمال کرتے ہوئے اس ساری تفصیل یعنی ''برقعوں کے لیے کپڑے کی ٹوپیاں سینے اور بنانے کا کام'' کو مختصر کر دیا اور بڑی چابکدستی سے اس تفصیل کو صرف ایک لفظ میں سمو دیا یعنی کوزے میں دریا بند کر دیا اور رجسٹر میں انتہائی مختصر کالم میں ''مسلمان خیاط'' لکھ دیا۔ کیونکہ جو کام اطلاع کنندہ نے پیشہ کے ضمن میں بتایا وہ یقیناً اسی زمرے میں آتا تھا۔ اگر متعلقہ اہلکار ''خیاط'' کی بجائے کچھ اور مثلاً ''بڑھئی یا لوہار'' لکھتا تو یقیناً اس کو غلط بیانی کا مجرم گردانا جا سکتا تھا۔ اب اس کی وجہ سے یہ شور مچانا کہ یہ کسی طور شیخ نور محمد صاحب کا ذکر نہیں ہو سکتا اور یہ کوئی دوسرے صاحب ہیں جو ''خیاط برادری'' سے تعلق رکھتے تھے' خواہ مخواہ ''آ بیل مجھے مار'' والی بات ہے۔ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ اس طرح شیخ نور محمد صاحب ''خیاط'' مشہور ہو رہے ہیں۔ متذکرہ اندراج کی وجہ سے تو شاید وہ اس طرح مشہور نہ ہوتے مگر ان ''نادان دوستوں'' نے اس کو زیادہ اچھالا ہے..... اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیے مالک رام صاحب نے اپنے مقالے ''اقبال کی تاریخِ ولادت'' میں کس طرح اس قبیل کے اصحابِ فہم کا مذاق اڑایا ہے:

''خالد نظیر صوفی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اندراج علامہ کی پیدائش سے متعلق ہے۔ بظاہر اس دعوے کے خلاف کچھ کہنا مشکل تھا۔ والد نتھو اور محلہ چوڑیگراں..... دونوں شرطیں پوری ہو گئی تھیں۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا:

''۲۹ دسمبر ۷۳ء والا اندراج اس نتھو سے متعلق ہے جس کی سکونت تو محلہ چوڑیگراں میں تھی' لیکن وہ کشمیری نہ تھا بلکہ خیاط برادری سے تھا جو سیالکوٹ کی ایک معروف برادری ہے''۔

(مظلوم اقبال از اعجاز احمد صاحب صفحہ:۹۴)

شیخ صاحب (شیخ اعجاز احمد) موصوف نے اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ ''خیاط برادری سیالکوٹ میں بہت مشہور تھی اور اس برادری کے افراد محلہ چوڑیگراں میں بھی آباد تھے''۔

(مظلوم اقبال از اعجاز احمد صاحب صفحہ:۹۶)

ان کے بیانات پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن کوئی یہ بتا دے کہ کمیٹی رجسٹر میں ''خیاط برادری'' لکھا کہاں ہے؟ یہ برادری کا لفظ اضافہ ہے ان معترضین حضرات کا۔ یہ نہ اس بچے کی پیدائش کے اطلاع دہندہ کے ذہن میں تھا' نہ کمیٹی

کے اس کلرک کے، جس نے اسے رجسٹر میں درج کیا۔ وہ سیدھا سادا ''درزی'' کے معنوں میں نقو کا پیشہ لکھ رہا ہے، جو اس خانے کے اوپر لکھا ہے: ''پیشہ، قوم ومذہب'' اندراج ہے ''مسلمان خیاط۔'' کیا شیخ نور محمد (نقو) درزی نہیں تھے؟ خود شیخ صاحب موصوف نے انہیں ''پارچہ دوز'' لکھا ہے (مظلوم اقبال صفحہ: ۲۳)۔ اقبال جب سکاچ مشن سکول میں داخلے کے لیے گئے تو والد کا نام شیخ نور محمد ٹیلر لکھا گیا۔ (نقوش اقبال نمبر۲۔ صفحہ ۲۴) گویا آپ درزی کی جگہ ''پارچہ دوز'' (فارسی) لکھ دیں یا ''ٹیلر'' (انگریزی) تو یہ منظور ہے لیکن اگر کوئی ''خیاط'' (عربی)[1] لکھ دے تو یہ منظور نہیں

ہے...... یاللعجب! سوال یہ ہے کہ جب لکھنے والے نے خیاط برادری لکھا ہی نہیں، تو آپ اپنی طرف سے ''برادری'' کے لفظ کا اضافہ کے کس حد تک مجاز ہیں؟ یا حق بجانب ہیں؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شیخ نور محمد ''نقو ٹوپیاں والے'' مشہور تھے، لکھا جاتا تو یہ، نہ کہ خیاط...... یہ حضرات بھول جاتے ہیں کہ ''ٹوپیاں والے'' ان کا عرف ہے، پیشہ نہیں۔ وہ پیشہ کے لحاظ سے خیاط تھے اور یہی اندراج ہونا چاہیے تھا''۔[2]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس کس طرح ان اصحابِ فہم وفراست کی ''عقلمندی'' کا اشتہار لگایا جارہا ہے۔ چلیں یہ اندراج اگر آپ کی طبع نازک پر اتنا گراں گزر رہا ہے تو کوئی بات نہیں مگر اس طرح اس کو مسترد کرنے کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ مذاق ہی بن جائیں۔ اگر پسند نہیں تو اس قدر فرمانا کافی ہوتا کہ ٹوپیوں کا کاروبار ہونے کی وجہ سے شاید غلطی سے خیاط لکھ دیا گیا۔ زیادہ عقلمند بنتے ہوئے کون کون سی برادریوں کو اس میں شامل کر لیا گیا۔ بڑے اور چھوٹے یک زبان ہو کر حلفیہ بیان داغ رہے ہیں کہ یہ بالکل غلط ہے، یہ بالکل جھوٹ ہے، میاں جی نقو کبھی بھی خیاط نہیں تھے، وہ تو برقعوں کی ٹوپیاں سیتے تھے یا بناتے تھے۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ یہ کام کس طرح کیا جاتا ہے اور جو یہ کام کرتا ہے وہ کیا کہلاتا ہے۔ کپڑے سے برقعے کی ٹوپیاں بنانے یا سینے والے کو اگر ''خیاط'' نہیں کہا جائے گا تو کیا ''زرگر'' یا ''آہن گر'' کہیں گے؟

حال ہی میں ڈاکٹر وحید قریشی اور زاہد منیر عامر نے ایک کتاب اس سلسلے میں ترتیب دی ہے جو ''علامہ اقبال کی تاریخ ولادت'' کے عنوان کے تحت بزمِ اقبال لاہور ہی نے شائع کی ہے۔ اس میں اب تک کی تقریباً تمام تحقیق جو اس موضوع یعنی ''ولادتِ اقبال'' کے سلسلے میں منظرِ عام پر آ چکی ہے، کو یکجا کر دیا گیا ہے اور کوئی حتمی نتیجہ اخذ کر کے حضرت علامہ کی بالکل درست تاریخ ولادت کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ گو اس میں کوئی خاص کامیابی مرتبین کو

نہیں ہوئی مگر پھر بھی انہوں نے تمام حقائق اور مباحث کو یکجا کر کے یہ اہتمام ضرور کر دیا ہے کہ آئندہ کا محقق اس سلسلے میں کسی گمراہی کا شکار نہ ہو سکے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ متذکرہ کتاب میں کون سی تاریخ ولادت کے متعلق زیادہ مدلّل بحث کی گئی ہے اور آئندہ اس سلسلے میں کیا کیا مزید حقائق و دلائل منظرِ عام پر آنے کا امکان ہے۔ میں تو یہاں صرف چند اقتباسات نذرِ قارئین کرنا چاہوں گا جن کی روشنی میں ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) اور گزشتہ صفحات پر پیش کردہ حقائق کے ضمن میں بڑی اچھی رہنمائی ملتی ہے اور میرے مبنی بر حق موقف کی پرزور حمایت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کا نکتہ نگاہ دیکھیے:

''اقبال درونِ خانہ وہ پہلی کتاب تھی جو علامہ کے اہلِ خاندان میں سے کسی نے علامہ کے ذاتی معاملات کے متعلق پیش کی اور چونکہ خالد نظیر صوفی صاحب پیشہ ور مصنف نہیں تھے جو صرف اپنا نام اچھالنے کے لیے خود اپنے خاندان کے افضل ترین بزرگ کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کرتے۔ ان کی فراہم کردہ معلومات نیک نیت طالبِ علم کو اور بھی زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوئیں''۔[1]

پروفیسر حمید احمد خان صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ نہ صرف تاریخِ ولادت بلکہ ''اقبال درونِ خانہ'' کے دوسرے مندرجات کے متعلق بھی ایک بے لاگ تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں اور معترضین کے لیے لمحہ فکریہ کا حکم بھی رکھتے ہیں۔ اسی طرح تاریخِ ولادت کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا فرمانا ہے:

''اس موضوع پر سب سے مفصل بحث ''اقبال درونِ خانہ'' کے مصنف خالد نظیر صوفی نے کی ہے اور میونسپل کمیٹی کے ریکارڈ کی دوبارہ چھان پھٹک کر کے بحث کو ایک نئی شکل دی ہے''۔[2]

اسی طرح سید نذیر نیازی ۷ دسمبر ۱۹۷۲ء کو اپنی ایک رپورٹ جو انہوں نے اس وقت کے بزمِ اقبال لاہور کے معتمدِ اعزازی پروفیسر عثمان کو پیش کی' میں یوں حقائق بیان فرماتے ہیں:

''حاصل اس ساری کدوکاوش کا یہ ہے کہ حضرت علامہ کا سالِ ولادت ۱۸۷۳ء ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔

بوجوہ ذیل:

۱۔ ''اندرونِ خانہ' (اقبال درونِ خانہ) میں جو تاریخِ ولادت (۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء) دی گئی ہے' ٹھیک ہے۔ بلدیہ کے رجسٹروں سے اس کے اندراجات کا مقابلہ کیا تو حرف بحرف صحیح پایا''۔[3]

ان تصریحات کے بعد اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ تحقیق کے عمل کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ البتہ اس عملِ مسلسل کا منتہائے نظر صرف اور صرف تحقیق ہونا چاہیے' ذاتی عناد نہیں۔ کیونکہ اس کے جاری رہنے سے کئی ایسے پوشیدہ حقائق بے نقاب ہو جایا کرتے ہیں جن تک رسائی شاید کبھی بھی ممکن نہ ہو سکتی۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

(بالِ جبریل)

سب سے آخر میں دو حقیقت افروز اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں جن پر کسی قسم کے تبصرے یا ان کے تجزیے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ دونوں اصحابِ فہم کے لیے تازیانے کا حکم رکھتے ہیں۔

۱۔ ''یہ بات غلط ہے کہ میری والدہ عمر میں علامہ یعنی میرے ابا جان سے بڑی تھیں۔ بلکہ ایک سال عمر میں چھوٹی تھیں''۔

(آفتاب اقبال صاحب کا انٹرویو مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء)[۱]

۲۔ ''کریم بی بی[۲] ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کو گجرات شہر کے محلّہ کٹڑہ شالباقاں میں پیدا ہوئیں''۔[۳]

ع ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے''

مقامِ عشق و مستی منزلِ اوست
چہ آتش ہا کہ در آب و گِلِ اوست
نوائے او بہ دل سازگار است
کہ در ہر سینہ قاشے از دلِ اوست

(ارمغانِ حجاز)

مقامِ اقبالؒ

خودنوشتِ اقبال کی روشنی میں

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ بیسویں صدی ہر لحاظ سے "اقبال صدی" تھی اور قرائن بتا رہے ہیں کہ آئندہ کئی صدیاں انشاء اللہ "اقبال شناسی" ہی کے لیے وقف رہیں گی کیونکہ آج نوجوان نسل جس طرح اقبالؒ کے پیغام میں والہانہ دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے، اسے ایک نیک شگون کے طور پر دیکھنا چاہئے کیونکہ کلامِ اقبالؒ درحقیقت تفسیرِ قرآن ہے اور قرآنی تعلیمات سے نئی نسل کی یہ رغبت اطمینان ہی نہیں، باعثِ انبساط بھی ہونی چاہئے۔ عصرِ حاضر قبل از اسلام کے تاریک دور سے کسی طور مختلف نظر نہیں آ رہا۔ اس کی تہذیب اسی طرح ظلمتوں میں ڈوبی ہوئی اور ثقافت، روح و اخلاق کے لیے انتہائی تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔ ہمارے نظریات، ہماری روایات، فنون و ادب اور سب سے بڑھ کر یہ ننگِ انسانیت جدید ثقافتی سرگرمیاں، تقلیدِ مغرب میں پھر اسی جہالت کے خوفناک اندھیروں میں ڈوبتی چلی جارہی ہیں جو دور سے دیکھنے پر بہت دلآویز بلکہ فردوسِ نظر ہے مگر اس کے اس پار تہذیب وتمدن کا کوئی وجود نہیں اور اس نام نہاد ترقی کے علم بردار تنزل کے اس قعرِ مذلت میں گرتے ہی چلے جا رہے ہیں جس کی دلدل سے نکلنا ان کے بس میں نہیں رہے گا۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اس صورتِ حال کا خوب تجزیہ فرمایا ہے۔

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

(بانگِ درا)

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی شاعری درحقیقت ایک پیغامِ خاص کی حامل ہے جس کو پوری انسانیت بالخصوص امتِ مرحومہ تک پہنچانے کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس پیغام کو جو یقینی طور پر امرِ ربی تھا، انسان تک پہنچانے کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا اس لیے لیا کہ اس دور میں بلکہ ہر دور میں سب سے مؤثر ذریعہ مانا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف دماغ بلکہ انسان کے دل تک رسائی آسان ہے۔ اقبالؒ اس میں کہاں تک

کامیاب رہے اس کے متعلق اب کسی بحث کی شاید ضرورت نہیں کیونکہ یہ اب ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اس پیغام کو منتقل کرنے کے لیے شاعری کا انتخاب بالکل درست تھا۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ بھی دراصل امرِ ربی ہی تھا اور یہ سب کچھ توفیقِ الٰہی اور اس کی عطائے خاص کی وجہ سے ممکن ہوا۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی آفاقی اور الہامی شاعری کے متعلق ان کی اپنی زبانی ثبوت ملتا ہے:

الہامِ لفظی

''ایک دفعہ کا ذکر ہے فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس تھا جس میں علامہ بھی مدعو تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے علامہ سے کہا کہ آپ اجلاس اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد ذرا ٹھہریئے گا' مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لوکس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد علامہ کے پاس آئے اور سوال کیا کہ آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبی ﷺ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا' جسے وہ ﷺ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے یا الفاظ بھی نازل ہوتے تھے؟ علامہ نے صاف جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتی تھی یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہامی ہیں۔ ڈاکٹر لوکس نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا آپ جیسا عالی پایہ فلسفی Verbal Inspiration (الہامِ لفظی) پر کیوں کر اعتقاد رکھ سکتا ہے۔

علامہ نے ارشاد فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب! میں اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں۔ محض شاعر ہوں۔ جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں اور میں انہیں بعینہ نقل کر لیتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان اشعار میں کوئی ترمیم کرنا چاہی لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں رکھا۔ جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے تو اس میں کیا مقامِ تعجب ہے کہ آنحضرت ﷺ پر قرآن کی پوری عبارت لفظ بلفظ نازل ہوتی تھی؟''

اس پر ڈاکٹر لوکس لاجواب ہو گئے"۔[1]

ایک اور ایمان افروز واقعہ دیکھیے۔

"میاں شیر محمدؒ کے حضور

یہ اسی جذبے کی سچائی کا اثر تھا کہ اقبال کی قدر و منزلت ان بزرگوں کے دلوں میں زیادہ تھی جو ایک ہی نظر میں اہلِ نظر کو پہچان لیتے ہیں اور ان میں ایک حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ بھی تھے' جو اس دور کے مشہور اور قابلِ احترام بزرگ تھے۔ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر واقع قصبہ شرقپور میں ان کا قیام تھا۔ جہاں ہزاروں عقیدت مند روزانہ دور دراز کی مسافتیں طے کر کے حاضری دینے کے لیے آتے تھے۔ ان کی نیک نامی اور پرہیزگاری کا چرچا عام تھا۔ مستجاب الدعوات بزرگ تھے اور صرف ان ہی لوگوں کو اپنی صحبت میں بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے جو شریعت کے پابند ہوں۔ (راقم کے والدِ بزرگوار محمد شفیع ان کے حلقہ مریدین میں سے ہیں۔ وہ چشم دید گواہ ہیں کہ میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے قریب صرف وہی لوگ بیٹھ سکتے تھے جو باریش ہوں)۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ علامہ پر کفر کا فتویٰ لگ چکا تھا۔ علامہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد مریدینِ باصفا نے اعتراض کیا کہ یا حضرت! اقبال تو کلین شیو تھے اور آپ داڑھی نہ رکھنے والوں کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے' اس کے برخلاف آپ نے ان سے دیر تک باتیں کیں اور ان کے لیے خصوصی دعا بھی کی۔ حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ نے فرمایا: "تم لوگ نہیں جانتے اقبال کے پیٹ میں داڑھی ہے۔ میرے نزدیک اقبال جیسا شخص جو لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب کو اپنے ایمان و عمل سے روشن کر رہا ہو ضروری نہیں کہ وہ باریش بھی ہو"۔[2]

مندرجہ بالا دونوں واقعات حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے مقام کا ہلکا سا پرتو دکھاتے ہیں مگر "اقبال درونِ خانہ" حصہ اول میں ان کے اصل مقام کے متعلق ایک بالکل واضح اشارہ شامل کیا گیا تھا جس کے راوی والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی تھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مقامِ اقبالؒ

''یہ ۱۹۳۱ء کا ذکر ہے' میں گرمیوں کی تعطیلات میں کشمیر گیا ہوا تھا۔ سرینگر میں جس جگہ میرا قیام تھا' اس سے نزدیک ہی عید گاہ کے میدان میں ایک خدا رسیدہ عارف' بڑے باشرع اور پرہیزگار بزرگ کا ڈیرہ تھا۔ ان کی عمر اس وقت تقریباً ۸۰ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دن رات اپنے حال میں مست عبادت الٰہی میں مشغول رہتے اور لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ میں ان دنوں ۱۷یا ۱۸ برس کا تھا اور مجھے بھی ان ایام میں چلہ کشی کا بے حد شوق تھا۔ اس لیے ایک روز ایک عزیز کے ہمراہ اس مردِ خدا مست سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے ان کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے فرمایا: ''جاؤ بھائی جاؤ! پہلے ہی ہمارے پاس کیا بچا ہے کہ اب اس نے تمہیں بھیج دیا ہے''۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں کسی کا بھیجا ہوا نہیں آیا بلکہ خود ہی حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ وہ بولے: ''نہیں سمجھے ...... اس تمہارے اقبال کا ذکر ہے''۔ میں بڑا حیران ہوا مگر خاموش بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولے: ''نہیں سمجھے ...... بھائی! ہمارے پاس کیا ہے' اسی کے پاس جاؤ۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ کبھی خدا ہمارے پاس ہوتا ہے اور کبھی ہم خدا کے پاس' مگر اس کے پاس خدا ہر وقت ہوتا ہے' یعنی خدا اور وہ دونوں ایک ہو گئے ہیں ...... ہم تو کسی کو کچھ دکھانے یا بتانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ مگر اس کو تمام طاقتیں حاصل ہیں''۔ میں خاموشی سے ان کے ارشادات سنتا رہا۔ پھر میں نے ان خدا رسیدہ بزرگ سے پوچھا کہ ''آج کل ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی ابتر حالت ہے اور یہ قانونِ فطرت ہے کہ جب مسلمانوں کی پستی کی انتہا ہو جائے تو ایک مجدد بھیجا جاتا ہے ..... وہ کب آئے گا؟'' وہ بزرگ فوراً اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوئے: ''نہیں سمجھے' تم اب تک نہیں سمجھے' بھائی! تمہیں بتا تو دیا ہے کہ وہی سب کچھ ہے' اسی کے پاس جاؤ''۔!

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کی اشاعت کے بعد کچھ احباب نے اس واقعہ سے اختلاف کیا۔ شاید وہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے مقامِ بلند کو سمجھ نہ سکے۔ میرے پاس ان استفسارات کا کوئی شافی جواب موجود نہیں تھا کیونکہ میرے والد ۱۹۸۷ء میں انتقال فرما چکے تھے۔ مگر خوش قسمتی سے حال ہی میں علامہ علیہ الرحمۃ کا ایک بڑا مفصل مراسلہ

مختلف مجموعوں میں شائع ہوا ہے جو انہوں نے ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو اپنے والدِ گرامی قدر کو تحریر فرمایا۔ جس میں انہوں نے کشمیر سے ایک پیرزادہ صاحب کی آمد کا تذکرہ فرماتے ہوئے ''میاں جی'' کو متذکرہ پیرزادہ صاحب کے بیان کردہ واقعات پوری تفصیل سے تحریر کیے ہیں کہ کس طرح نبی اکرمؐ کے دربار میں علامہ صاحب کے مقامِ خاص کے متعلق پیرزادہ صاحب کو کشف ہوا اور وہ اس کی سچائی جاننے کے لیے کس طرح کشمیر سے لاہور وارد ہوئے۔ ذیل میں مذکورہ بالا مراسلہ من و عن پیش کیا جا رہا ہے اور امید ہے کہ معترضین کے لیے حضرت مجدّدالعصرؒ کی خود نوشت باعثِ تشفی ہو گی۔

دربارِ نبوت میں مقامِ خاص

''لاہور ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء

قبلہ و کعبہ ام! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

قریباً چار ماہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے ایک گمنام خط آیا جس کا مضمون یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے جس کا تم کو کچھ علم نہیں۔ اگر تم فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تم کو بھی اس کا علم ہو جائے گا۔ وہ وظیفہ خط میں درج تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ وہ خط گمنام تھا' اس کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ اب وہ خط میرے پاس نہیں ہے۔ معلوم نہیں ردی میں مل ملا کر کہاں چلا گیا۔

پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس کی عمر قریباً تیس پینتیس سال کی ہو گی۔ شکل سے شرافت کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو سے ہوشیار' سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی گفتگو کرے' مجھ کو دیکھ کر بے اختیار زار و قطار رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ شاید مصیبت زدہ ہے اور مجھ سے کوئی مدد مانگتا ہے۔ استفسارِ حال کیا تو کہنے لگا کہ کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی' اب میں ان کی پنشن کھا رہا ہوں۔ رونے کی وجہ خوشی ہے' نہ غم۔ مفصل کیفیت پوچھنے پر اس نے کہا کہ نوگام میں جو میرا گاؤں سرینگر کے قریب ہے' میں نے عالمِ کشف میں نبی کریم ﷺ کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو حضور سرورِ کائنات ﷺ نے پوچھا کہ محمد اقبال آیا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ محفل میں نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے واسطے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک

جوان آدمی جس کی داڑھی منڈھی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا مع ان بزرگ کے صفِ نماز میں داخل ہو کر سرورِ کائنات ﷺ کے دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں آپ کی شکل سے واقف نہ تھا' نہ نام معلوم تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ مولوی نجم الدین صاحب ہیں جن کے پاس جا کر میں نے یہ سارا قصہ بیان کیا' تو انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی۔ وہ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعہ جانتے ہیں۔ گو انہوں نے آپ کو کبھی دیکھا نہیں۔ اس دن سے میں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ سے ملوں گا۔ سو محض آپ کی ملاقات کی خاطر میں نے کشمیر سے سفر کیا ہے اور آپ کو دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا اس واسطے آیا کہ مجھ پر میرے کشف کی تصدیق ہو گئی کیونکہ جو شکل آپ کی میں نے حالتِ کشف میں دیکھی' اس میں سرِ مو فرق نہ تھا۔ اس ماجرا کو سن کر مجھ کو معاً وہ گمنام خط یاد آیا جس کا ذکر میں نے اس خط کی ابتدا میں کیا ہے۔ مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح نہایت کرب و اضطراب کی حالت میں ہے کہ میں نے کیوں وہ خط ضائع کر دیا۔ اب مجھ کو وہ وظیفہ یاد نہیں' جو اس خط میں لکھا تھا۔ آپ مہربانی کر کے اس مشکل کا کوئی علاج بتائیں کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے متعلق میں نے جو کچھ دیکھا ہے' وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ میرے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فضل ضرور ہے کہ دعا کا ہی نتیجہ ہو لیکن اگر حقیقت میں پیرزادہ صاحب کا کشف صحیح ہے تو میرے لیے لاعلمی کی حالت سخت تکلیف دہ ہے۔ اس کا یا تو کوئی علاج بتائیے یا مزید دعا فرمائیے کہ خدا تعالیٰ اس گرہ کو کھول دے۔

محمد اقبال''!

مندرجہ بالا تحریر کے بعد کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہیں رہنا چاہئے۔ جو اصحاب حضرت علامہؒ کو اب تک محض ایک شاعر ہی خیال فرماتے ہیں اور ان کے اس پیغامِ خاص سے انکار کرتے ہیں جو بارگاہِ الٰہی سے انہیں تفویض ہوا اور مجدّد العصر کی حیثیت میں امتِ مرحومہ تک انہوں نے پہنچایا۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت علامہؒ عارض و گیسو کے شاعر نہیں تھے بلکہ انہوں نے روایتی شاعری کو عشقِ مجازی کے تعفن سے نکال کر عشقِ حقیقی کی پرفضا اور معطر وادی میں پہنچایا اور انسانیت کو اس معراج تک رسائی نصیب ہوئی کہ...... ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے'' ......

درحقیقت شاعری تو محض ایک ذریعہ تھی جسے اس دور کی ضرورت کے مطابق اختیار کیا گیا۔ علامہ علیہ الرحمۃ خود فرماتے

ہیں۔

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ!

(بال جبریل)

ایک اور جگہ فرمایا۔

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر و جذب و سرور!

(ضربِ کلیم)

کلامِ اقبال کے تفسیرِ قرآن ہونے میں اب کوئی شک باقی نہیں رہا' اسی لیے جسٹس ایم آر کیانی نے فرمایا:

''اقبالؒ کی شاعری قرآن کی آیات سے مملو ہے' پڑھنے والوں کے علاوہ سننے والوں کو بھی باوضو ہونا چاہیے''۔[1]

آج بڑے بڑے علمائے دین کی تقاریر اور تفاسیر مکمل نہیں ہوتیں' جب تک فرموداتِ اقبال کا حوالہ شامل نہ کیا جائے۔ اشعار میں ہی نہیں بلکہ اپنی نثر میں بھی علامہ علیہ الرحمۃ نے قوم کو یہی باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ محض ایک شاعر نہیں ہیں۔ بین السطور انہوں نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے' اس تک اگر ہم ابھی تک نہیں پہنچ سکے تو یہ ہماری کوتاہ بینی ہے۔

چند مثالیں نثر کی بھی دیکھیے..... مولانا گرامی کے نام ایک مکتوب میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''تعجب ہے کہ لوگ مجھے شاعر سمجھ کر مجھ سے شعر کی فرمائش کرتے ہیں حالانکہ مجھے شاعری سے کچھ سروکار نہیں''۔[2]

اسی طرح سید سلیمان ندوی کے نام بھی ایک مراسلے میں ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کو ذرا تفصیلاً اسی موضوع پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی' ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے' ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
(زبورِ عجم)[1]

اسی طرح ایک دوسرے مراسلے سے چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری ہر گز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانہ کے شعراء میں میرا شمار ہو''۔[2]

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی مندرجہ بالا تحریریں دیکھنے کے بعد بھی انہیں محض ایک شاعر سمجھنا کسی طور درست نہیں۔ انہوں نے پوری زندگی قرآن وحدیث کا پیغام امتِ مرحومہ تک پہنچانے کے لیے وقف کردی تاکہ ملتِ اسلامیہ ایک بار پھر دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کرے۔ ماننا پڑے گا کہ اس بندۂ خاکی نے عشقِ حقیقی کا حق ادا کردیا۔

مقامِ بندگی دیگر مقامِ عاشقی دیگر!!
زنوری سجدہ میخواہی ز خاکی بیش از آں خواہی
(زبورِ عجم)

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر

(ضربِ کلیم)

ایک ہوں مسلم

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا پورا کلام سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک ایک مصرعہ موتیوں میں تولا جائے تو بھی کم ہے۔ دنیا کا وہ کون سا موضوع ہے جس پر کلامِ اقبال میں اظہارِ خیال نہیں کیا گیا اور جس جس طرح زندگی کی سچائیوں کا احاطہ کیا گیا، عقلِ انسانی دنگ اور نطق زباں گنگ رہ جاتی ہے۔ صرف دو مصرعوں میں وہ کہہ دیا کہ دفتروں کے دفتر ہیچ ہیں۔ ایسی ایسی پیش گوئیاں کہ ان کے پورا ہو جانے کے بعد بھی یقین نہیں آتا۔

''بانگِ درا'' میں ''دنیائے اسلام'' کے تحت یہ اشعار دیکھئے۔ ایک ایک مصرعے کے اندر معانی و معارف کا سحر بیکراں موجزن، ایسی ژرف نگاہی، دین و سیاست کی اتنی عمیق تحقیق؟

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات\
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر\
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو\
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر\
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے\
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!\
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا\
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر!\
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی\
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر!\
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار\
لا کہیں سے ڈھونڈھ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نہ شناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ ہر شعر اپنی اپنی جگہ ایک دنیائے معانی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اور فکر و عمل کی ان گنت راہوں کی نشاندہی کر رہا ہے مگر یہاں جس خاص راہِ عمل کی نشاندہی مقصود ہے وہ ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر!

چند برس قبل تک جب بھی یہ شعر نظر سے گزرا اسے ایک دعائیہ التجاہی خیال کیا کہ حضرت علامہؒ بارگاہِ خداوندی میں بڑی درمندی کے ساتھ ملتجی ہیں کہ اے خداوند! مسلمانوں کو متحد کر دے ان کو اس طرح اتحاد کی زنجیر میں پرو دے کہ یہ حرمِ کعبہ کی پاسبانی 'تیرے گھر کی نگہبانی اور تیرے دین کی سربلندی کے لیے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ اپنے تمام اختلافات ختم کر کے یہ اسلامی مساوات کی ایک زندہ مثال قائم کر دیں اور پھر دنیا میں سربلندی ان کا مقدر بنے۔ غیروں پر تکیہ کرنا چھوڑ کر یہ خود اپنے مقدر کے سکندر بن جائیں۔

مگر ابھی کچھ ہی عرصہ قبل جب وسطی ایشیائی مسلم ریاستوں نے اشتراکیت سے نجات حاصل کر کے دوبارہ اپنی آزادانہ حیثیت برقرار کر لی تو متذکرہ شعر کا دعائیہ انداز یکسر تبدیل ہو گیا اور ایک بالکل نئی اور مختلف جہت کی نشان دہی ہونے لگی کیونکہ ایشیا کی وہ عظیم قوت جو بیسویں صدی کے آغاز میں ایک دیو کی مانند نمودار ہوئی تھی اور جس نے بے شمار انسانوں اور ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' خاص طور پر اس بے قابو طاقت نے وسطی ایشیائی اسلامی ریاستوں کو اپنے پنجۂ استبداد میں یوں جکڑ لیا تھا کہ ان کا اپنا کوئی تشخص باقی نہ رہا۔ وہ تاشقند و بخارا جس کو کبھی اسلام کا گہوارا سمجھا جاتا تھا اور جہاں کے عظیم علماء اور اصفیاء نے اسلام کو چار چاند لگانے اور پوری دنیا میں پھیلانے میں بھرپور کردار ادا کیا' قصۂ پارینہ بن گئے۔ وہ دنیا کے نقشے سے اس طرح غائب کر دی گئیں کہ ان کا کوئی وجود ہی نہ رہا۔ عام طور پر لوگ فراموش کر بیٹھے کہ کبھی کوئی اسلامی ریاست دنیا کے اس خطے میں وجود بھی رکھتی تھی۔ ایک آہنی پردہ اس طرح ان پر تان دیا گیا کہ وہ صرف ''سوویت یونین'' (U. S. S. R) کے نام سے ہی پہچانی جانے لگیں۔ ان کا اپنا کوئی تشخص باقی نہ رہا۔

لیکن شاید کسی نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ صرف ستر برس بعد وہ منہ زور طاقت جو کسی کو در خور اعتنا نہ سمجھتی تھی اور جس نے اس وسیع و عریض خطے کے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم نہ ڈھائے' ان پر مکمل غلبہ حاصل کرنے کے لیے کس طرح عرصہ حیات ان پر تنگ کر دیا اور وہاں اسلام کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے لیے کیا کیا جتن کیے ...... اس طرح زمین بوس ہو جائے گی ...... اور وہ بھی کس کے ہاتھوں؟ افغانستان پر چڑھائی کرتے وقت روس نے یقیناً یہی سوچا ہوگا کہ وہ حسبِ معمول جیسے اس نے وسطی ایشیائی اسلامی ریاستوں کو روند ڈالا تھا' ویسے ہی وہ اس طرف بھی بڑھتا ہی چلا جائے گا ...... اس کا راستہ کون روکے گا ...... افغانستان' پاکستان یا ایران' کس میں اتنا دم ہے۔ یہ سب بونے اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں ...... ان کو تو پرِ کاہ کی مانند اڑاتا ہوا اور راہ کی ان بالکل معمولی رکاوٹوں کو پھاندتا ہوا وہ چند روز میں شرقِ اوسط کی سرحدوں پر دستک دے رہا ہوگا اور گرم پانیوں تک رسائی کا وہ خواب جو وہ ایک طویل مدت سے دیکھ رہا تھا' یوں شرمندۂ تعبیر ہوگا کہ دنیا دنگ رہ جائے گی ...... مگر اسے کیا خبر تھی کہ وقت بدل چکا ہے اور قدرت کا فیصلہ اس کے خلاف صادر ہو چکا ہے کیونکہ ع

تدبیر کند بندہ ...... تقدیر زند خندہ

چنانچہ اس کے کس بل نکالنے کے لیے نظامِ قدرت حرکت میں آ گیا اور گرم پانیوں تک پہنچنے کا دیرینہ خواب اس طرح پراگندہ کر دیا گیا کہ اس سے برف پوش چوٹیوں کو عبور کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ افغانستان کے غیور مسلمانوں نے وہیں ان کا قبرستان بنا دیا۔ توفیقِ الٰہی سے پاکستان نے اپنے جانباز افغانی بھائیوں کو وہ حوصلہ اور ہمت دی اور قدرت کی مدد اس طرح شاملِ حال رہی کہ دنیا کی یہ عظیم طاقت جسے اپنی بے پناہ افواج اور جدید ترین اسلحہ و بارود پر بڑا مان تھا' اس طرح دھنکی گئی کہ ساری دنیا آج تک انگشت بدنداں ہے ...... اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دوہرایا اور اصحابِ فیل ایک بار پھر ابابیلوں کے سامنے بے بس ہو گئے اور بعینہ بھوسے کی طرح دھنک دیئے گئے ...... یہ خدائی فیصلے ہیں' اس لافانی طاقت کے سامنے دنیاوی طاقتوں کی کیا حیثیت ......؟

ہم ایک بار پھر حضرت علامہؒ کے اسی شعر کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ حقیقتاً یہ سب کچھ اس خدائی فیصلے ہی کی وجہ سے ہوا' جس کا اعلان کئی برس قبل یوں کیا گیا تھا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

یہ عقدہ اب واہوا کہ یہ شعر کسی طور دعائیہ یا التجائیہ نہیں بلکہ خداوندِ قدوس کی جانب سے ملتِ اسلامیہ کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ حکمِ حاکم ...... بلکہ اگر اسے "آرڈر آف دی ڈے" (Order Of The Day) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا ...... اگر اس کو ذرا غور سے پڑھا جائے ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

تو آپ کو احساس ہوگا کہ یہ صرف ایک پیشگوئی ہی نہیں بلکہ قادرِ مطلق علامہ کے قلم سے پوری دنیا کے مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ ع

"ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے"

ذرا غور فرمائیں کس قدر جلال اور دبدبہ ہے ...... یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ایک عظیم قائد اپنی بے پناہ اور ہر طرف پھیلی ہوئی افواجِ قاہرہ کے لیے "آرڈر آف دی ڈے" کا اعلان فرما رہا ہے ...... حکمِ حاکم جس سے سرتابی کی مجال کسی کے بس میں نہ ہو کسی کے لیے کوئی عذر پیش کرنا ممکن نہ رہے ...... کون ہے جو اس اسلامی بلاک میں شمولیت سے انکار کر سکے گا' جو خدائے برتر کے حکم سے ہر روز بلکہ ہر لحہ اپنی منزل سے قریب سے قریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا میں پھیلے ہوئے تمام مخالفینِ اسلام ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور لگاتے رہیں گے کہ کسی طرح مسلمان متحد نہ ہو سکیں ...... کیا کیا چالیں چلی جا رہی ہیں اور کیسے کیسے مسلمانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے ...... اگر دو یکجا ہوتے ہیں تو چار ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ...... مگر کب تک' کیونکہ جو فیصلہ ہو چکا' اس نوشتۂ دیوار کو ختم کرنا اب کسی کے بس میں نہیں ......

تمام رکاوٹیں خود بخود دور ہو رہی ہیں اور انشاء اللہ پوری طرح ختم کر دی جائیں گی کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اب اس بلاک کو معرضِ وجود میں آنے سے نہیں روک سکتی ...... بقول علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ۔

سفر آمادہ نہیں منتظرِ بانگِ رحیل
ہے کہاں قافلۂ موج کو پروائے جرس!

(ضربِ کلیم)

اگر کوئی کوشش ہوگی تو اس کا انجام وہی ہوگا جو سوویت یونین کا ہوا۔ اگر کسی کو اپنی طاقت کا زعم ہے تو اس کو روس سے عبرت حاصل کرنا چاہئے۔ یہ اتنی زیادہ پرانی بات نہیں' جب ۱۹۸۰ء میں سوویت یونین نے افغانستان میں دخول کیا تو یہاں پاکستان میں اکثریت کا کیا حال تھا۔ یہی کہا جارہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان بھی خدانخواستہ' ان کے زیرِنگیں ہوگا۔ مگر خدا نے کس طرح ''ممولے'' سے شہباز کو شکستِ فاش دلائی اور ایک بے سروساماں قوم نے صرف اپنے جذبہ ایمانی کی بدولت دنیا کی ایک عظیم قوت کا غرور خاک میں ملادیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ ع

تکبر عزازیل را خوار کرد

اور اس طاقت کا شیرازہ یوں بکھرا کہ دنیا کے نقشے سے سوویت یونین کا وجود ہی ختم ہوگیا ۔

اس دور میں بھی مردِ خدا کو ہے میّسر
جو معجزہ پربت کو بنا سکتا ہے رائی!

(ضربِ کلیم)

کیا یہ تمام معجزات اسی اسلامی بلاک کی طرف پیش قدمی کے مترادف نہیں ...... واقعتاً وسطی ایشیائی ریاستوں کی آزادی انہی واقعات کا تسلسل ہے' جن کی ابتدا قیامِ پاکستان سے ہوچکی اور جس طرح اب یہ ریاستیں پاکستان' افغانستان اور ایران کے ساتھ ایک لڑی میں آہستہ آہستہ پروئی جارہی ہیں' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ذرائع آمدورفت باوجود ساری دنیا کی مخالفت کے جس طرح قائم ہوتے جارہے ہیں' اس کی کھلی دلیل ہے کہ اب اس عمل کو روکنا کسی دنیوی طاقت کے بس کی بات نہیں۔ بڑی راستہ روکنے کی تمام تر کوششیں ہوچکیں مگر یہ ہر رکاوٹ کو توڑتا ہی چلا جارہا ہے۔ رفتار کو قدرے سست ہے کیونکہ ہر ممکن روڑا اس میں اٹکایا جارہا ہے مگر اس کو روکا نہیں جاسکا۔ وہ قدم قدم اپنی منزل کی طرف بڑھتا جارہا ہے اور منزل پر پہنچ کر ہی اب دم لے گا انشاءاللہ! تمام حربے ناکام ہوتے دیکھ کر ابھی حال ہی میں ایٹمی قوت سے دھمکانے کی بھی کوشش کی گئی کہ کسی صورت اس کی پیش رفت پر بند باندھا جائے۔ قدرت نے ان کے اس حربے کا الٹا نتیجہ نکال دیا اور اسلام کو بھی ایٹمی قوت سے مزید تقویت عطا فرمادی اور اسلامی بلاک کی منزل مزید قریب اور یقینی نظر آنے لگی۔ یہ ساری باطل قوتیں' دنیا کے تمام مشرکین جتنا زور لگا سکتے ہیں لگالیں مگر خدائے واحد کے سامنے ان کی اب ایک نہیں چلے گی کیونکہ اس پیش گوئی ...... اس حکمِ حاکم کے پورا ہونے کا وقت اب بالکل قریب آ

چکا ہے ..... غلبۂ اسلام اب ہو کر رہے گا اور دنیائے اسلام کو دنیا کا طاقتور ترین بلاک بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا کیونکہ خدائی فیصلے تبدیل کرنا ممکن نہیں۔ سوویت یونین تو اس کوشش میں پاش پاش ہو چکا۔ اب دوسری کی باری ہے۔ یہود و ہنود اور اسی قبیل کے دوسرے شیطان اس سے بھی بدتر انجام کے لیے تیار رہیں کیونکہ ظلم کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور خدا کا فیصلہ ان سب کے خلاف صادر ہو چکا ہے ..... ان کو بچانے والا کوئی نہیں کیونکہ ان سب کا منطقی انجام اب نوشتۂ دیوار ہے ..... قدرتِ مطلقہ کے فیصلے سے ان کا بچ نکلنا کسی طور ممکن نہیں اور وہ دن اب دور نہیں جب پوری دنیا دیکھے گی کہ۔

ایک "ہیں" مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر!

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے مندرجہ بالا شعر یورپ سے مراجعت کے بعد لکھا ہو گا کیونکہ "بانگِ درا" میں یہ ۱۹۰۸ء کے بعد کے کلام میں شامل ہے۔ یعنی تقریباً نوے برس قبل ان کو یہ القا ہوئے اور آج کی صورتِ حال کے پیشِ نظر انشاءاللہ ایک صدی گزرنے سے پیشتر اس میں شامل پیش گوئیاں حرف بحرف سچ ثابت ہو کر رہیں گی اور خدائے بزرگ و برتر کا وہ فیصلہ جس کا اظہار اس کے ذریعہ ہوا نافذ ہو کر رہے گا۔ کیونکہ اقبال کی آفاقی اور الہامی شاعری کے ذریعے یہی نہیں اور بہت سی پیشگوئیاں کی گئیں جو لفظ بہ لفظ پوری ہوئیں۔ یہاں دو ایک کا ذکر باعثِ دلچسپی ہو گا۔ مثلاً دوسری عالمی جنگ سے پیشتر کہے گئے مندرجہ ذیل اشعار:۔

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں پہ ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

جب یورپی اقوام پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ پورا افریقہ، مشرقِ وسطیٰ، چین، جنوب مشرقی ایشیا اور پورا ہندوستان ان کے قبضے میں تھا، وہ کس طرح فرما رہے ہیں کہ میری نگاہ آنے والا اسلامی دور اور اہلِ فرنگ کی تباہی دیکھ رہی ہے اور یہ سب حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ اسی طرح اندازاً ۱۹۲۷ء کے قریب لکھا گیا مندرجہ ذیل "زبورِ عجم" میں شامل شعر۔

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند

دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

یعنی ''میں تمہارے قید خانے کی دیوار کے روزن سے دیکھ رہا ہوں کہ ایک مرد آنے والا ہے جو غلاموں کی زنجیریں توڑ دے گا''۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی دوررس نگاہ نے تقریباً بیس برس پیشتر وہ سب کچھ مشاہدہ کر لیا جو ۱۹۴۷ء میں وقوع پذیر ہوا۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کی آنکھ حرم کی پاسبانی کے لیے مسلمانوں کا متحد ہونا بھی دیکھ چکی ہے۔

نگاہ وہ نہیں جو سرخ و زرد پہچانے

نگاہ وہ ہے کہ محتاج مہر و ماہ نہیں

(ضربِ کلیم)

آج کون ہے جو اقبالؒ کی ژرف نگاہی کا انکار کر سکے کیونکہ نہ صرف ان کی شاعری بلکہ اقبالؒ کی زندگی بھی ایسی ہی سچائیوں سے عبارت تھی۔ انہوں نے اپنے ایک مراسلے میں اپنے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ قلم بند فرمائے تو یقیناً ان کی چشمِ بصیرت بہت گہرائی تک دیکھ رہی تھی۔ کیا ان کا فرمانا آج حرف بحرف سچ ثابت نہیں ہو رہا؟

''اگر میری روح کے عمیق ترین خیالات کبھی لوگوں پر ظاہر ہو جائیں' اگر وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن ضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور آنسوؤں کی شکل میں خراجِ عقیدت و تحسین پیش کرے گی''۔!

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند   جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے کس تفصیل سے اپنے بارے میں آنے والے وقت میں پیدا ہونے والی عقیدت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ کیا آج یہی صورتِ حال موجود نہیں؟ اس لیے اقبالؒ کے عمیق مشاہدے سے کسی صورت انکار ممکن نہیں۔ سچ تو یہی ہے کہ انہوں نے وہی کہا جو کچھ ان کو دکھایا گیا۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے

وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

باب چہارم

اقبال منزل (سیالکوٹ)
مولد و مسکنِ اقبالؒ

۱۔ تاریخ اور جغرافیہ

۲۔ میری اپنی اقبال منزل

۳۔ جب اقبال منزل پرائی ہوئی

۴۔ زبوں حال اقبال منزل

تاریخ

خاندانِ اقبال کے جدِ امجد جب ہجرت کر کے کشمیر سے وارد سیالکوٹ ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے محلّہ کھٹیکاں کو اپنا مسکن بنایا اور خاصا طویل عرصہ وہاں سکونت پذیر رہے۔ وہاں پر مکان کرایہ کا تھا۔ تقریباً ۱۸۶۱ء میں حضرت علامہ کے دادا شیخ محمد رفیق صاحب کو توفیقِ الٰہی سے اپنا ذاتی مکان محلّہ چوڑیگراں میں میسّر آیا۔ کہتے ہیں کہ اس سستے زمانے میں انہوں نے اس یک منزلہ مگر پختہ اینٹ سے بنے ہوئے مکان کی قیمت صرف -/۱۵۰ روپے ادا کی۔ اس وقت یہ ایک ڈیوڑھی، چھوٹا سا صحن، ایک دالان اور دو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ اقبال منزل کا یہ حصہ وہی ہے جس کی ایک کوٹھڑی میں، جو گلی کی طرف تھی اور ڈیوڑھی سے منسلک تھی، اس عظیم روح نے جنم لیا جس کی جائے ولادت کو دیکھنے کے لیے لوگ آج چاردانگِ عالم سے جوق در جوق حاضر ہوتے ہیں۔

جیسے جیسے خاندان میں اضافہ ہوا قدرت کی طرف سے ویسے ہی مکان کی وسعت کے لیے بھی انتظامات ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ اس توسیعی منصوبہ پر سب سے پہلا عمل دسمبر ۱۸۹۲ء میں ہوا جب اس مکان سے ملحقہ ایک دو منزلہ مکان مبلغ -/۴۰۰ روپے میں خریدا گیا۔ ابھی تک یہ مکان گلی کی طرف تھا اور اس کا صدر دروازہ محلّہ چوڑیگراں میں کھلتا تھا۔ توسیعی منصوبہ جاری رہا اور ۱۸۹۵ء میں بازار کی طرف دو دکانیں خریدی گئیں جن کو اپنے مکان میں شامل کرنے سے اب ایک راستہ بازار کی جانب بھی نکل آیا۔ انہی میں ایک دکان میاں جی کی تھی، جس میں وہ ٹوپیاں بنانے کا کام کرتے تھے۔ اب اس مکان کا صدر دروازہ محلّہ چوڑیگراں میں اور دوسرا راستہ دوکان میں سے ہو کر بازار چوڑیگراں میں نکلتا تھا۔ جیسے ذرا فراغت ہوئی، میاں جی نے ان دو مکانوں اور دو دکانوں کو ملا کر ایک دو منزلہ مکان تعمیر کروا لیا جو گھر کی ضروریات کے لیے بہت کافی ہو گیا۔ پختہ اینٹ سے بنوایا گیا یہ مکان ۱۹۱۰ء تک اسی حالت میں قائم رہا۔

۱۹۱۰ء میں نانا جان شیخ عطا محمد مرحوم جن کی ریٹائرمنٹ اب قریب تھی، رخصت قبل از پنشن پر تشریف لائے اور چونکہ خود سول انجینئر تھے اس لیے سب سے پہلے مکان کی تعمیر نو کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے لیے تمام نقشے[1] وغیرہ انہوں نے

جانے کب سے تیار کر رکھے تھے۔ چنانچہ انہوں نے رخصت پر آتے ہی سب سے پہلے پرانا مکان گروادیا اور اس کی جگہ موجودہ جدید طرز کی سہ منزلہ حویلی ایستادہ کر دی' جس میں اس دور کے مطابق ہر قسم کی سہولیات میئسر تھیں۔ بازار کی جانب بڑی خوبصورت لکڑی کی بالکنی بنوائی گئی جس کی وجہ سے سارے علاقے میں یہ حویلی ایک منفرد حیثیت کی حامل بن گئی۔ دوسری سہولتوں کے علاوہ اس میں صرف غسل خانے ہی آدھی درجن کے قریب ہیں اور کئی ایک کمروں کے ساتھ منسلک ہیں یعنی آج کے رواج کے مطابق انہوں نے اس وقت کمروں سے مسلکہ غسل خانے بنوائے' جب بہت کم گھروں میں غسل خانے بنانے کا رواج تھا۔ تب تک بازار کی طرف مکان کی لمبائی وہاں تک تھی جہاں سے اوپری منزل میں جانے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ تین دکانیں تھیں۔ نئے نقشے میں صدر دروازہ گلی ہی کی طرف رکھا گیا کیونکہ بے جی کا حکم یہی تھا' چنانچہ ڈیوڑھی اسی پرانی جگہ رکھی گئی جہاں شروع سے تھی اور اس کی مسلکہ کوٹھڑی کی جگہ پر بھی ایک ویسا ہی کمرہ بنایا گیا جس کی اب دو کھڑکیاں گلی میں کھلتی ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے جنم لیا۔ اس میں ردوبدل بہت کم ہوا اور یہ حصہ تقریباً اس پرانے مکان کے مطابق ہے جو سب سے پہلے ۱۸۶۱ء میں شیخ رفیق صاحب نے خریدا تھا۔

۱۹۱۵ء میں جب نانا جان قبلہ (شیخ عطا محمد مرحوم) ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر سیالکوٹ واپس آ گئے اور اپنی تعمیر کردہ حویلی ''اقبال منزل'' میں سکونت پذیر ہوئے' تو کچھ عرصہ بعد اقبال منزل سے ملحقہ ایک دکان انہوں نے خریدی اور اس ناپختہ یک منزلہ دکان کو گرا کر ایک سہ منزلہ! عمارت تعمیر کی اور بڑی چابکدستی سے اسے اقبال منزل سے منسلک کر دیا کہ یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ یہ حصہ مکان میں کافی بعد میں شامل ہوا ہے۔ البتہ اس کی بازار کی طرف والی بالکنی پہلے سے بنی ہوئی حویلی کی بالکنی سے چوڑائی میں قدرے زیادہ ہے' اس لیے وہ پرانی بالکنی سے تھوڑا آگے نکلی ہوئی آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں بالکنیوں میں دروازہ بھی لگایا گیا ہے جس کو بند کرنے سے دونوں کو علیحدہ علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ حصہ اوپری منزل میں آنے والی سیڑھی کے دوسری جانب ہے۔

اقبال منزل کو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی جائے پیدائش ہونے کا شرف تو حاصل ہے ہی' مگر اسے تعمیراتی لحاظ سے بھی ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کی تعمیر کچھ ایسی چابکدستی سے کی گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ عمارت کا ہر کونا کھدرا کسی نہ کسی مصرف میں لایا گیا ہے۔ اس کی تقسیم اور نقشہ جات شیخ عطا محمد صاحب نے خود تیار فرمائے اور زندگی کے

تجربے کانچوڑ اس کی تعمیر کے لیے بروئے کار لاکر اس کو ایک تعمیراتی شاہکار بنا دیا۔ اس زمانے میں چونکہ سیمنٹ وغیرہ کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ خاص خاص عمارتیں چونے! کچی مسالے سے تیار ہوتی تھیں کیونکہ یہ بڑا محنت طلب اور مہنگا کام تھا، مگر شیخ صاحب نے اقبال منزل کی پوری چنوائی اسی مسالے سے کروائی اور پوری حویلی کو اسی کے پلستر سے مضبوط بنایا۔ اگر صرف حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی جائے پیدائش کو دیکھ لینے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے اور اس کو پوری تفصیل اور گہرائی سے دیکھا جائے تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا اور بڑی عجیب وغریب چیزیں اس میں دیکھنے کو ملیں گی۔

جغرافیہ

جائے وقوع:

سیالکوٹ شہر۔علامہ اقبال سٹریٹ (سابقہ بازار چوڑیگراں)نزد چوک مسجد دو دروازہ۔

رقبہ:

پرانا حصہ	:	۷مرلہ
نیا حصہ	:	۲مرلہ
کل	:	۹مرلہ

سہ منزل کی کل بلندی	:	۵۰ سے ۶۰ فٹ
مسقّف	:	مکمل
کل کمرے	:	۱۵ + صحن وغیرہ
کل دوکانیں	:	۷

اقبال منزل مختلف مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ صورت تک پہنچتی ہے۔جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا مختلف ادوار میں علیحدہ علیحدہ حصے خریدے گئے اور بعد میں موجودہ صورت میں یکجا کیے گئے۔آئندہ صفحات میں مختلف ادوار میں ان اضافوں کو مختصر نقشوں کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(الف) وہ حصہ جو ۱۸۶۱ء میں خرید اگیا اس میں ایک ڈیوڑھی، صحن، دالان اور دو کوٹھڑیاں شامل تھیں: یہ مکان صرف -/۱۵۰ روپے میں خرید اگیا۔

(ب) وہ ملحقہ مکان جو ۱۸۹۲ء میں خرید اگیا اور قیمت اس وقت صرف -/۴۰۰ روپے ادا کی گئی۔

(ج) ۱۸۹۵ء میں بازار کی طرف دو دوکانیں خریدی گئیں۔

تینوں حصوں (الف ۔ب ۔ج) کو ملا کر ایک نیا مکان تعمیر کیا گیا جو ۱۹۱۰ء تک قائم رہا۔ (اس حصہ کا رقبہ سات مرلے کے برابر ہے)۔

جائے ولادتِ اقبالؒ

۱۸۶۱ء میں جو مکان صرف -/۱۵۰ روپے میں خرید اگیا، اس کی کوٹھڑی میں حضرت علامہ نے جنم لیا جو ڈیوڑھی سے منسلک تھی۔ خوش قسمتی سے یہ کوٹھڑی یا کمرہ اسی جگہ قائم رہا، جتنی بار بھی مکان کی تعمیرِ نو ہوئی، اس جگہ پر ایک کمرہ ہی رکھا گیا۔ نئی تعمیرات میں دوسری تبدیلیاں ضرور کی گئیں مگر اس مخصوص جگہ کے لیے شاید اس سے موزوں مصرف کوئی اور نظر نہیں آیا۔

یہ دو منزلہ مکان ۱۹۱۰ء تک خاندان کی ضروریات کے لیے کافی خیال کیا جاتا رہا، اس لیے کسی قسم کا کوئی مزید ردّ و بدل نہیں کیا گیا۔ البتہ نانا جان قبلہ شیخ عطا محمد مرحوم کی ریٹائرمنٹ جب بالکل قریب آئی تو انہیں سب سے پہلے مکان کو جدید سہولتوں کے ساتھ تعمیر کرنے کا خیال آیا جہاں وہ ملازمت سے فراغت کے بعد آرام و سکون کے ساتھ رہ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۰ء کے بعد اس منصوبہ پر عمل شروع کیا اور بہت جلد ایک سہ منزلہ حویلی اس جگہ ایستادہ کر دی اور چھوٹے بھائی کے نامِ نامی کی مناسبت سے اس کا نام ''اقبال منزل'' تجویز کیا۔

۱۹۱۰ء میں شیخ عطا محمد صاحب نے پرانے دو منزلہ مکان کو گرا کر سہ منزلہ حویلی تعمیر کرائی۔ ۱۹۱۵ء میں اسی مکان میں ایک مزید دکان جنوب کی جانب خرید کر ساتھ ملائی گئی اور اس پر ایک علیحدہ سہ منزلہ عمارت تعمیر کروا کر بڑی چابکدستی سے پہلی عمارت سے منسلک کر دیا۔ موجودہ حویلی کی ان تین منزلوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۹۱۵ء میں آخری اضافے کے بعد اس کا کل رقبہ نو مرلے کے قریب ہو گیا۔

منزلِ زیریں (پہلی منزل)

بازار کی طرف دکانیں اور پیچھے کمرے تھے۔ جائے ولادتِ اقبال اپنی اصل جگہ پر ہی رہی اور وہاں ایک کمرہ ہی بنایا گیا۔

بالا خانہ (دوسری منزل)

بازار کی جانب چوبی بالکنی بنائی گئی۔ اس میں مردانہ نشست گاہ' ابا جی (شیخ عطا محمد) کا کمرہ اور میاں جی کے کمرے کے دروازے کھلتے تھے۔ صحن کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ بازار کی طرف سے جہاں سیڑھیاں اوپر پہنچتی تھیں' ایک کھلا کاریڈور تھا جو تمام کمروں کو ملاتا تھا۔

تختوں والا کمرہ

اس میں لکڑی کے تخت بچھائے گئے تھے۔ ان پر چاندنیوں کے اوپر گاؤ تکیے لگا کر بیٹھا جاتا تھا۔ شروع میں یہ کمرہ بے جی کے لیے مخصوص تھا مگر بعد میں زنانہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا۔ بھابی جی کے کمرے میں سے لکڑی کے کمرے میں سیڑھی جاتی تھی۔ اس کے دوہرے لکڑی کے چھت کے اندر چور خانے بنائے گئے تھے جن میں زیور وغیرہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔

سقف (تیسری منزل)

یہاں زیادہ تر کھلی چھت تھی۔ صرف دو چوبارے اور دو برساتیاں بنائی گئی تھیں۔ چوباروں کی چھتوں پر جانے کے لیے علیحدہ علیحدہ سیڑھیاں تھیں۔ یہاں پر بھی ایک غسلخانہ بنایا گیا تھا تا کہ بوقتِ ضرورت نیچے جانے کی دقت نہ ہو۔ دونوں طرف صحت خانے یا بیت الخلاء بھی بنے ہوئے تھے۔

نئی عمارت کی تعمیر کے بعد زیادہ تر رہائش بالا خانہ (دوسری منزل) پر تھی۔ گرمیوں میں زیریں منزل استعمال ہوتی تھی مگر باورچی خانہ چونکہ ہمیشہ دوسری منزل پر تھا' اس لیے اس کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ دوسرے اس منزل کا تعلق چونکہ بازار کی طرف زیادہ تھا' اس لیے بھی یہ سب کی پسندیدہ تھی۔ تیسری منزل موسمِ گرما میں شب باشی کے لیے

استعمال ہوتی تھی اور چونکہ پورے علاقے میں سب سے اونچائی پر تھی' اس لیے گرما میں بھی موسم خوشگوار ہو جاتا تھا۔ ہر منزل پر غسلخانوں کا بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس دور میں جب منسلک غسلخانوں کے بارے میں بہت کم علم تھا' یہاں کمروں کے ساتھ منسلکہ غسلخانے موجود تھے۔

شیخ عطا محمد صاحب چونکہ خود اس کام کے ماہر تھے' اس لیے بہترین میٹریل استعمال کیا گیا اور ہر طرح کی پختگی کا خیال رکھا گیا۔ لکڑی بہترین استعمال کی گئی۔ دروازے' کھڑکیاں اور الماریاں بے شمار تھیں اور بہترین لکڑی اور دوسرا سامان استعمال ہوا تھا۔ وہ زمانہ تو یقیناً سستا زمانہ تھا مگر میرے خیال میں اس زمانے کے حساب سے بھی سب سے گراں سامان استعمال کیا گیا تھا۔ پوری عمارت ''چونے گچی'' چنائی کی بنائی گئی تھی اور بڑی خوبصورت محرابوں سے اسے مزیّن کیا گیا تھا۔

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

(بانگِ درا)

میری اپنی اقبال منزل

میرا بچپن اور جوانی اقبال منزل کی گود میں کیسے گزرا؟

یہ منزلِ سعید جو آج مرجع خلائق ہے اور لوگ اکنافِ عالم سے جوق در جوق مولدِ اقبال میں حاضری کے لیے یہاں آتے ہیں' کبھی ایک خوشحال گھرانے کا مسکن تھی اور خاندانِ اقبال شاداں و فرحاں اس میں آباد تھا۔ ۱۹۳۹ء میں اپنی پیدائش سے لے کر ۱۹۷۱ء تک جب اس کو محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں دے دیا گیا' تقریباً ۳۲ برس میرا اور اس کا دن رات کا ساتھ رہا اور میں اسی کے زیرِ سایہ پروان چڑھا۔ میری زندگی کے اس حصے کا تقریباً ہر لمحہ اس کی یادوں سے مزیّن ہے اور اس کے کونے کونے سے میرے بچپن اور لڑکپن کی ان گنت یادوں کے حسین لمحات وابستہ ہیں۔ میں ان گزرے لمحوں کی روداد قلمبند کرنے بیٹھوں تو شاید دفتروں کے دفتر سیاہ ہو جائیں مگر یادوں کے اس بحرِ ناپیدا کنار کو محیط کرنا شاید ممکن نہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ فیصلہ انتہائی مشکل ہوگا کہ کس کو بیان کروں اور کس کو چھوڑ دوں۔ بہر کیف مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق مختصراً چند ایسی یادیں تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو شاید دلچسپی کا باعث ہوں۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو اقبال منزل کی دوسری منزل پر ''میاں جی'' والا کمرہ ہماری تحویل میں ہوا کرتا تھا۔ ان دنو ں میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور ان کی ۱۹۳۴ء میں شادی کے پانچ برس بعد بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس لیے سب کا لاڈلا تھا اور چونکہ ننھیال میں تھا' اس لیے لاڈ پیار میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ بھابھی جی (بیگم شیخ عطا محمد) کی سب سے چھوٹی بیٹی کا پہلا بچہ تھا' اس لیے بھی اپنی نانی اماں کی آنکھوں کا تارا تھا۔ اگر کبھی کوئی غلطی پر بھی ڈانٹتا خواہ وہ میرے والدین ہی کیوں نہ ہوں' بھابھی جی فوراً میری حمایت میں شور مچا دیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد اگر کبھی میری سرزنش فرماتے تو محترمہ نانی جان اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہیں سے چلاتیں کہ...... ''نظیر احمد بچے کے ساتھ سختی مت کریں''۔ ان کے گھٹنوں میں چونکہ ہمیشہ سے تکلیف تھی' اس لیے وہ جلد اٹھ بیٹھ نہیں سکتی تھیں۔ ان کی یہ عادت بہت پختہ تھی' خواہ غصے میں بھی ہوتیں ہر کسی کو اس کے پورے نام سے مخاطب کرتیں۔ خاص طور پر اپنے بیٹوں اور دامادوں کا نام تو وہ پورے اہتمام سے لیا کرتی تھیں۔ میرے والد صاحب

کو انہوں نے کبھی صرف "نظیر" کہہ کر مخاطب نہیں کیا' ہمیشہ ان کا پورا نام "نظیر احمد" لے کر پکارا۔ اور پھر یہ عادت صرف بلانے تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ عام گفتگو میں بھی ہمیشہ سب کے نام پوری طرح ادا کرتی تھیں۔ وہ ایک عظیم خاتون تھیں' زندگی بھر انہوں نے اپنے سسرال والوں کی مقدور بھر خدمت کی تھی۔ میاں جی تو ان کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ہر کام کے لیے انہی کو پکارتے تھے۔ حضرت علامہؒ اپنی بھاوجہ کو بمنزلہ ماں کے جانتے تھے اور ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔

جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں' بزرگوں میں سے صرف بھابھی جی ہی یہاں باقی رہ گئی تھیں۔ کیونکہ میاں جی ۱۹۳۰ء میں انتقال فرما چکے تھے۔ پھر حضرت علامہ ۱۹۳۸ء میں راہیِ ملک عدم ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں شیخ عطا محمد بھی رحلت فرما گئے۔ میں جب سمجھ بوجھ کے قابل ہوا تو اقبال منزل میں بہت محدود افراد رہ رہے تھے۔ یعنی بڑی بھابھی جی' میرے منجھلے ماموں شیخ امتیاز احمد صاحب اور ان کی بیگم ممانی محمودہ' ان کو سب چھوٹی بھابھی جی کہتے تھے' اور ان کا اکلوتا بیٹا افتخار احمد جو مجھ سے سات آٹھ برس بڑا تھا۔ ان کے علاوہ ہم تین افراد یعنی میرے والد نظیر احمد صوفی صاحب' میری والدہ وسیمہ مبارک اور راقم الحروف جو اس وقت تقریباً تین برس کا تھا۔ اتنی بڑی حویلی میں ان چند نفوس کی وجہ سے بالکل بے رونق رہتی تھی۔ بڑی نشست گاہ ہر وقت خالی پڑی رہتی تھی' شاید ہی کبھی کوئی ملاقاتی آتا تھا۔ ابا جی والا کمرہ یعنی نانا جان شیخ عطا محمد مرحوم کا کمرۂ خصوصی اب امتیاز ماموں کے زیرِ استعمال تھا اور میاں جی والا کمرہ ہم لوگوں کے پاس تھا۔ بھابھی جی اپنے کمرے میں ہوتی تھیں۔ لکڑی کے تختوں والی نشست گاہ جو پہلے بے جی کا کمرہ تھی' اب زنانہ نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی' البتہ اس کو کھانے کے کمرے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ دوپہر اور رات کا کھانا تختوں کے اوپر فرشی نشست میں ہوتا تھا۔

گھر بھر میں چونکہ صرف دو بچے تھے جن کی عمروں میں کافی فرق تھا' اس لیے شور و غل کا ماحول بالکل نہیں تھا۔ ہاں تھوڑی بہت بے ضرر سی شرارتیں کبھی کبھار ضرور ہوتی تھیں۔ خاص طور پر لڑکے ہونے کی وجہ سے ہم دونوں میں تخریب کاری کا عنصر کچھ زیادہ تھا اور توڑ پھوڑ کی کچھ مشقیں ہم ضرور کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے بھابھی جی کی ڈانٹ سننا پڑتی تھی۔ افتخار بھائی کو تو بس ہر چیز کو کھول کر یا توڑ کر اس کے اندر جھانکنے کا جنون ہوا کرتا تھا۔ ان دنوں کپڑے کے بنے ہوئے کھلونے جن کے اندر بھوسہ بھرا ہوتا تھا' اکثر گلی میں بکنے کے لیے آتے تھے اور ہم دونوں ضد کر کے وہ

ضرور لیتے تھے مگر ہمیشہ ہی افتخار بھائی اپنے تجسس سے مجبور ہو کر فوراً چاقو کے ساتھ اپنا گھوڑا ذبح کر ڈالتا اور پھر اس کا پیٹ پھاڑ دیتا کہ اندر کیا ہے' افسوس کہ ہمیشہ ہی بھوسہ برآمد ہوتا۔ مگر اس کی تسلی پھر بھی نہ ہوتی اور بہلا پھسلا کر وہ میرے والا گھوڑا بھی ذبح کر ڈالتا۔ چنانچہ پیسوں کی اس بربادی پر ہمیں سخت و سست سننا پڑتیں مگر اس بندۂ خدا پر اس کا کبھی اثر نہ ہوا۔

اقبال منزل میں رونق بدلتے ہوئے موسموں کی طرح آتی تھی۔ میرے بڑے ماموں شیخ اعجاز احمد صاحب ان دنوں اپنے اہل وعیال کے ساتھ دلی میں مقیم تھے اور سکول اور عدالت کی چھٹیوں میں ہی سیالکوٹ تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کے آنے سے خوب غل غپاڑ اچتا تھا۔ میرے ماموں شیخ مختار ان دنوں لاہور میں ملازم تھے مگر شاید ہی کبھی ادھر آتے تھے' البتہ ان کے بچے گرما کی تعطیلات میں ضرور سیالکوٹ آتے تھے۔ ان سب کے آنے سے اقبال منزل میں خوب گہما گہمی ہو جاتی اور سارا دن عجیب وغریب قسم کے کھیل کھیلے جاتے۔ میں ان دنوں سب بچوں سے کم عمر تھا' اس لیے عام طور پر خاموش تماشائی کا کردار ہی ادا کرنا پڑتا تھا مگر پھر بھی ان دنوں کی رونقیں ان لوگوں کے واپس چلے جانے کے بعد بھی مجھے یاد رہتی تھیں۔

محرم کے دنوں میں بھی ہمارے ہاں خوب رونق رہتی تھی کیونکہ محرم کے جلوس کو دیکھنے کے لیے تقریباً پورے محلے کے بچے اور عورتیں اقبال منزل کی طویل بالکنی میں جمع ہو جاتے تھے۔ کئی ایک رشتہ دار خاندان بھی اس روز خاص طور پر ہمارے ہاں آ جاتے تھے کیونکہ ہماری بالکنی سے بازار میں گزرتے ہوئے جلوسوں کا نظارہ بڑی اچھی طرح کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح جب بھی کوئی جلوس بازار سے گزرتا' پورے محلے کی مستورات اور بچے بھاگم بھاگ بالکنی میں آن اکٹھے ہوتے۔ ان دنوں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی اور تقریباً روزانہ بازار میں جلوسوں کی وجہ سے ہنگامہ آرائی ہوتی تھی' جن میں سر سکندر حیات اور ملک خضر حیات ٹوانہ کے خلاف بہت نعرہ بازی ہوتی۔ متعدد بار ایسا بھی دیکھا کہ ایک آدمی کا منہ کالا کر کے اور گلے میں جوتوں کا ہار پہنا کر اسے ملک خضر حیات ٹوانہ کا بہروپ دے کر جلوس کے آگے لگایا ہوتا تھا اور اس کی خوب پٹائی کی جاتی تھی اور شرکائے جلوس پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ اِلا اللہ کے نعرے لگاتے بڑے جوش میں نظر آتے تھے۔ اسی طرح ان دنوں ہندو اور سکھ بھی جلوس نکالتے تھے' خاص طور پر سکھ پیلے رنگ کے کپڑے اور پرچم لے کر نکلتے تھے۔ اقبال منزل چونکہ بازار کے اوپر واقع ہے اس لیے یہ سب کچھ میں بالکنی سے دیکھا کرتا تھا۔

انہی دنوں فرنگی حکمرانوں نے عوام کو اپنی طاقت سے مرعوب کرنے کے لیے ایک روز فوجی ٹینک بھی بازار سے گزارے۔

۲۸ اپریل ۱۹۴۴ء کو جب حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح سیالکوٹ تشریف لائے تو ان کا عظیم الشان جلوس بھی یہاں سے گزرا اور خوب رونق رہی۔ اقبال منزل کی ساری بالکنیاں عورتوں اور بچوں سے لدی ہوئی تھیں۔ میں ان دنوں پانچ برس کا تھا اور اقبال منزل کی سیڑھیوں کے بالکل اوپر والی بالکنی میں دوسرے افرادِ خاندان کے ساتھ بیٹھا تھا' جہاں سے قائدِ اعظم پر گل پاشی کی جانی تھی' جب وہ اقبال منزل میں اوپر آنے کے لیے داخل ہوتے۔ جب جلوس وہاں آ کر رکا تو وہ اوپر نہ آ سکے کیونکہ ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ گاڑی میں سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ میرے والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی نے ان کو خوش آمدید! کہا اور آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور اوپر چلنے کی دعوت دی۔ قائدِ اعظم نے معذرت کی کہ ممکن نہیں۔ چنانچہ والد صاحب نے وہیں انہیں پھولوں کے ہار پہنا دیے۔ قائدِ اعظم نے اوپر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور ہم سب نے اوپر سے گل پاشی کی۔ میں ان دنوں کو کم عمر تھا مگر مجھے آج بھی وہ سارا منظر پوری طرح یاد ہے اور حضرت قائدِ اعظم کا مسکراتا ہوا چہرہ آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح روشن ہے۔ وہ چہرہ اپنے اندر خدا جانے کیا کشش رکھتا تھا کہ ہر آدمی اس پر نچھاور ہونے کے لیے بے تاب تھا۔ اتنا بڑا مجمع بالکل پروانوں کی طرح نظر آ رہا تھا جو شمع آزادی پر پروانہ وار نثار ہو جانا چاہتا ہو۔

تحریکِ آزادی ہی کے دنوں کا ایک بڑا دلچسپ واقعہ یہاں یاد آ رہا ہے آپ بھی سنیے:

یہ حضرت قائدِ اعظم کی سیالکوٹ آمد کے تقریباً سال ڈیڑھ سال بعد کی بات ہو گی کہ پاکستان کے سلسلے میں انتخابات ہوئے' جن میں بڑا جوش و خروش پایا گیا اور مسلمانوں نے قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کی دل و جان سے حمایت کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ الیکشن والے دن جب میری والدہ اپنا ووٹ ڈالنے کے لیے گئیں تو مجھے بھی ساتھ لے گئیں۔

عورتوں کا پولنگ سٹیشن لیڈی اینڈرسن سکول میں تھا۔ اڈہ پسروریاں میں مجلس احرار نے بڑا زبردست قسم کا کیمپ لگا رکھا تھا اور ان کی ورکرز مسلم لیگی ووٹروں کو زبردستی ادھر جانے سے روک رہی تھیں۔ میری والدہ سفید سید حا برقع پہنے اور مجھے انگلی سے لگائے ایسے انداز سے وہاں سے گزریں جیسے بچے کے کسی کام سے جا رہی ہوں اور آرام سے چلتی ہوئی سکول کے سامنے پہنچ گئیں۔ جب ہم لوگ اندر پہنچے تو وہاں ایک فربہ اندام' بڑی بڑی مونچھوں والا فوجی نما انگریز بیٹھا

تھا اور ہر عورت سے جو ووٹ دینے کے لیے آتی تھی، کچھ سوالات کر رہا تھا اور خاصا غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ جب میری والدہ کی باری آئی تو حسبِ معمول اس فرنگی نے ان سے بھی وہی سوالات دہرائے ...... ان کی تفصیل تو مجھے یاد نہیں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ میری امی نے جواب میں جب "کرامت علی" کا نام لیا تو وہ فرنگی بری طرح بھنا گیا اور غصے میں منہ ٹیڑھا کر کے زور سے بڑبڑایا:

"کرامٹ حالی ...... کرامٹ حالی ...... کرامٹ حالی ......"

دراصل اس الیکشن میں شیخ کرامت علی، مسلم لیگ کی طرف سے امیدوار تھے اور ان کے مدِ مقابل مجلس احرار اور کانگریس وغیرہ نے مشترکہ طور پر مولانا مظہر علی اظہر کو نامزد کر رکھا تھا اور فرنگی حکمرانوں کی ہمدردیاں بھی انہی کے ساتھ تھیں اور وہ ان کی ناکامی کے آثار دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ شام کے وقت جب نتائج کا اعلان ہوا تو اس بے چارے انگریز کا غصہ بالکل صحیح نکلا کیونکہ شیخ کرامت علی بھاری اکثریت سے کامیاب قرار پائے۔

مندرجہ بالا واقعہ کو اقبال منزل سے متعلق تو نہیں مگر تاریخ کے اس دور کا ضرور ہے جب تحریکِ آزادی پورے جوبن پر تھی اور پاکستان کا حصول ہی سب کا منتہائے نظر بنا ہوا تھا۔ بہرکیف آمدم برسرِ اقبال منزل شروع سے ہی کچھ کمروں کے اپنے مخصوص نام ہوا کرتے تھے اور آخر تک وہ انہی ناموں سے پہچانے جاتے رہے۔ مثلاً میاں جی کے لیے جو کمرہ مخصوص تھا اسے "میاں جی ہوراں دا کمرہ" یعنی میاں جی کا کمرہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد "ابا جی ہوراں دا کمرہ" یہ ابا جی یعنی شیخ عطا محمد صاحب کا کمرہ تھا۔ "بے جی ہوراں دا کمرہ" یعنی بے جی کا کمرہ۔ "بھابھی جی ہوراں دا کمرہ" بھابھی جی کا کمرہ۔ اس کے علاوہ "وڈھی بیٹھک" اور "چھوٹی بیٹھک" یعنی بڑی اور چھوٹی نشست گاہ۔ بچپن سے میں نے ان کمروں کو انہی ناموں سے منسوب دیکھا۔ صرف ایک کمرہ جو پہلے "بے جی کا کمرہ" تھا، تبدیل ہو کر "تخت پوشاں والا اندر" یعنی تختوں والا کمرہ ہو گیا کیونکہ اس میں چوبی تخت بچھے ہوئے تھے جن پر چاندنیوں کا فرش ہوا کرتا تھا اور دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگا کر بیٹھا جاتا تھا۔

منجھلے ماموں شیخ امتیاز احمد مرحوم بڑے بذلہ سنج اور مرنجان مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ میرے ساتھ ان کی بڑی دوستی ہوا کرتی تھی اور اپنے موٹر سائیکل پر افتخار بھائی اور مجھے سیر کروایا کرتے تھے۔ ان کی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹوکری نما گاڑی لگی ہوتی تھی جس میں بیٹھنا بڑا آرام دہ اور ایک عجیب تجربہ تھا۔ امتیاز ماموں ان دنوں چھاؤنی میں گاڑیوں کا

ایک گیراج چلاتے تھے اور انہوں نے اپنی اسی شاندار موٹر سائیکل پر قائدِ اعظم کے جلوس کی قیادت کی تھی اور جس فورڈ گاڑی میں قائدِ اعظم جلوس میں سوار تھے' وہ اور اس کا ڈرائیور دونوں کا انتظام امتیاز ماموں نے ہی کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں وہ بحرین چلے گئے اور ایک برس بھی نہیں گزرا تھا کہ دسمبر ۱۹۴۶ء میں وہیں انتقال فرما گئے اور بحرین میں ہی سپردِ خاک کر دیئے گئے۔ ان کے باہر چلے جانے سے ہی اقبال منزل کی رونقیں ادھوری ہو گئی تھیں۔ اب اس حادثہ جانکاہ نے تو سب کچھ ہی ختم کر دیا۔ ایک بار پھر خاندانِ اقبال میں وہی روایت دہرائی گئی کہ بڑے بھائی کے سامنے چھوٹا راہی ملکِ عدم ہوا۔

ان دنوں اقبال منزل کے ہر کمرے میں بے شمار تصاویر آویزاں ہوا کرتی تھیں۔ مردانہ نشست گاہ جس میں وکٹورین ڈیزائن کے بڑے بڑے صوفے رکھے تھے' وہیں دیواروں پر قدِ آدم فریموں میں جدّی میاں جی شیخ نور محمد مرحوم' بڑے نانا جان شیخ عطا محمد مرحوم' چھوٹے نانا جان حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اور بڑے ماموں شیخ اعجاز احمد صاحب کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے گروپ فوٹو بھی تھے۔ اسی کمرے میں ایک خوبصورت آتشدان بھی تھا جس کی ساخت بڑی عجیب و غریب تھی۔ بچپن میں راقم الحروف اسے گڑیوں کا گھر سمجھ کر اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ یہ آتشدان آج بھی اقبال منزل میں اسی جگہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک خاص قسم کا دیوار گیر لیمپ بھی ہوا کرتا تھا جو پہلے تیل کے ساتھ جلایا جاتا تھا مگر جب بجلی آ گئی تو اس کو تبدیل کر کے بجلی کے ساتھ جلنے والا بنا دیا گیا۔

اسی طرح کا ایک لیمپ صحن میں میاں جی کے کمرے کے باہر بھی لگا ہوتا تھا۔ اقبال منزل کے تمام کمروں میں اس قدر تصاویر لگی ہوئی تھیں کہ بعض اوقات تو کسی تصویری نمائش کا گماں ہونے لگتا تھا۔ ان میں سے خاص طور پر جو مجھے بچپن میں پسند تھی' ان میں میرے والدِ گرامی کی شادی کی تصاویر جن میں وہ دولہا بنے ہوئے تھے' جاوید ماموں کے بچپن کی تصویر جس میں وہ ہاتھ میں کیلا پکڑے ہوئے تھے۔ چھوٹے نانا جان کی ایک تصویر جس میں جاوید ماموں ان کی کرسی کے پاس کھڑے تھے اور دونوں نے خوبصورت شیروانیاں اور ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ اور بہت تصویریں تھیں مگر بچپن میں مجھے ان میں خاص دلچسپی تھی۔ ابا جی والا کمرہ یعنی بڑے نانا جان شیخ عطا محمد صاحب کا کمرۂ خاص' گھر کا سب سے خوبصورت کمرہ تھا۔ ویسے تو سارا گھر بہترین ساز و سامان سے مزیّن تھا مگر اس کی اپنی ایک علیحدہ ہی پہچان تھی۔ خوبصورت قالین' منفرد قسم کا پلنگ' آمنے سامنے کی دیواروں پر لگے ہوئے قدِ آدم آئینے۔ سیاہ لکڑی کے مضبوط

دروازے جو دوسرے دروازوں سے بالکل مختلف ڈیزائن کے تھے۔ ان کے اوپر کے حصے میں خاص قسم کے پھول دار دودھیا شیشے لگائے گئے تھے۔ ایک بہت بڑا وارڈروب۔ دو دیوار گیر قدِ آدم الماریاں جن کے پٹ شیشوں والے تھے کتابوں سے بھری ہوتی تھیں۔ ان میں بڑی نادر کتب تھیں جنہیں مضبوط چمڑے والی جلدوں میں محفوظ کیا گیا تھا۔ دوسری کتابوں کے علاوہ ان میں ''نیرنگِ خیال''۔ ''مخزن'' اور ''ہمایوں'' وغیرہ کے بے شمار شمارے محفوظ تھے۔ مجھے صحیح یاد نہیں کہ میں نے لکھنا پڑھنا پہلے سیکھا یا ان تمام کو پہلے پڑھ ڈالا۔ اقبال منزل کا ایک اور منفرد کمرہ ''تختوں والا کمرہ'' تھا۔ اس میں دروازوں کے سامنے تھوڑی جگہ چھوڑ کر لکڑی کے تخت بچھائے گئے تھے جن سے پورے کمرے میں تقریباً ایک ڈیڑھ فٹ اونچا چوبی فرش بن گیا تھا۔ ان پر چاندنیوں کا فرش بچھا ہوتا تھا اور دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے جاتے تھے۔ میں نے اسے زنانہ نشست گاہ کی طرح استعمال ہوتے دیکھا۔ بڑی بھابھی جی یعنی میری نانی جان سارا دن اسی کمرے میں بیٹھتی تھیں اور سب ملنے جلنے والے وہیں ان کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔ اس کی دو کھڑکیاں گلی کی جانب کھلتی تھیں' جن میں چوبی جالیاں لگائی گئیں تھیں جو بوقتِ ضرورت کھل کر خوبصورت چھجے کی شکل اختیار کر لیا کرتی تھیں۔ ان کے درمیان ایک قدِ آدم آئینہ آویزاں تھا جو کمرے میں وسعت کا احساس پیدا کرتا تھا۔ یہ کمرہ سب سے پہلے ''بے جی'' کے استعمال میں رہا کرتا تھا۔ یہیں پر چھوٹے نانا جان حضرت علامہ علیہ الرحمۃ' جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو ٹھہرتے تھے۔ تختوں کے اوپر دیوار کے ساتھ پلنگ بچھا دیا جاتا تھا جس پر وہ استراحت فرماتے تھے۔ یہی وہ کمرہ ہے جہاں گھریلو محفلیں جمتی تھیں اور علامہ صاحب اپنی والدہ ماجدہ' بھاوجہ اور بہنوں سے سارے خاندان اور محلے کی مختلف رودادیں سنا کرتے تھے۔ یہ کمرہ ہمیشہ ہی اقبال منزل میں مرکزی اہمیت کا حامل رہا اور اپنے چوبی تختوں کے فرش کی وجہ سے یہ پورے گھر میں ایک انفرادی حیثیت بھی رکھتا تھا' بلکہ اس کا چرچا دوسرے گھروں تک تھا کیونکہ شاید ہی کسی اور گھر میں ایسا انتظام موجود تھا۔

موسمِ سرما میں چونکہ دوسری منزل میں دھوپ خوب آتی تھی' اس لیے یہاں کا درجہ حرارت سرما کی خنک راتوں میں بھی قابلِ برداشت ہی رہتا تھا مگر زیریں منزل اس قدر سرد ہو جاتی تھی کہ کوئی دن کے وقت بھی وہاں نہیں جایا کرتا تھا۔ چنانچہ سردیوں میں وہ تمام کمرے بالکل سنسان پڑے رہتے۔ مگر جیسے ہی گرمیاں جوبن پر آتیں یہی جگہ اپنی خنکی کی وجہ سے سب کی پسندیدہ قرار پاتی اور چلچلاتی دوپہروں میں سبھی یہیں عافیت تلاش کرتے۔ نانا جان قبلہ (علامہ

صاحب) بھی ہر سال گرما کی تعطیلات میں جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو زیریں منزل کے انہیں کمروں کو پسند فرماتے۔ روزانہ ان کا فرش خوب رگڑ رگڑ کر دھویا جاتا کہ سرخ اینٹوں کا فرش بالکل برف ہو جاتا اور اس پر ننگے پاؤں چلنے سے سارے جسم میں طراوت آ جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب بچپن میں زبردستی دوپہر کے وقت نچلی منزل کے ان کمروں میں لے جا کر سلایا جاتا تو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے جنت کے کسی گوشے میں پہنچ گئے ہوں۔ بڑے نانا جان (شیخ عطا محمد صاحب) نے منزل زیریں کے ان کمروں کا کچھ ایسا انتظام کیا ہوا تھا کہ پچھلی گلی کی طرف سے ہر وقت ہوا فرفر اندر آتی رہتی تھی اور ہر وقت تازہ اور ٹھنڈی ہوا یہاں بھری رہتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے کمالِ فن کا شاہکار تھا۔ ویسے تو پوری کی پوری اقبال منزل ہی ان کی فنِ تعمیر پر بے پناہ دسترس کی مظہر تھی جس کا مشاہدہ آج بھی قدم قدم پر اور کونے کونے میں کیا جا سکتا ہے۔

اقبال منزل میں میرا سب سے پسندیدہ کمرہ وہ تھا جو پورے کا پورا لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ یہ دوسری منزل میں کاریڈور اور بڑے غسلخانے کے اوپر نصف منزل کے طور پر بنایا گیا ہے۔ اس میں پہنچنے کے لیے ایک مضبوط اور خوبصورت چوبی سیڑھی بھابھی جی کے کمرے میں سے اوپر جاتی تھی۔ اس کمرے کا فرش لکڑی کا تھا اور دوہرا بنایا گیا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر اس میں محفوظ خانے بنائے گئے تھے جن کو بڑی چابکدستی سے بند کیا گیا تھا کہ ان کو تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ جو ان کے صحیح مقام کو جانتا تھا' وہی ان کو کھول سکتا تھا۔ ان میں قیمتی سامان مثلاً' زیورات' روپیہ پیسہ وغیرہ رکھ دیا جاتا تھا اور بالکل محفوظ رہتا تھا۔ اس کمرے کی خاص بات یہ تھی کہ چونکہ اس کی چھت کوتاہ تھی اس لیے خاص طور پر بچوں کو بہت پسند آتا تھا۔ سب بچے اس میں کھیلنا پسند کیا کرتے تھے۔ خاص طور پر سردیوں میں یہ خوب گرم ہوا کرتا تھا اور سردیوں کی دوپہروں میں جب اس کی اکلوتی کھڑکی جو مردانہ نشست گاہ کے کھلے کوریڈور میں کھلتی تھی' میں سے سرما کی نرم نرم اور میٹھی میٹھی دھوپ اندر آتی تھی تو اس کی مہربان گرماہٹ اور پیاری چمک سے یہ چوبی چھت اور چوبی فرش والا پیارا سا کمرہ بھر جایا کرتا تھا۔ میں اکثر یہیں اپنا سکول کا کام کرتا تھا یا بچوں کا ماہنامہ ''کھلونا'' (دہلی) اس کھڑکی کی روشنی میں پڑھا کرتا تھا۔ اس کمرے کا فرش چونکہ چوبی تھا' اس لیے اس پر چلنے سے جو آواز نکلتی تھی وہ ہم بچوں کی بہت پسندیدہ ہوا کرتی تھی۔ جب سب بچے مل کر اودھم مچاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ چھت اب گری کہ تب گری۔ جب ایسی صورت پیدا ہوتی اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی تو نیچے سے بھابھی جی کی ڈانٹ سنائی دیتی اور ہم

سب وہیں کے وہیں دبک جایا کرتے۔ یہ دھما چوکڑی صرف ان دنوں میں مچتی تھی جب تعطیلات میں سب لوگ اکٹھے ہوتے تھے ورنہ میں اکیلا ہی بلاشرکتِ غیرے اس کو استعمال کرتا تھا کیونکہ افتخار بھائی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اقبال منزل کی تعمیر میں بہترین سامان استعمال ہوا تھا۔ خاص خاص دروازوں پر چینی کے بنے ہوئے سفید اور رنگین دستے لگے ہوئے تھے جو میرا خیال ہے' کافی مہنگے تھے۔ باقی سب دروازوں اور کھڑکیوں پر پیتل کے ہینڈل' چٹخنیاں وغیرہ لگائے گئے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں خاص قسم کے پھول دار شیشے لگے ہوئے تھے جن میں سے روشنی دودھیا ہو جاتی تھی۔ بہترین لکڑی کا انتخاب کیا گیا تھا اور تمام دروازے اور کھڑکیاں الماریاں وغیرہ بڑی چابکدستی سے تیار ہوئی تھیں۔ برتنوں کے لیے قدِ آدم الماریاں دیوار گیر تھیں جن میں شفاف شیشے لگائے گئے تھے۔ یہاں تک کہ کمروں میں جو کھونٹیاں لگی ہوئی تھیں وہ بھی یقیناً خصوصی طور پر تیار کروائی گئی تھیں کیونکہ ان کو پکڑنے کے لیے کسی میں شیر کا چہرہ اور دوسری میں ڈاڑھی والا انسانی چہرہ بنا ہوا تھا۔ یہ اپنے رنگ میں عجیب وغریب چیزیں تھیں۔ بازار کی طرف سے جو سیڑھیاں اوپر دوسری منزل میں آتی تھیں' ان میں سہارے کے لیے ایک خوب موٹا سا رسّہ لٹکایا گیا تھا۔ چونکہ یہ سیڑھی دونوں جانب سے بند تھی اس لیے کسی قسم کی ریلنگ وغیرہ نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ یہ رسّہ دراصل ریلنگ کا نعم البدل تھا اور خوب تھا۔ سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے میں جو مردانہ نشست گاہ کے ساتھ والے کاریڈور میں کھلتا تھا' سپرنگ والی خودکار چٹخنی لگی تھی جو ایک زنجیر کی مدد سے کھلتی تھی۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ چیزیں بالکل عجائبات کا درجہ رکھتی تھیں اور زیادہ تر لوگوں کے لیے حیران کن ثابت ہوا کرتی تھیں۔ گلی کی جانب والا صدر دروازہ پرانی طرز کا بے حد مضبوط اور بالکل قلعہ کی طرح کا تھا۔ اس کو بند کرنے اور کھولنے کے لیے بڑا اچھا انتظام تھا۔ ڈیوڑھی اتنی کشادہ تھی کہ عام مکانوں میں شاید کمرے بھی چھوٹے ہوں۔ ہمیشہ دو جانور رکھے جاتے تھے۔ ایک گائے اور ایک بھینس اور ان کو یہیں باندھا جاتا تھا۔ ان کو باندھنے میں استعمال ہونے والے کھونٹے تو شاید اب بھی وہاں موجود ہیں۔

سب سے اوپر والی منزل میں جو دو چوبارے بنے ہوئے تھے' وہ بھی پوری طرح مزّین تھے۔ چنانچہ اپنی شادیوں کے بعد جب میرے دو بڑے ماموؤں نے ان دونوں کو آباد کیا تو ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ خاص طور پر وہ چوبارہ جو ۱۹۱۵ء میں تعمیر ہونے والے حصے میں تھا' بالکل جدید سامان سے سجایا گیا تھا۔ اس میں بازار کی جانب تین

فرانسیسی طرز کے دریچے کھلتے تھے جن کے باہر بڑی خوبصورت چھتریاں لگائی گئی تھیں جو بند اور کھل سکتی تھیں۔ جب ان کو بند کر دیا جاتا تو یہ چلمنیں بن جاتی تھیں۔ یہ ماموں اعجاز صاحب کی شادی کے بعد ان کے اہلِ خانہ کے استعمال میں رہا اور ممانی چاند صاحبہ کے جہیز کا کچھ سامان تو آخر تک وہاں رکھا رہا۔ جب مکان محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرد ہوا تو یہ سامان بھی انہی کے حوالے کر دیا گیا۔

اقبال منزل کی بازار کی طرف والی بالکنیوں، جو برآمدے کی طرح ہیں، میں جو جالیاں لگائی گئی تھیں وہ بھی اپنی طرز کی منفرد قسم کی تھیں۔ اسی قسم کی جالیاں اندر صحن کے جنگلوں میں بھی تھیں۔ یہ چوبی جنگلے بڑے سبک اور پہلودار تھے۔ یہ ایک ہی طرز اور شکل کی جالیاں تقریباً گھر کی تمام کھڑکیوں میں لگائی گئی تھیں اور یقیناً خاص طور پر تیار کروائی گئی تھیں کیونکہ مختلف سائز میں ہونے کے باوجود شکل میں ایک جیسی تھیں۔ نانا جان قبلہ (شیخ عطا محمد صاحب) نے اقبال منزل کو بنانے اور سجانے میں اپنا پورا فن استعمال کر دیا ہوا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس دور کے لحاظ سے انہوں نے ہر چیز گراں ترین استعمال کروائی تھی اور گھر کو دلہن کی طرح سجایا تھا۔ شاید ہی کوئی کونہ ایسا بچا ہو جس کا بالکل صحیح استعمال نہ کیا گیا ہو اور جس کو اس وقت کی ضروریات کے مطابق مزیّن نہ کیا گیا ہو۔ باورچی خانہ ہر طرح مکمل تھا۔ غسلخانے اس دور کے مطابق ہر طرح مزیّن تھے۔ یہاں تک کہ بیت الخلاء تک میں ایک ندرت کا پہلو تھا اور انہیں پوری طرح روشن اور ہوادار بنایا گیا تھا۔ اس دور میں جب بہت کم گھروں میں علیحدہ غسلخانے بنانے کا رواج تھا، یہاں آدھی درجن کے قریب غسلخانے بنائے گئے تھے جو زیادہ تر کمروں سے منسلک تھے...... ''اٹیچ باتھ'' کا رواج تو اب عام ہوا ہے۔

اقبال منزل کی زیریں منزل میں جو چار دکانیں تھیں، وہ شروع میں شاید بہت ہی کم مشاہرے پر اٹھی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ان میں سے تین جو بڑی تھیں، کا کرایہ دس روپے ماہوار اور چھوٹی والی صرف تین روپے ماہانہ پر دی گئی تھیں۔ یہ بازار چونکہ ان دنوں بالکل ہی غیر آباد سا تھا، اس لیے کوئی اچھا کرایہ دار یہاں آتا ہی نہیں تھا۔ ان کا کرایہ ان دنوں بھابھی جی یعنی میری نانی اماں وصول کرتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ بعد بھابھی جی کے اصرار پر میرے والد صاحب نے سب کرایہ داروں سے بڑی مشکل سے تھوڑا سا کرایہ بڑھوایا یعنی اب بڑی والی دوکان پندرہ روپے اور چھوٹی پانچ روپے...... اس سے مزید کچھ بہتری ممکن نہیں تھی، اس لیے میرے والدِ گرامی نے

ماموں اعجاز کو یہ تجویز کیا کہ اگر بڑی والی دکانوں کے درمیان دیوار کھڑی کر کے ایک کی دو بنا دی جائیں تو کرایہ دگنا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تین بڑی دکانوں میں پارٹیشن کر دی گئی اور اب چار سے بڑھ کر سات دکانیں ہو گئیں۔ کرایہ فی دکان وہی رہا مگر تعداد میں اضافے سے مالیت میں قدرے اضافہ ممکن ہو گیا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ میرے کچھ بڑے ہونے کے بعد جب ان کا چارج میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے نئے کرایہ نامے تمام کرایہ داروں سے لکھوانے کا اہتمام کیا اور کرایہ فی دکان پچاس روپیہ ماہوار مقرر کیا۔ چنانچہ اب کل کرایہ کسی حد تک قابلِ ذکر ہو گیا جس کی وجہ سے میری نانی اماں بہت خوش ہوئیں۔ اس پوری جائیداد کا پراپرٹی ٹیکس اور ہاؤس ٹیکس سالانہ ادا کیا جاتا تھا جو میرے ذریعے ہی ادا ہوتا تھا اور میں ان کی رسیدات ماموں اعجاز کو کراچی بھجوایا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں بے شمار خطوط ہیں۔ ایک یہاں نقل کرتا ہوں:

B۔۲۱۳ فریئر سٹریٹ، کراچی۔۴

۳۰ ستمبر ۱۹۶۹ء

عزیزم خالد سلمہٗ

تمہارا ۲۷ ستمبر کا خط مل گیا ہے۔ پراپرٹی ٹیکس ۷۰-۱۹۶۹ء کی ادائیگی کی رسید بھی مل گئی ہے۔ ۱۵۸/۶۴ کا ڈرافٹ یونائیٹڈ بنک سیالکوٹ پر ارسال ہے۔

یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ نذیر احمد اور وسیمہ دونوں ٹائیفائیڈ میں مبتلا رہے۔ الحمد للہ اب خیریت سے ہیں۔ اب تو اس بخار کے لیے بڑی مؤثر دوا نکل چکی ہے، جو بہت جلد بخار کو روک دیتی ہے۔ بخار اترنے کے بعد بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خیریت سے رکھے۔

والسلام

خیر اندیش

اعجاز احمد

ان دنوں گرمیوں میں کھلی چھتوں پر سونے کا رواج عام تھا، اس لیے اقبال منزل کی تیسری منزل پر کھلی چھت بھی موسمِ گرما کی راتوں میں پوری طرح آباد ہوتی تھی۔ ان دنوں یہ عمارت چونکہ پورے علاقے میں سب سے بلند تھی، اس

لیے شدید گرمی میں بھی اس کی چھت پر ہوا ہوتی تھی۔ میاں جی بڑے نانا جان اور چھوٹے نانا جان ہمیشہ بازار کی طرف والی کھلی اور بڑی چھت پر سوتے تھے اور ان کی چارپائیاں ایک دوسرے کے ساتھ بچھائی جاتی تھیں۔ دونوں طرف چوباروں پر جانے کے لیے محفوظ سیڑھیاں موجود تھیں۔ اس لیے کچھ لوگ وہاں بھی سویا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ رات کی بجائے صبح صادق کے وقت ان چھتوں پر موسم زیادہ خوشگوار ہو جایا کرتا تھا اور بستر چھوڑنا بے حد دشوار ہوتا تھا۔ بازار کی جانب لگی ہوئی خوبصورت جالیوں میں سے ایسی فرحت بخش نسیم سحری چلا کرتی تھی کہ پورے جسم میں گدگدی ہونے لگتی تھی اور اٹھنے کو کس کافر کا جی چاہتا تھا۔ سکول جانے کے لیے صبح صبح اٹھنا ناممکن بن جاتا تھا۔ چھٹی والے روز اور موسمِ گرما کی تعطیلات میں جب تک سورج سوا نیزے پر نہیں آ جاتا تھا' کوئی مائی کا لال اٹھ کر نہیں دیتا تھا۔ موسمِ گرما کی راتوں میں اکثر بارش آ جاتی تو ہر طرف اک شور سا اٹھتا کیونکہ لوگ بستر اور چارپائیاں اٹھائے گھروں کی نچلی منزلوں میں بھاگتے تھے کیونکہ کھلی چھتوں پر ستاروں کی چھاؤں کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے سایے کا انتظام ہوتا تھا۔ اقبال منزل پر دو چوباروں کے علاوہ دو برساتیاں بھی موجود تھیں جن میں بارش کے دوران سونا اپنا ایک علیحدہ لطف اور حسن رکھتا تھا۔ ایک برساتی بازار کی جانب تھی اور دوسری گلی کی طرف اور ان میں کھڑکیاں اور محرابیں اس طرح بنائی گئی تھیں کہ برسات کی بھیگی بھیگی ہوائیں ان میں اس طرح داخل ہوتی تھیں کہ گرمی کی تمام کلفت ہوا ہو جایا کرتی تھی۔

اقبال منزل میں ان دنوں بے شمار فرنیچر اور دوسرا سامان ہوا کرتا تھا۔ تمام کمرے اس سے بھرے رہتے تھے۔ بڑی بڑی کرسیاں' چوڑے میز' انواری پلنگ' آرام کرسیاں جو فولڈنگ بازوؤں والی تھیں' جن کو اگر کھول لیا جاتا تو آرام سے سویا بھی جا سکتا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل جن میں قدِ آدم آئینے تھے۔ مردانہ نشست گاہ میں بڑے بڑے وکٹورین صوفے۔ دونوں نشست گاہوں میں قالین اور غالیچے' لکڑی کے بے حد مضبوط صندوق جن کی شکل خزانے کے چوبی صندوقوں سے مشابہ تھی جو پرانے زمانے میں بحری جہازوں میں استعمال ہوتے تھے۔ الماریوں میں بے شمار کراکری جن میں وہ خصوصی تحائف جو علامہ صاحب کو کہاں کہاں سے آئے تھے اور انہوں نے والدین کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے۔ نشست گاہوں کی الماریاں نایاب کتابوں سے اٹی ہوتی تھیں۔

بچپن میں کبھی کبھی چشمِ تصور مجھے وہ تمام یادیں مجسم دکھا دیا کرتی تھی' جو ان دنوں اپنی والدہ' نانی اماں' پھوپھی جی اور

دوسرے بزرگوں سے سنتا تھا...... میں نے وہ پیارا منظر اکثر جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ شام کے وقت میاں جی اپنے کمرے کے باہر بچھے تخت پر براجمان ہیں اور ان کے دونوں طرف ان کے فرزندانِ ارجمند مؤدب بیٹھے ہیں ...... ایک وہ جنہوں نے اس منزلِ سعید کو تعمیر کرنے میں اپنی پوری ذہانت اور فن کا استعمال کیا اور میاں جی کے آرام کے لیے کیا کیا انتظامات کیے اور دوسرے وہ جنہوں نے میاں جی کا ہی نہیں' اپنے آباؤ اجداد اور اپنے پورے خانوادے کا نام پوری دنیا میں روشن کر دیا۔ میاں جی کا اس چوبی تخت پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھ کر حقہ نوش فرماتے ہوئے سر فخر سے بلند ہوتا ہوگا...... مگر نہیں وہ بڑے شکر گزار اور عاجز بندے تھے۔ انہوں نے تو اپنی پوری حیاتِ مستعار میں ہر حال میں خوشنودیٔ الٰہی کو ہی اپنا منتہائے نظر بنایا اور اس کی عطا کے ہی ہمیشہ طلبگار رہے۔ ان کی پوری زندگی میں شاید کوئی ایسا مقام نہیں آیا جب انہوں نے کسی بات پر غرور کے ایک شمّہ کو اپنے دل کے کسی نہاں خانے میں جگہ دینے کا تصور بھی کیا ہو۔ وہ صوفی منش اور درویش صفت ہر وقت اس ذاتِ اقدس کے شکر گزار بندے کی حیثیت میں رہنا ہی پسند کرتے رہے۔ انہوں نے یا ان کی رفیقہ حیات نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔ اقبال منزل کے ان مکینوں نے زندگی کے کیا کیا نشیب و فراز نہ دیکھے ہوں گے مگر چرخ کبود نے ان کے پائے استقامت میں شاید کبھی کوئی لغزش محسوس نہیں کی ہوگی...... میں نے کئی بار وہ گھریلو محفلیں بھی چشمِ تصور سے مشاہدہ کی ہیں' جن میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اپنی والدہ ماجدہ' اپنی ماں ہی کی طرح قابلِ احترام بھاوجہ' پیاری بہنوں اور دیگر افرادِ خاندان کے جلو میں بیٹھ کر ان کی معصوم اور پیاری باتیں سنا کرتے تھے اور علم کی اوج گاہوں سے اتر کر ایک طفلِ سادہ بن جانے میں عجیب لذت محسوس کیا کرتے تھے۔ چشمِ تصور میں ان محفلوں کو مجسم دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا کہ وہ ہستی کس قدر عظیم تھی کہ جس نے اتنا علم حاصل کیا کہ اس وقت اکنافِ عالم میں اس کا طوطی بول رہا تھا مگر اس میں تکبر یا غرور کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہ اپنی طبیعت میں وہی غریب انسان رہا جو کبھی اپنی اصلیت کو فراموش کرنے کا سوچنا بھی شاید گناہِ عظیم کے مترادف خیال کرتا ہو۔ اس قسم کی بے لوث ہستیاں اب کہاں ہیں۔ شاید چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی اب ان کا کوئی سراغ ملنا ممکن نہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اس منزلِ سعید کی وہ رونقیں کیا ہوئیں' جب یہاں ایک بھرا پُرا گھرانہ آباد تھا۔ اس کے وہ مکین کیا ہوئے جن کے اعمالِ صالح کبھی ایک ضرب المثل ہوا کرتے تھے۔ جن پر انوارِ خداوندی کی بارش روز و شب برستی

تھی اور وہ اپنے مولا کی عبادت میں دن رات مگن رہتے تھے۔ اس رحیم و کریم نے ان کی بے لوث عبادات کا صلہ ان کو اس طرح دیا کہ چار دانگِ عالم میں آج ان کے نام انتہائی عزت و احترام سے لیے جاتے ہیں اور ان کی روز و شب کی مصروفیات کی تفصیلات جاننے کے لیے علماء اور فضلاء بے تاب رہتے ہیں۔ یہ گھر اپنے ان مکینوں ان پیاری ہستیوں سے آہستہ آہستہ خالی ہو گیا اور وہ سب اپنے خالقِ حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے یہی قانونِ قدرت ہے۔ یہاں کی ہر چیز ہر ہستی فانی ہے کیونکہ۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں!

(بانگِ درا)

جب اقبال منزل پرائی ہوئی

(محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں)

تاریخ دست برداری	:	۲۷ مئی ۱۹۷۱ء
کل قیمت جو ادا کی گئی	:	ایک لاکھ پچیس ہزار روپے (-/۱۲۵,۰۰۰ روپے)
ملکیت	:	شیخ عطا محمد مرحوم
وارثان	:	تین بھائی اور تین بہنیں

تین بھائی	اور	تین بہنیں
۱۔ شیخ اعجاز احمد		۱۔ اکبری بیگم زوجہ شیخ فضل الٰہی
۲۔ شیخ امتیاز احمد		۲۔ عنایت بیگم زوجہ شیخ غلام محی الدین
۳۔ شیخ مختار احمد		۳۔ وسیمہ بیگم زوجہ شیخ نظیر احمد صوفی

یہ اگست ۱۹۷۰ء کا ذکر ہے کہ بڑی طویل ردّوکد کے بعد بالآخر حکومتِ پاکستان نے اقبال منزل کو مولدِ اقبالؒ ہونے کے ناطے قومی یادگار رہنا نے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ مئی ۱۹۷۱ء میں یہ کارروائی مکمل ہوئی اور خاندانِ اقبال کے ہاتھوں سے نکل کر یہ منزلِ سعید اپنے نئے مالکان یعنی محکمہ آثارِ قدیمہ کی تحویل میں چلی گئی۔

اقبال منزل کو قومی یادگار قرار دینے کی تحریک سب سے پہلے بلدیہ سیالکوٹ کی جانب سے کی گئی، جس میں اس وقت کے چیئرمین بلدیہ نے مکان پر زبردستی قبضہ کرنے کا عندیہ بھی ظاہر کیا کیونکہ ان کا خیال یہ رہا ہو گا کہ چونکہ یہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی جائیداد ہے، اس لیے "قوم" کی ملکیت ہے اور اخبارات میں بیان دے کر اسے مفت ہتھیا لیا جائے گا۔ چنانچہ راقم الحروف نے جو ان دنوں اقبال منزل میں رہائش پذیر تھا، ان کے اس بیان کا اخبارات میں ہی

بڑا مدلل اور سخت جواب دیا اور انہیں آگاہ کیا کہ یہ جائیداد حضرت علامہ کے برادر بزرگ جناب شیخ عطا محمد مرحوم کی ملکیت ہے اور اس میں علامہ صاحب کا قانونی طور پر کوئی حصہ نہیں۔ شیخ عطا محمد صاحب کے وارثان موجود ہیں اور بلدیہ سیالکوٹ اس پر بلا معاوضہ تسلط کا خواب دیکھنا ترک کر دے تو بہتر ہوگا۔ اس جواب کے بعد وہاں بالکل خاموشی چھائی رہی۔ کچھ عرصہ بعد میری نانی جان جو اس وقت تک حیات تھیں' کو ان کی بڑی بیٹی کے داماد اور چچیرے بھائی خواجہ شفیع رشید کے ذریعے پیغام بھجوا کر بلدیہ والوں نے اقبال منزل کی پیشانی پر ایک یادگار تختی نصب کرنے کی اجازت لے لی۔ چنانچہ مندرجہ ذیل مضمون کے ساتھ ایک یادگار تختی اقبال منزل کے بازار کی طرف والے صدر دروازے پر لگوائی گئی۔

''یہ وہ منزل سعید ہے جہاں شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبالؒ پیدا ہوئے''

تاریخِ پیدائش : ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء

تاریخِ وفات : ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

اس تختی کو نصب کرنے کے لیے سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر بنفسِ نفیس تشریف لائے۔ اس روز خاصی بڑی تقریب اقبال روڈ پر منعقد کی گئی اور بلدیہ سیالکوٹ نے یہ معرکہ سر کر لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ ان کے خیال میں اس سے زیادہ اظہارِ عقیدت کی شاید ضرورت نہیں تھی۔

اس کے بعد کہیں سے قومی یادگار بنانے کی کوئی آواز نہیں آئی کیونکہ ان دنوں ہم سب وہاں رہائش پذیر تھے اور اگر کبھی کسی وزیر یا سفیر کو ''مولدِ اقبال'' دکھانے کی ضرورت ہوتی تھی تو بڑی آسانی سے یہ کام ہو جاتا تھا۔ اصل مسئلے نے سر تو اس وقت اٹھایا' جب میری نانی جان ۱۹۵۹ء میں رحلت فرما گئیں اور باقی افراد کے دوسری جگہوں پر منتقل ہو جانے کے بعد مکان کے صدر دروازے پر تالا ڈال دیا گیا۔ اب اگر کوئی وزیر یا سفیر سیالکوٹ آتا اور حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے آبائی مکان ''اقبال منزل'' کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو اربابِ بست و کشاد کے لیے بہت بڑی پریشانی کا سامان ہو جاتا' جب یہ معلوم ہوتا کہ مکان تو بند پڑا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو یہ معلوم کروایا جاتا کہ اس کو کیسے کھلوایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد راقم الحروف کی تلاش میں لوگ دوڑائے جاتے کیونکہ ان دنوں اقبال منزل کی کلید برداری میرے ذمہ تھی۔ اب اگر کسی طرح مجھ تک بروقت رسائی ممکن ہو جاتی تو تالا کھلتا' ورنہ بے نیل و مرام واپس لوٹنے

والے افسران سے سخت وسست سننا پڑتا۔ چنانچہ اس وجہ سے بھی یہ مطالبہ ایک بار پھر سر اٹھانے لگا کہ حکومتِ پاکستان اس جگہ کو قومی یادگار قرار دے اور مالکان سے خرید کر اس کا انتظام و انصرام خود سنبھالے تاکہ روز روز کی پریشانی ختم ہو۔ چنانچہ ۱۹۶۸ء میں سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر میاں اصغر علی نے میرے والدِ محترم سے رابطہ کیا اور MES کے ذریعے مکان کی مالیت کا اندازہ لگوایا گیا۔ جو ہر طرح کی جانچ پڑتال کے بعد انہوں نے ایک لاکھ پینسٹھ ہزار روپے (-/۱۶۵,۰۰۰ روپے) مقرر کی۔ میاں اصغر علی صاحب نے میرے والدِ گرامی سے اس سلسلے میں تفصیلی ملاقات کی اور خاندان کی طرف سے میرے والد نے پانچ لاکھ روپے (-/۵۰۰,۰۰۰ روپے) کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ مفصل رپورٹ جس میں مالکان کا مطالبہ زر بھی شامل تھا' حکومتِ پاکستان کو روانہ کر دی گئی۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی جس سے یہ شبہ تقویت پکڑتا جا رہا تھا کہ یہ معاملہ ایک بار پھر سرد خانے کی نذر ہو گیا۔ اچانک ۲۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایک خط ماموں اعجاز صاحب کی طرف سے موصول ہوا جس میں انہوں نے اطلاع دی کہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے اقبال منزل کو مالکان سے خریدنے کی ایک بار پھر کوشش ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک لاکھ پچیس ہزار روپے (-/۱۲۵,۰۰۰ روپے) قیمت لگائی گئی ہے اور میں نے حکومت کو اپنی طرف سے نیم رضامندی دے دی ہے۔ انہوں نے مزید لکھا کہ میرا یہ خط حصہ داروں کو پڑھوا دیں اور جن کو اس سے اتفاق ہو ان کے دستخط اس پر کروا کر واپس بھجوائیں تاکہ مزید کارروائی ہو سکے۔ چنانچہ میں نے اپنی والدہ محترمہ' خالہ عنایت' ممانی محمودہ اور افتخار بھائی کے دستخط کروا کر وہ خط ان کو واپس بھجوا دیا۔

اس سے یہ بات سامنے آئی کہ MES کے ذریعے ۱۹۶۸ء میں جو مارکیٹ ویلیو (Market Value) لگوائی گئی تھی' حکومت وہ قیمت بھی ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ کیونکہ ماموں اعجاز نے متذکرہ بالا خط میں یہ ذکر بھی کیا ہوا تھا کہ آرکیالوجی کے محکمہ والوں نے ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی ہے کہ انہوں نے سوا لاکھ روپے کی منظوری حکومت سے حاصل کر لی ہوئی ہے یعنی دوسرے الفاظ میں اگر وارثانِ اقبال منزل اس قیمت کو منظور کرنے میں حیل و حجت سے کام لیتے ہیں تو یہ معاملہ ایک بار پھر تعطّل کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاید شیخ اعجاز صاحب پر کسی طرف سے یہ دباؤ بھی ڈالا جا رہا تھا کہ اگر انکار کیا گیا تو حکومت کسی قانون کے تحت اقبال منزل کو قومی سرمایہ قرار دے کر اس پر بلا معاوضہ قبضہ بھی کر سکتی ہے۔ اس قسم کے حربے تو استعمال ہوا ہی کرتے ہیں مگر اس دور میں ایسی صورتِ حال پیدا

کر دیئے جانے سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس وقت کچھ ایسی حکومت ہی برسرِ اقتدار تھی۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ حکومت جو قیمت بھی کہے ہمیں غنیمت جان کر فوراً آمنا وصدقنا کہہ دینا چاہئے۔ میرے والد مرحوم ان سے متفق نہیں تھے اور ان کو یہ باور کرانے کی سعی ناکام کر رہے تھے کہ ہمیں اس طرح اونے پونے اقبال منزل کو نہیں دینا چاہئے۔ والدِ گرامی کا مؤقف مبنی برحق تھا کہ سوا لاکھ روپیہ جو حکومت ادا کرنا چاہ رہی ہے وہ تو اقبال منزل کی اس Estimated Value جو ۱۹۶۸ء میں پوری جانچ پڑتال کے بعد MES کے محکمہ والوں نے لگائی تھی' سے بھی کہیں کم ہے۔ اس لیے اگر تھوڑی کوشش کی جائے تو بہتر قیمت وصول ہو سکتی ہے۔ لیکن اس ساری تگ و دو سے کچھ حاصل نہ ہوا کیونکہ ماموں اعجاز صاحب محکمہ آرکیالوجی کو اپنی رضامندی پہلے ہی دے چکے تھے اور اسی قیمت پر اپنے اجداد کی اس قیمتی جائیداد کو ان کے حوالے کر دینے پر تلے بیٹھے تھے۔

چنانچہ ماموں اعجاز صاحب کی طرف سے ۲۹ اگست ۱۹۷۰ء کا تحریر کردہ ایک طویل وعریض خط موصول ہوا جس میں انہوں نے مکان کا حدود اربعہ اور چند دوسرے امور کے متعلق استفسار کیا ہوا تھا اور میرے چارج میں دیئے گئے حصہ داروں کے لیے انکم ٹیکس کے دفتر سے کلیرنس سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی ہدایت کی ہوئی تھی۔ اس خط کے موصول ہونے سے یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی کہ آخر کار اعجاز ماموں نے حکومتِ پاکستان کے آرکیالوجی کے محکمہ کو اقبال منزل کے تمام حصہ داروں کی جانب سے یہ عندیہ دے دیا ہے کہ انہیں ان کی طرف سے لگائی گئی قیمت یعنی ایک لاکھ پچیس ہزار روپے (-/۱۲۵,۰۰۰ روپے) منظور اور قبول ہے۔

اس دوران اعجاز ماموں کے کئی ایک خطوط اس سلسلے میں آئے' جن میں مختلف معلومات کے متعلق وہ لکھتے تھے جو یہاں سیالکوٹ کے مختلف دفاتر سے مطلوب تھیں۔ کئی قسم کے سرٹیفکیٹ اس سلسلے میں درکار تھے جو یہاں سے حاصل کر کے ان کو روانہ کر دیئے جاتے تھے۔ مگر اعجاز ماموں چونکہ خود ایک وکیل تھے اور ان کی ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی' اس لیے ہر بات میں قانونی پہلو تلاش کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں کوئی سی بھی معلومات یا سرٹیفکیٹ ان کو ارسال کرتا تو وہ ان کا ایسا آپریشن فرماتے کہ سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا اور مجھے پھر شروع سے آغاز کرنا پڑتا۔ اس سلسلے میں ان کے خطوط اور میرے جوابات کی ایک خاصی ضخیم فائل موجود ہے جو خاص طور پر اس ایک برس کے عرصے میں لکھے جاتے رہے۔ ان سب کا یہاں نقل کرنا ممکن نہیں چند ایک پر اکتفا کروں گا جو شاید دلچسپی کا باعث

ہوں گے ۔مثلاً ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کا لکھا ہوا مندرجہ ذیل خط دیکھئے:

B۔۲۱۳ فریئر سٹریٹ' کراچی ۔۴

۳۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء

عزیزم خالد۔ السلام علیکم

تمہارے ۱۳ اور ۲۲ اکتوبر کے لکھے ہوئے دونوں خط مل گئے ہیں۔ میں ۲ اکتوبر کو لاہور گیا تھا۔ ۸ کی شام کو واپس آیا۔ میں ۸ اکتوبر کو بعد دوپہر تمہاری خالہ عنایت کے ہاں گیا تھا۔ معلوم ہوا تم اسی دن واپس سیالکوٹ گئے ہو۔ عزیزم رشید کا جواب آ گیا تھا کہ "مکان کے بیعنامہ کے بارے میں آپ مختار ہیں۔ جو فیصلہ آپ کریں گے' اس کے ہم سب پابند ہوں گے" بعد غور میں نے یہی طے کیا کہ ان سب کے نام بھی بطور حصہ داران بیعنامہ میں درج ہونا چاہئیں لہٰذا جو مسودہ بیعنامہ آرکیالوجی کے محکمہ والوں نے بھیجا تھا' اس میں ان سب کے نام بھی درج کر کے میں نے محکمہ والوں کو بھیج دیا ہے۔ ڈائریکٹر آرکیالوجی سے ملاقات بھی ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اب وہ اس مسودے کو حکومتِ پاکستان کی وزارتِ تعلیم کے ذریعے وزارتِ قانون کو بھیجیں گے تاکہ وہ اس کو قانونی شکل دے دیں۔ جب وہاں سے مسودہ آئے گا تو وہ ہمیں مطلع کریں گے۔ مسودہ بیعنامہ میں ملکیت اس طرح درج کی ہے:

جائیداد		وارث	حصہ
(الف)	دکانیں ۷ عدد زیرِ مکان	اعجاز احمد	مکمل
(ب) مکان (اقبال منزل)		اعجاز احمد	۲/۹
	"	مختار احمد	۲/۹
	"	افتخار احمد و محمودہ بیگم	۲/۹
	"	وارثانِ آپا (اکبری) صاحبہ	۱/۹
	"	عنایت بیگم	۱/۹
	"	وسیمہ بیگم	۱/۹

۲۔ پراپرٹی ٹیکس کی ادائیگی کی رسید مل گئی ہے۔ -/۱۵۹ کا ڈرافٹ ارسال ہے۔ ٹیکس عاید کرنے کے لیے مکان

علیحدہ یونٹ ہونا چاہیے اور دکانیں علیحدہ یونٹ کیونکہ دکانوں کی ملکیت ایک شخص کی ہے اور مکان کی سب حصہ داران کی۔ اگر یہ دو یونٹ ہوتے تو ہمیں Capital Gains Tax میں فائدہ رہتا جیسا کہ خط کے اگلے پیراگراف میں بیان کروں گا۔ ٹیکسیشن کے محکمہ سے تحقیق کریں کہ کیا اب یہ علیحدہ علیحدہ یونٹ کرائے جا سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر ایسا ہو بھی سکتا ہو تو لمبی کارروائی ہوگی اور شاید اس مرحلہ پر یہ شاخسانہ کھڑا کرنا مناسب نہ ہو۔ ہاں نئے سال کی Assessment میں ان کو علیحدہ علیحدہ یونٹ بنوا کر Assessment کرائی جائے۔ اگر محکمہ میں کسی سے واقفیت ہو تو مشورہ کر کے مطلع کریں۔

۳۔ تمہارے ۲۲ اکتوبر والے خط سے معلوم ہوا کہ سیالکوٹ میں بھی Capital Gains Tax عاید ہے ....

مجھے تو ۷۰۔۱۲۔۳۱ تک تکمیل بیعنامہ کی امید نہیں لہٰذا انکم ٹیکس اور Excise & Taxation والوں سے دوبارہ سرٹیفکیٹ لینے ہوں گے۔ انکم ٹیکس سے جو سرٹیفکیٹ تم نے لیے وہ بھیج دیں تاکہ میں دیکھ لوں کہ وہ درست تھے یا نہیں۔ اس میں یہ درج ہونا چاہیے:

Certificate issued under section 3 of the transfer of property (Pakistan) Ordinance ،1947.

۴۔ دو تین دن ہوئے راولپنڈی میں عزیزہ نادرہ کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ عاصمہ اور زرینہ اس موقع کے لیے وہاں گئی ہوئی ہیں۔ گھر میں سب کو سلام و دعا اور اپنی والدہ کو بشریٰ کے ہاں لڑکی پیدا ہونے پر مبارکباد۔

خیر اندیش

اعجاز احمد

مندرجہ بالا خط میں جن معلومات کے لیے تحریر تھا' وہ حاصل کر کے میں نے انہیں ارسال کر دیں۔ مجھے پوری امید تھی کہ اس دفعہ لازماً ان کی تشفی ہو جائے گی۔ خدا کا شکر کہ میری امید بر آئی اور محنت ٹھکانے لگی کیونکہ ۲۹ نومبر کا لکھا ہوا ایک مختصر خط آیا جس میں ایسا ہی اظہار انہوں نے فرمایا۔ اس کے بعد تقریباً تین ماہ تک بالکل خاموشی چھائی رہی۔ ۲۷ فروری ۱۹۷۱ء کے خط میں اطلاع تھی کہ دو ایک مہینوں میں بیعنامہ مکان کا ہو جانے کا قوی امکان ہے' اس لیے تمام

متعلقہ سرٹیفکیٹ تیار کر لیے جائیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء کے خط کے ہمراہ بیعنامہ کے مسودے کی کاپی اور آرکیالوجی کے محکمہ کے ایک خط کی کاپی موصول ہوئی۔

B۔۲۱۳ فریئر سٹریٹ' کراچی ۔۴

۲۲ مارچ ۱۹۷۱ء

عزیزم خالد سلمۂ

بعد دعا واضح ہو کہ محکمہ آرکیالوجی کے لاہور والے دفتر سے آفیشل چٹھی مجھے ملی ہے کہ اپریل کے پہلے ہفتہ تک بیعنامہ کی تکمیل کر کے مکان کا قبضہ دینے کا انتظام کیا جائے۔ بیعنامہ کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے تو انکم ٹیکس والوں کی کلیرنس لینی ہے۔ تم نے اپنی خالہ عنایت' اپنی ممانی محمودہ بیگم' اپنی والدہ صاحبہ اور افتخار احمد کے کلیرنس سرٹیفکیٹ سیالکوٹ کے محکمہ انکم ٹیکس سے حاصل کیے تھے۔ ان کی میعاد گزر چکی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ محکمہ مذکور سے انہیں کلیرنس سرٹیفکیٹس پر بوقت ضرورت میعاد کی توسیع کرالی جائے گی۔ لہٰذا خط ملتے ہی تم میعاد کی توسیع کا انتظام کر لو۔ اگر ۳۰ جون ۱۹۷۱ء تک کی توسیع ہو جائے تو فبہا' ورنہ ۱۵ جون یا ۳۱ مئی تک ضرور توسیع کرائیں۔ آپا اکبری مرحومہ کے ورثا مختلف جگہوں پر رہتے ہیں۔ ان میں سے جو لاہور میں رہتے ہیں' ان کے کلیرنس سرٹیفکیٹ تو تمہارے ماموں مختار کوشش کر کے جلدی لے لیں گے لیکن رشید سرگودھا میں ہے اور وحید جہلم میں۔ دونوں ملازمت میں ہیں اور انکم ٹیکس گزار ہیں' اس لیے ان کے سرٹیفکیٹ ملنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اسی طرح میرے اور مختار کے سرٹیفکیٹ ملنے میں بھی وقت لگے گا۔ پھر زبیدہ سیالکوٹ میں' حمیدہ گجرات میں اور فہمیدہ گوجرانوالہ میں ہے۔ ان کے سرٹیفکیٹ بھی وقت لیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ تم عنایت بیگم' محمودہ بیگم' وسیمہ بیگم اور افتخار احمد کے سرٹیفکیٹس میں تکمیل بیعنامہ کی میعاد جتنی زیادہ ہو سکتی ہے' اتنی زیادہ کراؤ تا کہ بار بار توسیع نہ کرنا پڑے۔ محکمہ آرکیالوجی تو چاہتا ہے کہ اپریل کے پہلے ہفتے تک تکمیل ہو جائے لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا۔ بہر حال تم فوراً اس سلسلے میں کارروائی کرو۔

تکمیل بیعنامہ کے لیے دوسری بات جو ضروری ہے وہ محکمہ Excise & Taxation سے کلیرنس سرٹیفکیٹ لینا ہے۔ وہ بھی شاید تم نے لے لیا تھا۔ اب چونکہ Capital Gains Tax لگنا ہے' سنا ہے محکمہ والے وہ Tax وصول کر کے سرٹیفکیٹ دیں گے۔ یہ کام تمہارے ماموں مختار کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ خود کسی دن سیالکوٹ آ کر اس کا

انتظام کریں گے۔

مکان میں جو سامان ہے' اس میں سے جو سامان جدّی ہے اس کو ہم لوگ آرکیالوجی کے محکمہ کو بطور Donation دے دیں گے۔ لیکن چند چیزیں والدۂ تحسین کی ہیں اور کچھ دوسرے حصہ داران کی۔ ان چیزوں کو بھی مکان سے نکال کر مکان کا خالی قبضہ دینا ہوگا۔ کیا تمہارے مکان میں اتنی جگہ ہوگی کہ عارضی طور پر تمہارے مکان میں وہ سامان رکھا جاسکے؟

بیعنامہ کی رجسٹری کی تاریخ مقرر ہونے سے کچھ دن پہلے میں لاہور پہنچ جاؤں گا۔ پانچ چھ دن پہلے آرکیالوجی کے افسر کے ساتھ سیالکوٹ آنا ہوگا۔ پھر بیعنامہ کی رجسٹری والے دن بھی آنا ہوگا۔

محکمہ آرکیالوجی لاہور کے خط اور مسودہ بیعنامہ کی ایک ایک فوٹوسٹیٹ کاپی ملفوف ہے۔ ممکن ہے محکمہ انکم ٹیکس کو دکھانے کی ضرورت ہو۔ اگر ضرورت ہو تو دکھا کر واپس لے لیں۔

خط ملتے ہی پہلے تو خط پہنچ جانے کی رسید بھیجو تاکہ اطمینان ہو کہ خط مل گیا ہے۔ اس کے بعد سرٹیفکیٹ انکم ٹیکس کی توسیع ہونے پر مطلع کرو کہ کب تک توسیع ہوئی۔

باقی خیریت ہے۔ اپنے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو سب کی طرف سے سلام ودعا۔

خیر طلب

اعجاز احمد

مسودہ بیعنامہ کی جو فوٹوسٹیٹ کاپی متذکرہ خط کے ساتھ موصول ہوئی' اس میں تمام حصہ داران کے نام کچھ اس ترتیب سے درج کیے گئے ہیں:

1. Ijaz Ahmad s/o Sh. Atta Muhammad
2. Mukhtar Ahmad s/o Sh. Atta Muhammad
3. Inayat Begum w/o Ghulam Mohiuddin
4. Wasima Begum w/o Sufi Nazir Ahmad
5. Iftikhar Ahmad s/o Sh. Imtiaz Ahmad

6. Mahmuda Begum w/o Sh. Imtiaz Ahmad
7. Abdul Rashid s/o Sh. Fazal Ilahi
8. Abdul Waheed s/o Sh. Fazal Ilahi
9. Muhammad Saleem s/o Sh. Fazal Ilahi
10. Sughra Begum w/o Dr. Khawaja Ahmad
11. Zohra Begum w/o Sh. Muhammad Ismail
12. Zubaida Begum w/o Mr. Muhammad Shafi
13. Fahmida Begum w/o Dr. Abdul Hameed Irfani
14. Hamida Begum w/o Mr. Nazir Ahmad

جائیداد کے متعلق مندرجہ تفصیل بیعنامہ میں درج کی گئی ہے:

Whereas the vendors are, according to shares shown below, in possession as absolute and sole owners of the property known as "Iqbal Manzil" situated in Iqbal Bazar, Sialkot City, Tehsil & District Sialkot in which the late Dr. Sir. Muhammad Iqbal was born.

قیمت کے متعلق تفصیل اس طرح دی گئی ہے:

And whereas the vendors have agreed with the vendee for the absolute sale of the said property for the sum of Rs. 125,000.00 (Rupees One lak and twenty five thousand only)

حصہ داروں کے حصص کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

Shares of the vendors:

1. Ijaz Ahmad : Seven Shops Under the

House & 2/9 share in the House

2. Mukhtar Ahmad 2/9 share in the House

3. Inayat Begum 1/9 share in the House

4. Wasima Begum 1/9 share in the House

5. Iftikhar Ahmad 2/9 share in the House

6. Mahmuda Begum 2/9 share in the House

7. Abdul Rashid 1/9 share in the House

8. Abdul Waheed Najmi1/9 share in the House

9. Muhammad Saleem 1/9 share in the House

10. Sughra Begum 1/9 share in the House

11. Zohra Begum 1/9 share in the House

12. Zubaida Begum 1/9 share in the House

13. Fahmida Begum 1/9 share in the House

14. Hamida Begum 1/9 share in the House

بیعنامے کے مسودے کے ساتھ محکمہ آرکیالوجی کے جس خط کی فوٹو کاپی موصول ہوئی تھی، اس میں اپریل کے پہلے ہفتے میں رجسٹری کروانے کے متعلق انہوں نے لکھا تو ضرور تھا مگر کوئی حتمی تاریخ مقرر نہیں کی تھی۔ اس لیے اپریل میں رجسٹری ہو جانے کا امکان اتنا قوی نہیں تھا۔ مگر اعجاز ماموں جان نے ایک بار پھر حسب عادت جلدی مچا دی تھی کہ تمام سرٹیفیکیٹ تیار کروا لیے جائیں حالانکہ ان کے اپنے اور دوسرے حصہ داران کے سرٹیفیکیٹ ابھی تیار نہیں تھے جب کہ یہاں دو دفعہ تجدید بھی کروائی جا چکی تھی۔ بیعنامہ کے مسودے میں جس طرح ہر حصہ دار کے حصہ کا اندراج ہوا تھا، اس حساب سے ہر حصہ دار کو اس کا حصہ علیحدہ علیحدہ تیار کر کے سب حصہ داران کو دکھا دینے کے متعلق ہدایت بھی اعجاز

ماموں جان نے مجھے دی تھی۔خاص طور پر ان چار حصہ داران کو مطمئن کرنے کے لیے جن کا چارج میرے پاس تھا۔
چنانچہ میں نے مندرجہ ذیل تفصیلات تیار کر کے سب کو دکھا دیں:

Total Value of the Property

Value of 7 shops under the house : Rs. 25,000/-

Value of the house : Rs. 100,000/-

Total Value : Rs. 125,000/-

(Rs. One Lak twenty five thousand only)

1. Sh. Ijaz Ahmad 7 Shops Rs. 25,000/-
   2/9 Share Rs. 22,222.23
2. Sh. Mukhtar Ahmad 2/9 Share Rs. 22,222.22
3. Inayat Begum 1/9 Share Rs. 11,111.11
4. Wasima Begum 1/9 Share Rs. 11,111.11
5. Iftikhar Ahmad 2/9 Share Rs. 22,222.22
6. Mahmuda Begum 2/9 Share Rs. 22,222.22
7. Abdul Rashid (14) 1/9 Share Rs. 11,111.11

Total: Rs. 125,000/-

14 of:

1. Abdul Rashid 2/8 of 1/9 Share Rs. 2,020.21

2.	Abdul Waheed	2/8 of 1/9 Share	Rs. 2,020.20
3.	M. Saleem	2/8 of 1/9 Share	Rs. 2,020.20
4.	Sughra Begum	1/8 of 1/9 Share	Rs. 1,010.10
5.	Zohra Begum	1/8 of 1/9 Share	Rs. 1,010.10
6.	Zubaida Begum	1/8 of 1/9 Share	Rs. 1,010.10
7.	Fahmida Begum	1/8 of 1/9 Share	Rs. 1,010.10
8.	Hamida Begum	1/8 of 1/9 Share	Rs. 1,010.10
	Total:		Rs. 11,111.11

آخر ۵ مئی کے لکھے ہوئے اعجاز ماموں کے خط سے یہ اطلاع ملی کہ اقبال منزل کے بیعنامہ کی تکمیل کے لیے ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء مقرر ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ضروری انتظامات کو آخری شکل دے دی جائے۔ چنانچہ تمام کاغذات مکمل کروا لیے گئے اور دوسرے انتظامات کے متعلق بھی حتمی طور پر احتیاط کر لی گئی۔ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کو سب لوگ اقبال منزل میں جمع ہوئے۔ میرے خیال میں بہت طویل عرصہ کے بعد اقبال منزل نے اپنے جگر گوشوں کو اتنی زیادہ تعداد میں یکجا دیکھا۔ بیعنامہ کی رجسٹری کے لیے سیالکوٹ کے تحصیل بازار میں واقع تحصیل بلڈنگ میں سب حصہ داران پہنچے اور تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دن یہ کام مکمل ہوا۔ واپس اقبال منزل پہنچ کر دوپہر کا کھانا کھایا گیا، جس کا انتظام بڑے احسن طریق سے کیا گیا تھا۔ بالکل چھوٹی موٹی شادی کا اہتمام تھا۔ آخر ہماری پیاری اقبال منزل ہم سے جدا ہو رہی تھی، اس کے لیے اس کے شایانِ شان انتظام تو ہونا چاہیے تھا۔ شام تک تمام کارروائی مکمل ہوئی اور مکان کی چابیاں محکمۂ آرکیالوجی کے سپرد کر دی گئیں۔ گھر واپس پہنچ کر میں نے ایک مختصر سا نوٹ لکھ کر اس فائل میں لگایا جس میں اقبال منزل کی فروخت کے سلسلے میں تمام کاغذات اور خطوط محفوظ کیے گئے تھے۔ اس میں ۲۷ مئی کی ساری روداد درج ہے کہ کس کس طرح مرحلہ وار یہ دن گزرا اور کس کس طرح تمام کام انجام پائے۔ مگر اس کا آخری پیراگراف

تھوڑا سا جذباتی ہو کر تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں میرے اس روز کے احساسات کا ایک ہلکا سا پرتو نظر آتا ہے۔

آپ بھی یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''آج بروز جمعرات مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء اقبال منزل سیالکوٹ کی رجسٹری ہوئی اور تقریباً ایک صدی بعد یہ جگہ کسی دوسرے کی ملکیت قرار پائی۔ مظاہرِ فطرت نے بھی اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور شام ۷ بجے کے قریب بڑے زور کی آندھی آئی اور ساتھ ہی بجلی بند ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اندھیرے میں وہاں سے سب روانہ ہوئے اور اقبال منزل جس کے ذرّے ذرّے سے ہمیں محبت ہے اور جس کے ہر گوشے میں یادوں کی ایک بارات سجی ہے' کی سیڑھیاں مالکان کی حیثیت میں آخری بار اترے۔ سب ہی دلگیر تھے مگر میری والدہ اور خالہ عنایت برداشت نہ کر سکیں اور اونچی اونچی رونے لگیں''۔

(۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کو لکھے گئے ایک طویل نوٹ کا آخری پیراگراف)

یوں اقبال منزل کی ملکیت کا ایک باب ختم ہوا اور خاندانِ اقبال کے ہاتھوں سے نکل کر اب یہ حکومتِ پاکستان کی ملکیت قرار پائی۔

زبوں حال اقبال منزل

(جب میں نے تقریباً ۲۸ برس بعد ۱۹۹۸ء میں اس کو دیکھا)

۲۷ مئی ۱۹۷۱ء بروز جمعرات وہ دن تھا' جب آخری بار تقریباً ۳۲ سالہ طویل رفاقت کے بعد میں نے اس منزل سعید کو الوداع کہا تھا۔ ایک طویل عرصہ گزر گیا' میں کبھی پلٹ کر اس طرف نہیں آیا۔ کیونکہ اپنے بچپن کی دوست اور جوانی کی ساتھی کو کسی دوسرے کے زیرِ نگیں دیکھنا شاید گوارا نہ ہوا اور پھر آہستہ آہستہ میں نے نہ صرف اس بازار میں جانا چھوڑا بلکہ اس شہر کو اس ملک کو خیر باد کہہ دیا اور مئی ۱۹۷۷ء میں متحدہ عرب امارات میں جا بسا۔ تقریباً بیس برس وہاں مقیم رہنے کے بعد جب ۱۹۹۶ء کے اواخر میں واپس سیالکوٹ لوٹا ہوں تو بھی اقبال منزل سے تجدید ملاقات کی ہمت پیدا نہ کر سکا۔ یہ میری مراجعت کے تقریباً ڈیڑھ برس بعد کی بات ہے کہ میرے عزیز دوست چوہدری ریاست علی ۱۶ مارچ ۱۹۹۸ء کو مجبور کر کے یہاں لائے اور تقریباً ۲۸ برس بعد ایک بالکل نئے راستے سے اس میں داخل ہوا۔ جیسا کہ بزرگوں سے سنا ہوا ہے تعمیرِ نو سے قبل بازار کی طرف راستہ ہوا کرتا تھا جو بعد میں بند کر دیا گیا اور وہاں دوکان بنا دی گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انقلابِ زمانہ سے ایک دفعہ پھر بازار کی طرف سے منزل زیریں میں جانے کے لیے راستہ بنا دیا گیا ہے۔ گو اب یہ راستہ سیدھا صحن میں جانے کے بجائے پہلے اس کمرۂ مطالعہ میں کھلتا ہے جو تمام دکانوں کو ملا کر ایک طویل ہال کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ گھر کے اندر صحن میں جانے کے لیے اسی میں سے راستہ ہے۔

جیسے ہی میں اقبال منزل کے صحن میں داخل ہوا' میں نے ایک دفعہ پھر خود کو اپنی بچپن کی اسی جنتِ ارضی میں محسوس کیا جہاں گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہروں میں ہم سب پر سکون قیلولہ سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ سارا ماحول ویسے کا ویسا ہی ہے۔ وہی سرخ اینٹوں کا چمکتا ہوا فرش' وہی شناسا در و دیوار' وہی دالان وہی کوٹھڑیاں ...... نانا جان کی پیدائش والا کمرہ' ڈیوڑھی ...... مگر یہ کیا ڈیوڑھی کی چھت Scaffolding کے سہارے کھڑی کی گئی ہے جس کی وجہ سے اس کا سارا حسن ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ میرے استفسار پر بتایا گیا کہ چھت بہت کمزور ہے اس لیے سہارا دینے کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے۔ یہ دریافت کرنے پر کہ کیا یہ عارضی انتظام ہے؟ جواب ملا کہ شاید اب یہ مستقل ہی رہے۔ کیونکہ فی الحال کسی قسم کی مرمت کا کوئی ارادہ نہیں۔ خیر وہاں سے دوسری منزل میں جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے

گلیارے میں پہنچا۔ وہی پرانی سیڑھیاں جن پر اپنے بچپن اور لڑکپن میں سارا دن بھاگ کر چڑھا اور اترا کرتا تھا۔ آج امتدادِ زمانہ نے انہیں اس قدر دشوار بنا دیا کہ اس کے وہی قدمچے آج مجھے اس قدر اونچے اور دشوار محسوس ہوئے کہ اوپر پہنچتے پہنچتے میرا سانس بے ترتیب ہو ہو گیا...... یا شاید اس مقام پر جاتے ہوئے جو ہمیشہ مجھے سب سے زیادہ پسند اور عزیز رہا' میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا۔ دوسری منزل میں پہنچ کر سب سے پہلے اس طرف سے تختوں والا کمرہ جو پہلے "بے جی کا کمرہ" کہلاتا تھا اور بعد میں زنانہ نشست گاہ اور ایک قسم کا Living Room بن گیا تھا۔ یہی وہ کمرہ ہے جہاں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اپنے قیامِ سیالکوٹ کے دوران سوتے تھے۔ تختوں کے اوپر ایک پلنگ بچھا ہوتا تھا جس پر چھوٹے نانا جان استراحت فرماتے تھے۔ اسی کمرے میں گھریلو محفل جمتی تھی۔ بچپن میں یہی کمرہ ہم سب کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔ رات کو جب زیادہ مہمان آ جاتے تو انہی تختوں پر "محمدی بستر" (فرشی بستر) لگا کر مستورات اور بچے سوتے تھے اور خوب ہنگامہ ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ تصور میں لیے جیسے ہی میں اس میں داخل ہوا تو ایک دم بھونچکا سا رہ گیا۔ مجھے شک ہوا کہ کیا یہ وہی تختوں والا کمرہ ہے یا میں کسی غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔ سب سے پہلے تو وہاں کسی چوبی تخت کا نام و نشان ہی نہیں۔ دوسرے وہ کمرہ ہی وہاں موجود نہیں۔ وہ چکور کمرہ جس میں چوبی تخت بچھے ہوتے تھے' واقعتاً وہاں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ کمرہ دراصل بالکل ڈیوڑھی کے اوپر واقع تھا۔ اس کے ساتھ ایک صندوقوں والا کمرہ تھا۔ یہ بالکل مولدِ اقبال کے اوپر تھا۔ مگر اب وہاں ان دو کمروں کی بجائے صرف ایک لمبی سی بارک نما چیز بن گئی ہے۔ کیونکہ دونوں کمروں کی درمیانی دیوار نکال دی گئی ہے اور دونوں کمروں کا وہ حسن' ان کی لمبائی اور چوڑائی کا وہ تناسب ختم ہو گیا ہے۔ یہ لمبوترا سا کمرہ نما' جسے کمرہ کہتے ہوئے مجھے بے حد تکلیف ہو رہی ہے' لمبائی بہت زیادہ اور چوڑائی بالکل کم۔ تناسب اس طرح بالکل غلط ہو گیا ہے۔ اتنی لمبائی کے ساتھ چوڑائی دگنا ہونا چاہئے۔ درمیانی دیوار نکال دینے کی وجہ سے اردگرد کی دیواریں سروں پر لٹکتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہیں۔ کمرے کا فرش بھی بالکل برباد ہو گیا ہے۔ دروازے عجیب کسمپرسی کی حالت میں شکست و ریخت کا شکار ہیں۔ گلی کی جانب کھلنے والی کھڑکیوں کو پردوں کے پیچھے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ ان کی حالت دروازوں سے بھی بدتر ہے' اس لیے بہتر ہے کہ ان پر نظر ہی نہ پڑے۔ مجھے اس پہلے کمرے کو دیکھ کر ہی ایک دھچکا سا لگا مگر ابھی اور بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔

صحن عبور کر کے جب میں میاں جی کے کمرے میں داخل ہوا...... اندر پہنچ کر یوں محسوس ہوا کہ اینٹ اور سیمنٹ کی بنی

ہوئی دیواروں کی بجائے کسی گتے کے بنائے ہوئے کمرے میں جس طرح کہ فلموں کے سیٹ پر عارضی کمرے سے بنائے جاتے ہیں' میں کھڑا ہوں۔ یہاں بھی وہی کچھ کیا گیا ہے۔ دونوں جانب کی درمیانی دیواریں نکال دی گئی ہیں اور ان کی جگہ شاید پلائی وڈ یا ہارڈ بورڈ کی دیواریں کھڑی کرنے کی بھونڈی سی کوشش کی گئی ہے۔ دیواروں کے ساتھ وہ قدِ آدم چوبی الماریاں بھی گئیں۔ ساتھ والا کمرہ جو "اباجی" کا کمرہ ہوا کرتا تھا' بھی یہی منظر پیش کر رہا ہے کہ "میاں جی" والے کمرے کی دیوار غائب ہوئی تو اس کمرے کی وہ دیوار بھی گئی جو دونوں کمروں کے درمیان تھی چنانچہ اس جانب بھی وہی پلائی وڈ۔ اس دیوار میں اس کمرے کی جانب جو دو الماریاں نایاب کتب سے بھری ہوئی تھیں' وہ بھی غائب۔ اسی طرح دوسری طرف والی درمیانی دیوار جو سیڑھیوں اور مردانہ نشست گاہ کے درمیان تھی' ایک طرف سے غائب۔ یہاں "اباجی" کے کمرے کے ساتھ ملحقہ غسلخانہ تھا۔ وہاں سے مردانہ نشست گاہ کو راستہ بنا دیا گیا ہے اور ایک الماری دوسری جانب سے غائب مگر اب وہاں بھی وہی پلائی وڈ لگانے کی کوشش۔ یعنی تمام کمروں کی علیحدہ علیحدہ حیثیت ختم کر دی گئی ہے...... کیوں؟ شاید جس طرح زیریں منزل میں کمرۂ مطالعہ بنایا گیا ہے۔ یہاں اوپر بھی اسی جگہ ویسا ہی طویل ہال بنایا گیا اور پھر اس کو اس کی قدیم صورت میں واپس لانے کی کوشش کی گئی...... اول تو یہاں ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اگر مان لیا جائے کہ ایسی کوئی ضرورت تھی اور اس کے لیے درمیانی دیواریں ہٹا دی گئیں مگر بعد میں پھر یہ Portable دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش چہ معنی دارد؟ جب ان کمروں کی اصل شکل تبدیل کر ہی دی گئی تو پھر ان کو اس غیرفنی طریقے سے واپس لانے کی کوشش کیوں؟ کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔

بتایا گیا کہ اقبال منزل کی کافی مرمت وغیرہ کی گئی کیونکہ اس کی باہر والی دیواریں خاص طور پر گلی کی طرف والی دیوار بالکل شکستہ ہو گئی تھی اور پوری عمارت کے منہدم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس وقت کی انتظامیہ نے بہت مشکل سے اور بڑا پیسہ خرچ کر کے اس کو بچایا جس کے لیے گلی کی جانب لوہے کے بڑے بڑے گارڈر لگا کر دیوار کو سہارا دیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیواریں آخر کیوں پھٹ گئیں...... کہتے ہیں کہ بنیادوں میں پانی چلا گیا' اس لیے......مگر میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب تمام کمروں کی درمیانی دیواریں ہٹا دی گئیں......نہ صرف دوسری منزل بلکہ زیریں منزل میں بھی دکانوں میں بھی یہی عمل دہرایا گیا......تو تمام چھتوں کا بوجھ باہر کی دیواروں پر منتقل ہو گیا جو یقیناً ان دیواروں کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوا۔ اس لیے ان کا منہدم ہو

جانے کا ارادہ کوئی ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایک دیوار پر اس کی طاقت سے سوگنا زیادہ وزن ڈال دیا جائے گا تو وہ اگر زمین بوس نہیں ہوتی تو کم از کم اس میں دراڑیں تو ضرور پڑنی چاہئیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس بے دردی سے قومی سرمایہ کا ضیاع یہاں ہوا ہے کہ پہلے تو مکان کی تقریباً تمام اندرونی دیواریں نکال کر ان کی اینٹیں، لکڑی، دروازے، الماریاں وغیرہ فروخت کردی گئیں جو یقیناً خرد برد کے زمرے میں آئے گا۔ پھر اس کی وجہ سے مکان کی دوسری دیواریں پھٹ گئیں اور زمین بوس ہونے کی تیاری کرنے لگیں۔ چنانچہ ان کی مرمت اور لوہے کے گارڈر وغیرہ لگانے کا کام شروع کردیا گیا اور خدا جانے کس قدر سرمایہ اس کی نذر رہوا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ سب کچھ حقیقی ضرورت کے تحت کیا گیا ہوگا۔ آئندہ صفحات پر دو ایک نقشوں کی مدد سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کمروں کی درمیانی دیواریں نکال دینے سے کیا صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے۔

منزلِ زیریں (پہلی منزل)

کمرۂ مطالعہ اور دفتر پہلے سات دکانات پر مشتمل تھا۔ اب تمام درمیانی دیواریں نکال دی گئی ہیں اور یہ ہال کمرہ مطالعہ کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔ اندر جانے کے لیے ایک نیا دروازہ نکالا گیا ہے اور دوسری منزل میں جانے ولی سیڑھیاں بند کردی گئی ہیں۔

بالا خانہ (دوسری منزل)

۱، ۲، ۳، اور ۴ دیواریں کمروں سے ہٹا دی گئی ہیں۔ ۲، ۳، اور ۴ کی جگہ اب پلائی وڈ کی عارضی دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں۔ ۱۔ پر کوئی عارضی دیوار وغیرہ نہیں لگائی گئی جس کی وجہ سے دو کمرے مل کر ایک ہوگئے ہیں۔

تختوں والا کمرہ

درمیانی دیوار نکال دیئے جانے کی وجہ سے بالکل ختم ہوگیا ہے اور نہ ہی اب وہاں کوئی تخت وغیرہ ہی موجود ہیں۔ یعنی گھر کے اس مرکزی کمرے کا وجود ہی ختم کردیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں میں نے تمام گھر کو بالکل خالی پایا۔ جو سامان اس کی فروخت کے وقت محکمۂ آثارِ قدیمہ کی خواہش پر Donate کیا گیا تھا، وہ ناپید ہے۔ وہ خاندانی تصاویر جو تمام کمروں میں چوبی فریموں میں آویزاں تھیں، تقریباً سب کی سب غائب ہیں۔ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے کمرے جن کی دیواریں تک نوچ لی گئی ہیں، بے سروسامان

پڑے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں اس میں موجود تمام چیزیں اس لیے Donate کی گئی تھیں تا کہ اس کو یعنی اقبال منزل کو اپنی اصلی صورت میں محفوظ کیا جائے جیسا کہ یہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے والدین کے وقت سے چلی آ رہی تھی۔ تا کہ اسے صرف مولدِ اقبال کی حیثیت میں ہی نہیں بلکہ خاندانِ اقبال کی بود و باش کے لحاظ سے بھی محفوظ کیا جائے۔ موجودہ حویلی کا بڑا حصہ اور خاص طور پر سب سے قدیم حصہ ۱۹۱۰ء میں تعمیر کیا گیا یعنی والدہ ماجدہ اقبال بھی تقریباً چار برس بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں یہاں ہی فوت ہوئیں۔ والدِ ماجد اقبال تو ۱۹۳۰ء تک یہیں قیام پذیر رہے جب کہ پوری حویلی کی تکمیل ۱۹۱۵ء تک ہو چکی تھی۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ تقریباً ہر سال موسمِ گرما کی تعطیلات یہیں گزارتے رہے۔ اس لیے یہ جگہ صرف مولدِ اقبال ہی نہیں بلکہ مسکنِ اقبال بھی ہے۔ یہاں کے در و دیوار وہی ہیں جنہیں شاعرِ مشرق کی رہائش گاہ ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ اس لیے اس کو اسی طرح آراستہ رکھنا چاہئے تھا جیسا کہ یہ اس وقت ہوا کرتی تھی۔ مگر یہاں تو کوئی ایسی بات چھوڑی ہی نہیں گئی۔ شاید یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا گیا ...... میں نہیں کہہ سکتا کہ شاید اربابِ بست و کشاد کے پیشِ نظر کوئی بہتر منصوبہ رہا ہو مگر عملاً اس کا نفاذ غلط اور غیر محتاط ہاتھوں میں دے دیا گیا جنہوں نے اس کی افادیت اور اہمیت کو تباہ کر دیا۔ میرے خیال میں یا تو اس منصوبے کو جس کے تحت یہ تمام غلط اقدامات' جو اس وقت یہاں نظر آ رہے ہیں' کو ختم کیا جائے یا پھر اسے پوری طرح مکمل کیا جائے۔ مگر خدا کے لیے یہ پلائی وڈ کی دیواریں یہاں سے ہٹائی جائیں۔ یا تو ان کی جگہ اینٹ اور سیمنٹ کی دیواریں کھڑی کی جائیں اور ان کمروں کی اصل حالت بحال کی جائے یا پھر جو نیا منصوبہ بنایا گیا تھا' اسے مکمل کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح کی پلائی وڈ کی ٹکڑے ٹکڑے دیواریں اقبال منزل کے حسن کو پامال کر رہی ہیں۔ یہ کمرے' اگر اب بھی وہ کمرے کہلانے کے مستحق ہیں کیونکہ اصل دیواروں کے نکل جانے کے بعد ان کی وہ اصل حالت بالکل ختم ہو چکی ہے اور وہ کسی طرح بھی علیحدہ علیحدہ کمروں کا تصور پیش نہیں کر رہے۔ پلائی وڈ یا چپ بورڈ کی جو پارٹیشن ان میں لگائی گئی ہیں' وہ عجیب مضحکہ خیز صورت پیدا کر رہی ہیں۔ ان بے رونق کمروں کی پرانی شان و شوکت واپس لائی جائے یا پھر ان کی یہ یتیمانہ حیثیت ختم کی جائے۔ اس روز اقبال منزل کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ یہ وہ اقبال منزل نہیں جسے میں ۱۹۷۱ء میں چھوڑ کر گیا تھا ...... یہ تو ایک ویران سرائے ہے جس کے در و دیوار تک نوچ لیے گئے ہیں۔ وہ ایک بے کس بیوہ کی طرح نظر آئی جس کا سب کچھ لٹ چکا ہو۔ بے رحم لٹیرے اس کو تہس نہس کر گئے ہیں ...... میں نے اس منزلِ سعید کو

اس حالت میں تو نہیں چھوڑا تھا...... اس کے باقی ماندہ بام و در مجھے زبانِ حال سے نوحہ کناں محسوس ہوئے جیسے چیخ چیخ کر اپنی بربادیوں کی داستان سنانا چاہ رہے ہوں۔ وہ پیارے پیارے دالان اور روشن وہوادار کمرے جن کے ہر گوشے سے میری بے شمار حسین یادیں وابستہ ہیں' اپنی زبوں حالی سے نڈھال نظر آئے۔

یوں تو پوری حویلی ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے مگر خاص طور پر دوسری اور تیسری منزل بے حد خراب حالت میں ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ کر لٹک چکی ہیں۔ شاید کبھی ان پر رنگ وروغن نہیں ہوا۔ دروازوں کے خوبصورت ہینڈل اور چٹخنیاں یا تو ٹوٹ چکے ہیں یا اکھاڑ لیے گئے ہیں۔ اول تو تمام الماریاں دیواروں کے ساتھ ہی گئیں۔ اگر کوئی غلطی سے باقی بچ گئی ہے تو وہ انتہائی خستگی کا شکار ہے۔ صحن کے جنگلے بالکل تبدیل کر دیے گئے ہیں اور ان کی وہ خوبصورت جالیاں' سننے میں آیا ہے کہ کسی کباڑیے کی دکان پر بکتی رہی ہیں۔ بازار کی طرف والی بالکنی بالکل خستہ حالت میں ہے اور اس کا چوبی جنگلہ ٹوٹ رہا ہے۔ میرا پسندیدہ ملکڑی کا وہ خوبصورت کمرہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہے۔

مندرجہ بالا تمام شکست وریخت کے متعلق لکھتے ہوئے میں خود کو کس قدر دکھی اور بے بس محسوس کر رہا ہوں' شاید کوئی اس کا اندازہ نہ کر سکے کیونکہ اقبال منزل کے ساتھ میرا تعلق بڑا عجیب قسم کا رہا ہے...... بچپن میں تو یہ میرے ننھیال تھے مگر جوانی میں اس کا انتظام وانصرام میرے سپرد تھا۔ اس طرح اس کے ساتھ میرا دوہرا تعلق رہا۔ یعنی میرا بچپن اس کی گود میں گزرا تو جوانی میں میں نے اس کی بھرپور خدمت کی۔ اس لیے یہ منزل سعید میرے لیے صرف ایک مکان کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جس سے میری بے شمار سنہری اور روپہلی یادیں وابستہ ہیں۔ جنہیں بھلانا شاید میرے بس میں نہیں کہ آج اتنا طویل عرصہ گزر گیا کہ میں ۱۹۷۱ء میں اس کی فروخت کے بعد کبھی اس طرف نہیں آیا کہ پرانی یادیں تازہ ہوں گی تو دل میں اک ہوک سی اٹھے گی' مگر اب جب یہاں آ گیا ہوں' تو وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا...... وہ سارے واقعات ایک فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے رقصاں ہیں اور ماضی کے دریچوں سے وہ تمام یادیں دبے پاؤں میرے دل و دماغ پر چھاتی جا رہی ہیں۔ اس منزل سعید کے ساتھ میری رفاقت تقریباً بتیس برسوں پر محیط ہے اور ماہ و سال کی اس گردش میں اس کے در و دیوار نے مجھے جس اپنائیت کا احساس دیا شاید کوئی دوسری جگہ' کوئی دوسرا گھر اس کا نعم البدل کبھی بھی نہ بن سکے۔ دوسرے لوگوں کے لیے تو شاید یہ صرف ایک ایسا مکان ہے کہ جہاں مشرق کے عظیم شاعر اور مفکر نے جنم لیا' مگر میرے لیے تو یہ ایک دوست ہے' میرے بچپن کا گہوارا...... میرا جوانی

کا ساتھی۔میری روح آج بھی اس کے بام ودر میں بے تابانہ رقصاں رہنا چاہتی ہے' اس کی ایک ایک اینٹ کو چومنا چاہتی ہے' اس کے ایک ایک در کے ساتھ والہانہ لپٹنا چاہتی ہے۔کاش میں ان حسین لمحات کو واپس لا سکتا یا ان پرسکون روز و شب میں واپس لوٹ سکتا جب یہ صرف ایک مکان نہیں' بلکہ ایک شاد و آباد گھر تھا جس میں میں اپنے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کرتا رہا تھا۔کاش! مگر شاید یہ اب کسی طور ممکن نہیں کیونکہ میں انتہائی تلخ حقیقتوں کے ساتھ آج اس کے انہی بام ودر کے درمیان موجود ہوں اور وہ سب میرے لیے اس قدر اجنبی ہیں کہ ان سے آنکھیں ملاتے ہوئے بھی گھبرا رہا ہوں کہ کہیں وہ مجھ سے اس ظلم کا حساب نہ مانگ لیں جو گزشتہ طویل برسوں میں ان کے ساتھ روا رکھا گیا جس کی ذمہ داری کسی حد تک اگر بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ مجھ پر بھی ضرور عائد ہوتی ہے۔

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب!
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

(غالب)

باب پنجم

غلطی ہائے مضامین

۱۔ مضحکہ خیز نام

جاہلانِ مطلق کی بوالعجبیاں

۲۔ تحقیق بلا تحقیق

ماہرینِ الجھن وفریب

۳۔ خوش فہمی

مصنف ''روزگارِ فقیر'' کی اقبال ناشناسی

مضحکہ خیز نام

جاہلانِ مطلق کی بوالعجبیاں؟

یہاں جاہلانِ مطلق قسم کے مصنفین کی چند بوالعجبیاں پیش کی جا رہی ہیں جن کا مقصد اس قبیل کے احباب عقل و دانش کو بے نقاب کرنا ہے جونئی اور انوکھی باتیں منظر عام پر لانے کے جنون میں عجیب وغریب شاہکار تخلیق کرنے کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

''حیاتِ علامہ اقبال اور دو ہزار سوال و جواب'' نامی کتاب کے مرتب محمد کلیم ارائیں ایم اے ہیں اور یہ مکتبہ تعمیرِ انسانیت' اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۸ پر ایک سوال اور اس کا جواب اس طرح درج کیا گیا ہے:

''سوال: اقبال کے والد کے علاوہ شیخ محمد رفیق کے کتنے بیٹے زندہ رہے؟

جواب: کوئی بھی نہیں صرف شیخ نور محمد''۔!

یعنی حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے چچا شیخ غلام محمد اور ان کی اولاد کا وجود بیک جنبش قلم ختم فرما دیا گیا' حالانکہ خاندانِ اقبال کے شجرہ نسب میں' جو متعدد کتابوں میں شامل ہے' شیخ محمد رفیق کے دو صاحبزادوں شیخ نور محمد اور شیخ غلام محمد کے نام نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ غلام محمد مرحوم کا ذکر بھی بے شمار واقعات میں ملتا ہے۔ خاص طور پر جب علامہ علیہ الرحمۃ کی والدہ ماجدہ نے علامہ اقبال سے پہلے پیدا ہونے والا اپنا بچہ اپنی دیورانی کے ساتھ تبدیل کیا کیونکہ ان کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی ...... یہ دیورانی کون تھی؟ انہی شیخ غلام محمد صاحب کی بیوی ...... پھر علامہ صاحب کے دادا شیخ محمد رفیق اپنے انہی صاحبزادے شیخ غلام محمد کے پاس روپڑ (بھارت)' جہاں وہ ملازم تھے' گئے ہوئے تھے کہ وہیں وفات پائی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ شیخ غلام محمد مرحوم کی اولاد یہاں سیالکوٹ میں آباد ہے اور راقم الحروف کی شادی انہی شیخ غلام محمد صاحب کی پڑنواسی کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔

ایک دوسرا شاہکار جس سے محمد کلیم ارائیں صاحب کے عقل سے بالکل ہی پیدل ہونے کا بیّن ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

ان کی متذکرہ بالا کتاب کے صفحہ نمبر ۲۴ پر دیکھا جا سکتا ہے۔

''سوال: اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد کی بیوی کا کیا نام تھا؟

جواب: روایت بیگم۔

سوال: روایت بیگم کون تھیں؟

جواب: اقبال کی بڑی بھاوج''۔[1]

ہر پڑھنے والا اس عجیب وغریب نام ''روایت بیگم'' پر ایک بار تو ضرور چونکے گا' کیونکہ جہاں تک میرے علم میں ہے ایسا نام شاید ہی کبھی کسی نے رکھا ہو گا۔ اب دیکھنا یہ پڑے گا کہ جناب ارائیں صاحب نے یہ نام آخر کہاں سے حاصل کیا۔ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے صفحہ نمبر ۸ پر راقم الحروف نے ایک واقعہ اپنی نانی جان محترمہ مہتاب بی بی مرحومہ کی زبانی درج کیا تھا۔ چونکہ متذکرہ واقعہ کی روایت میری نانی جان محترمہ مہتاب بی بی صاحبہ جو حضرت علامہؒ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کی بیگم تھیں اور رشتے میں علامہ علیہ الرحمۃ کی بھاوج ہوتی تھیں' اس لیے اسی صفحہ نمبر ۸ پر ''حاشیہ'' میں اس کا تذکرہ کچھ اس طرح سے کیا گیا:

''روایت بیگم شیخ عطا محمد صاحب (علامہ اقبالؒ کی بڑی بھاوجہ)''۔[2]

اب اگر ان صاحب کا ''علم'' اس قدر محدوذ ہے کہ انہیں یہ تک معلوم نہیں کہ:

''روایت بیگم شیخ عطا محمد''

سے کیا مراد ہے تو اس میں کسی دوسرے کا کیا قصور؟ حیرت ہوتی ہے کہ یہ صاحب خود کو ''ماسٹر آف آرٹس'' (Post Graduate) ظاہر فرما رہے ہیں ...... ایں چہ بوالعجبی است؟

درحقیقت اس قسم کی بوالعجبیاں اس لیے سرزد ہوتی ہیں کہ اس قبیل کے لوگ مطالعہ کا درد بالکل نہیں پالتے اور ہر بات کو بلا تحقیق قبول فرما لیتے ہیں۔ اب اسی ضمن میں اگر وہ تھوڑا سا وقت نکال کر ''اقبال درونِ خانہ'' کا صرف سرسری نظر سے ہی جائزہ لیتے تو کئی ایک دوسرے مقامات پر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی بھاوجہ محترمہ کا درست نام انہیں ضرور مل جاتا کیونکہ کئی واقعات میں ان کا نام ''مہتاب بی بی'' صاف طور پر درج ہوا ہے تو یقیناً وہ اس عجیب وغریب نام کی تخلیق سے محفوظ رہتے اور ان کی علمیت کا پول اس طرح بیچ چوراہے میں نہ کھلتا۔ مگر اپنے ''علم'' کے زعم میں کچھ اصحاب اس

قدر ''پھول'' جاتے ہیں کہ انہیں اپنے آگے پیچھے کچھ بھائی ہی نہیں دیتا!

اسی قبیل کے ایک اور صاحب جناب ذکی احمد ذکی نے بھی ایسی ہی ایک کتاب مرتب فرمائی ہے اور اس کا نام ''علامہ اقبال کوئز'' رکھا ہے۔ مقامِ عبرت ہے کہ اپنی اس ''تخلیق'' کے حوالے سے وہ بے شمار اغلاط کے ''خالق'' بنے ہیں۔ اس وقت ان تمام کی تفصیلات میں جانا ممکن نہیں۔ صرف متذکرہ بالا شاہکار سے ملتا جلتا ان کا بھی ایک شاہکار دیکھیے۔ میرے خیال میں انہوں نے شاید ارائیں صاحب کی کتاب سے اسے نقل کیا ہے اور ''اندھی تقلید'' میں اپنی عقل کا استعمال بالکل بھول گئے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ ''نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے'' مگر جو عقل ہی سے پیدل ہوں' وہ بے چارے کیا کریں۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں بھی اسی تقلید میں یہ سوال و جواب صفحہ ۲۳ پر یوں درج فرمائے ہیں:

''سوال نمبر ۵۲: علامہ اقبالؒ کی بڑی بھاوج کا نام بتائیے؟

جواب نمبر ۵۲: روایت بیگم (بیگم شیخ عطا محمد صاحب)'' !

کم عقلی کا وہی مظاہرہ' تحقیق کے بغیر محقق بننے کا جنون' نئی بات پیش کرنے کے شوق میں اپنی علمیت کا جنازہ اپنے ہی کندھوں پر اٹھانے کی سعی نا تمام؟

میں یہاں محمد کلیم ارائیں صاحب ''ایم۔اے'' اور ذکی احمد ذکی صاحب جیسے ''صاحبان فراست'' سے اس قدر گزارش کرنا چاہوں گا کہ اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم ان بیچاری ڈگریوں کا ہی کچھ خیال فرما لیا کیجئے یا پھر اپنے ناموں کے ساتھ ان ''دُم چھلوں'' کا ذکر نہ فرمایا کیجئے تا کہ آپ کی کم علمی پر اگر کسی کا ماتم کرنے کو جی چاہے تو ان بے چاری ڈگریوں کی بے جا توہین کا مرتکب نہ ہونا پڑے......!

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تحقیقِ بلا تحقیق

(ماہرینِ الجھن وفریب)

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے صفحات ۱۹ اور ۲۰ پر ''میاں جی'' (والدِ اقبال) کا ذکر کرتے ہوئے عمر کے آخری حصہ میں ان کی چند عادات کا ضمناً ذکر کرتے ہوئے یوں تحریر کیا گیا تھا:

''آخر عمر میں میاں جی کو بڑے نانا جان (شیخ عطا محمد صاحب) اور بھابھی جی (بیگم شیخ عطا محمد صاحب) کے بغیر ایک پل چین نہیں آتا تھا..... ایک دفعہ چھوٹے نانا جان (علامہ مرحوم) کو درد گردہ کا شدید دورہ ہوا تو بڑے نانا جان مع بھابھی جی تقریباً ایک ماہ لاہور میں ان کے پاس مقیم رہے۔ سیالکوٹ میں میاں جی کے پاس ان کی بڑی صاحبزادی محترمہ فاطمہ بی بی صاحبہ' گھر کی دوسری خواتین اور بڑے پوتے شیخ اعجاز احمد صاحب تھے۔ میاں جی نے چند روز تو صبر کیا مگر پھر شور مچانے لگے کہ ''عطا محمد کو بلاؤ' مہتاب (بیگم شیخ عطا محمد) کو بلاؤ''۔ سب ان کو سمجھاتے کہ وہاں پر ان کی موجودگی ضروری ہے کیونکہ علامہ علیہ الرحمۃ بہت بیمار ہیں۔ وہ کچھ دیر تو خاموش رہتے لیکن پھر وہی مطالبہ شروع کر دیتے۔ کبھی ماموں اعجاز سے فرماتے کہ..... ''اگر میں فوت ہو گیا تو تم کیا کرو گے' لاؤ میرا کفن' میں خود تیار کر کے رکھ دوں ..... عطا محمد یہاں نہیں ہے' تم کہاں کفن تیار کرواتے پھرو گے؟'' اعجاز ماموں ان کو سمجھاتے کہ ''ابا جان لاہور ہی تو گئے ہیں' کون سے ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں''۔ لیکن وہ تو بہانے سے نانا جان اور نانی جان کو واپس بلانا چاہتے تھے۔ اگر اس طرح کامیابی نہ ہوتی تو پھر کہنے لگتے ..... ''تم لوگوں نے مجھے بھوکا مار دیا ہے' دودھ میں پانی ملا دیتے ہو..... جلدی عطا محمد اور مہتاب کو بلاؤ ..... میں تمہارے ہاتھ کی کوئی چیز نہ کھاؤں گا''۔ آخر نانا جان قبلہ اور نانی جان جنت مکانی واپس تشریف لائے اور میاں جی کا اضطراب ختم ہوا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل ان کی بینائی بالکل ختم ہو گئی اور ضعیفی اس قدر تھی کہ سارا وقت اپنے بستر پر بیٹھے ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ اسی زمانے میں انہیں یہ وہم ہو گیا کہ انہیں وقت درست نہیں بتایا جاتا۔ اگر دن کے نو بجے دریافت کرتے کہ کیا وقت

ہوا ہے اور کوئی بتاتا کہ صبح کے نو بجے ہیں تو آپ بضد ہوتے کہ نہیں یہ تو رات کے نو ہیں۔ تم سب غلط بیانی کرتے ہو...... لاؤ رات کا کھانا لاؤ...... انہیں کہا جاتا کہ ابھی تو آپ نے ناشتہ کیا ہے' رات کا کھانا کہاں سے آئے گا' تو وہ کبھی نہ مانتے۔ سارا گھر سر پٹختا کہ یہ صبح کے نو ہی ہیں لیکن وہ نہ مانتے ...... اگر کبھی رات کو وقت پوچھتے اور بتایا جاتا کہ رات کے بارہ بجے ہیں تو وہ کہتے نہیں یہ تو دن کے بارہ بجے ہیں۔ لاؤ دوپہر کا کھانا لاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ اب خواہ کوئی کچھ کرے' وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے کہ یہ رات کے بارہ ہیں''۔!

اتنا طویل اقتباس نقل کرنے سے مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مندرجہ بالا واقعات حضرت علامہؒ کے والد جناب شیخ نور محمد مرحوم سے متعلق ہیں۔ یہ ایک مسلسل پیراگراف ہے اور اس میں میاں جی کا ذکر متعدد بار آیا ہے تاکہ پڑھنے والا اس کے تسلسل کو محسوس کرتا رہے۔ مگر یہاں ایسے ایسے عقل سے پیدل محققین پائے جاتے ہیں جو تحقیق کے نام پر ہر وقت نئی سے نئی بات کی ٹوہ میں لگے رہتے اور اس طرح اکثر اوقات ان سے ایسے ایسے عجیب و غریب لطائف سرزد ہو جاتے ہیں کہ ان کی عقلِ نارسا کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسی قبیل کے ایک ''محقق'' جن کو حضرت علامہ اقبالؒ کے متعلق ایک کتاب تخلیق کرنے کا شوق چرایا کیونکہ انہوں نے جب دیکھا کہ ہر کس و ناکس آج کل اسی موضوع پر زورِ سخن صرف کر رہا ہے کہ یہ شاید آج کل سب سے آسان موضوع ہے کہ ادھر ادھر سے نقل کیجئے اور ''اقبال......'' کچھ بھی نام رکھیے اور کتاب تیار۔ چنانچہ ان ''نامحقق'' صاحب نے بھی اسی فارمولے کے تحت معلومات جمع فرمائیں اور ایک کتاب شائع کروادی۔ اب یہ سوچنا تو ان کا کام نہیں تھا کہ انہوں نے یہ معلومات کہاں سے حاصل کیں اور کس طرح ان کو مرتب فرمایا...... کیونکہ انہیں اس سے کچھ سروکار نہیں' یہ ان کا دردِ سر نہیں' انہوں نے ''بلا تحقیق'' ایک عدد کتاب ''یادِ اقبال'' کے نام سے مرتب کر ڈالی ...... باقی کا کام آپ کا ہے؟ اسمِ گرامی ان کا شاید ''صابر کلوروی'' ہے اور میرے پاس ان کی متذکرہ کتاب ایک میگزین کی تقطیع میں شائع شدہ پہنچی ہے جسے ''شاہکار کتاب'' والوں نے جو سید قاسم محمود صاحب کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے' مشتہر فرمایا ہے' یہ ان کی کتاب نمبر ۷۵ ہے اور ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء کو منظرِ عام پر آئی تھی۔

جناب صابر کلوروی نے اس میں کیسی کیسی بوالعجبیاں تخلیق فرمائی ہیں' ان کا تفصیلی ذکر تو یہاں شاید ممکن نہ ہو سکے گا مگر صرف ایک نمونہ یہاں پیش کرنے کی ''سعادت'' حاصل کی جا رہی ہے تاکہ اس قبیل کے نام نہاد دانشوروں کا پول کھل

سکے۔ صابر صاحب کے ساتھ ساتھ مجھے سید قاسم محمود صاحب سے بھی یہ شکوہ رہے گا کہ اگر وہ اپنی زیرِ ادارت اشاعت پذیر ہونے والی کتب کو ایک نظر دیکھ لیتے تو یقیناً ایسی صورتِ حال سے بچا جا سکتا تھا۔

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) سے جو طویل اقتباس گزشتہ صفحات میں نقل کیا گیا ہے اس کو مدِ نظر رکھیے اور دیکھیے کہ صابر کلوروی نے کس طرح اس کو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش فرمائی ہے...... اپنی متذکرہ کتاب ''یادِ اقبال'' میں انہوں نے اس واقعہ کے سارے پس منظر کو چھوڑ کر اور درمیان میں سے اس کا حوالہ لے کر اس کو علامہ صاحب کی ذاتِ گرامی کے ساتھ منسلک کرنے کی مذموم کوشش فرمائی اور ''یادِ اقبال'' کے صفحہ ۲۶ پر اس کو یوں درج فرمایا:

''خالد نظیر صوفی اپنی کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' میں رقمطراز ہیں:

وفات کے قریبی زمانے میں انہیں یہ وہم ہو گیا کہ انہیں وقت درست نہیں بتایا جاتا۔ اگر دن کے نو بجے دریافت کرتے کہ کیا وقت ہوا ہے اور کوئی بتاتا کہ صبح کے نو بجے ہیں تو آپ بضد ہوتے کہ نہیں یہ تو رات کے نو ہیں۔ تم سب غلط بیانی کرتے ہو...... لاؤ رات کا کھانا لاؤ...... انہیں کہا جاتا کہ ابھی تو آپ نے ناشتہ کیا ہے' رات کا کھانا کہاں سے آئے گا' تو وہ کبھی نہ مانتے۔ سارا گھر سر پٹختا کہ یہ صبح کے نو ہی ہیں لیکن وہ نہ مانتے...... اگر کبھی رات کو وقت پوچھتے اور بتایا جاتا کہ رات کے بارہ بجے ہیں تو وہ کہتے نہیں یہ تو دن کے بارہ بجے ہیں۔ لاؤ دوپہر کا کھانا لاؤ...... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ اب خواہ کوئی کچھ کہے وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے کہ رات کے بارہ بجے ہیں''۔!

صابر کلوروی صاحب نے یہ زحمت بالکل گوارا نہیں فرمائی کہ یہ پیراگراف ''اقبال درونِ خانہ'' میں کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کہاں پہ ختم ہوتا ہے۔ انہوں نے تو بس اپنے مطلب کا حصہ اس میں سے اڑا لیا اور اسے اس طرح شاملِ کتاب فرما دیا کہ یوں محسوس ہو کہ یہ تمام باتیں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے متعلق ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تاثر قائم ہو کہ عمر کے آخری حصہ میں اقبالؒ ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کس طرح خاموشی سے میٹھا زہر پھیلاتے ہیں۔ اپنی متذکرہ بالا کتاب میں یہ صاحب علامہ صاحب کے لیے رطب اللسان بھی ہیں مگر کہیں کہیں میٹھا زہر بھی تھوڑا تھوڑا غیر محسوس طریقے سے شامل کیا ہے مگر مندرجہ بالا اقتباس شامل کر کے تو انہوں نے انتہا ہی کر دی ہے...... ایسی دیدہ دلیری...... ایسی دل آزاری۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں
(جگر)

خوش فہمی

(مصنف ''روزگارِفقیر'' کی اقبال ناشناسی)

''روزگارِفقیر'' (جلد اول) کے مصنف فقیر سید وحید الدین نے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے مندرجہ بالا عنوان کے تحت ایک عجیب وغریب واقع منسوب فرمایا ہے اور اس کو کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے:

''لوگوں میں مشہور ہے کہ جو شخص حج کر لے اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔میں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک مرتبہ پوچھا:

''کیا یہ صحیح ہے کہ حج کرنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟''ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا..... ''نہیں یہ تو بالکل غلط ہے''۔میں نے عرض کیا تو ''حج کی غرض وغایت کیا ہے؟''جواب ملا..... ''بس خدا کا حکم ہے''۔بعد میں جب حج کی ضرورت واہمیت میرے ذہن نشین ہوئی تو مجھے سخت تاسف ہوا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اس قسم کا سوال ہی کیوں کیا تھا''۔!

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا ایک بڑا حقیقت افروز شعر ہے:

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

ان کا یہ روز کا معمول تھا کہ قرآنِ حکیم کی تلاوت انتہائی خوش الحانی سے فرماتے اور ساتھ زاروقطار روتے کیونکہ اپنے والدِ گرامی کی ہدایت کے مطابق وہ تلاوتِ کلامِ پاک کرتے ہوئے یوں محسوس کرتے کہ اس کا نزول خود ان پر ہی ہو رہا ہے۔علاوہ ازیں دورانِ گفتگو یا کسی اور وقت حضورِ اکرم ﷺ کا صرف نامِ نامی سن کر ہی ان کی آنکھیں بے اختیار موتیوں کی لڑیاں بکھیر دیا کرتیں .....مگر ''روزگارِفقیر'' سے جو واقعہ شروع میں نقل کیا گیا ہے اس میں فقیر سید وحید الدین یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس (علامہ علیہ الرحمۃ) فنافی اللہ ورسول کا قرآن وحدیث کا علم اس قدر ''ناقص''

تھا کہ انہیں یہ تک علم نہیں تھا کہ قرآن وحدیث میں حجِ بیت اللہ شریف کے متعلق کیا احکام موجود ہیں۔

سورۃ ''الحج'' میں حضرت ابراہیمؑ کو حجِ بیت اللہ کے متعلق حکمِ خداوندی کا واقعہ کے معلوم نہیں' ارشاد ہوتا ہے:

ترجمہ: ''یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیمؑ کے لیے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور پاک صاف رکھنا میرے گھر کو طواف کرنے والوں' قیام کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے ..... اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج کا۔ وہ آئیں گے آپ کے پاس پاپیادہ اور ہر دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر جو آتی ہیں ہر دور دراز راستہ سے۔ (اعلان کیجئے) تا کہ وہ حاضر ہوں اپنے (دینی اور دنیوی) فائدوں کے لیے''۔ (سورۃ الحج۔ آیت نمبر ۲۶ اور ۲۷)

مندرجہ بالا احکامات کے سلسلے میں پیر کرم شاہؒ ''ضیاالقرآن'' میں یوں تفسیر فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیمؑ جب کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو حکم ملا۔ اے ابراہیم اب اعلان کر دو کہ خدا کا گھر تیار ہو گیا ہے۔ خدا کے بندو آؤ اور فریضہ حج ادا کرو۔ انہوں نے عرض کی الٰہی میری آواز کہاں تک پہنچے گی۔ فرمایا تم اعلان کرو۔ اس آواز کو پہنچانا میرا کام ہے۔ چنانچہ آپ جبل ابی قبیس پر تشریف لے گئے اور حج کا اعلان فرما دیا۔ جو لوگ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے' انہوں نے بھی اس اعلان کو سن کر لبیک اللھم لبیک کہا جس نے دعوت ابراہیمی پر لبیک کہی اسے ہی حج کی سعادت نصیب ہو گی اور جتنی بار جس نے لبیک کہی اتنی بار وہ حج کرے گا''۔ (ضیاالقرآن جلد سوم صفحہ ۲۱۰)

اس سے اگلی ہی آیت میں اس کے فوائد اور حکمت کا بیان ہے:

ترجمہ: ''اعلان کیجئے' تا کہ وہ حاضر ہوں اپنے (دینی ودنیوی) فائدوں کے لیے اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں .....الخ''

(سورۃ الحج۔ آیت: ۲۸)

''ضیاالقرآن'' ہی میں پیر کرم شاہؒ یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''حج کرنے کی حکمت بیان فرما دی کہ یہاں آئیں گے تو دینی اور روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ دنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال کر کے واپس بھیجے جائیں گے۔ دینی برکت تو یہ ہے کہ جس کا حضورؐ نے ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے:

قال رسول اللہ ﷺ من حج للہ فلم یرفث و لم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ"۔
یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حج کیا اور اس اثناء میں فحش کلامی اور برائی سے بچا رہا وہ جب لوٹے گا تو گناہوں سے اس طرح پاک ہوگا جس طرح اس دن پاک تھا جب اس کی ماں نے اسے جنا تھا اور دنیوی منفعت یہ ہے کہ لوگ کاروبار کرتے ہیں۔ خوب نفع حاصل کرتے ہیں اور دور دراز ملکوں سے آنے والے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں خرید کر لے جاتے ہیں"۔ (ضیا القرآن جلد سوم۔ صفحہ ۲۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات پیش کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ قرآن و حدیث میں حج کے سلسلے میں جب اس قدر تفصیلاً ذکر آیا ہے اور تمام احکامات پوری صراحت سے بیان ہوئے ہیں تو یہ کس طرح تسلیم کیا جائے کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ ان سے ناواقفیت کا شکار رہے اور انہوں نے فقیر سید وحید الدین کے متذکرہ بالا استفسار کا اس قدر غیر واضح اور مبہم سا جواب کیوں دیا۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ جو عربی کے بہت بڑے عالم تھے اور باناغہ تلاوتِ کلام پاک اس طرح فرماتے تھے کہ جس طرح قرآن خود ان پر نازل ہو رہا ہے اور یقیناً اس کو اتنا سمجھتے تھے کہ زاروقطار روتے تھے کہ مصحف کے صفحات آنسوؤں سے اس قدر بھیگ جاتے تھے کہ اکثر انہیں دھوپ میں سکھانا پڑتا تھا۔[1] تو کیا یہ مانا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کبھی سورۃ الحج کی متذکرہ بالا آیات کی تلاوت نہ فرمائی تھی یا پھر ان کا مفہوم ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ کیا انہوں نے تفسیر کی کوئی کتاب نہیں دیکھی جس سے انہیں ان آیاتِ مبارکہ میں بیان مفہوم کا کچھ علم ہو جاتا اور وہ حدیثِ پاک جس میں گناہوں سے پاک ہونے کا ذکر آیا ہے، کبھی ان کی نظر سے نہیں گزری۔

مقامِ حیرت ہے کہ ایک عام قاری تو قرآن و حدیث سے مندرجہ بالا پیغام حاصل کر سکتا ہے اور کچھ عرصہ بعد حج کی ضرورت اور اہمیت جناب فقیر سید وحید الدین کے بھی ذہن نشین ہو سکتی ہے مگر اس کا ادراک اگر نہیں ہوا تو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو نہیں ہوا۔ کیا فقیر سید وحید الدین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ساری عمر ان حقیقتوں سے "بے بہرہ" رہے۔ یعنی فقیر صاحب تو کچھ عرصہ بعد سب کچھ سمجھ گئے مگر علامہ صاحب ہمیشہ محروم ہی رہے۔ یا وہ یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ حضرت علامہؒ نے جانتے بوجھتے فقیر صاحب کو ان سچائیوں سے روشناس کرانے میں بخل سے کام لیا..... کیا اس میں چھپانے والی کوئی بات تھی؟ اس میں خدانخواستہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی جس سے فقیر سید وحید الدین کے گمراہ ہو جانے کا خدشہ لاحق رہا ہو۔

میرے خیال میں اس قبیل کے اقبال ناشناس محض اپنے آپ کو اقبالؒ پر متخصص ثابت کرنے کے لیے عجیب وغریب واقعات کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی کم عقلی اور کم علمی کی بدولت اس عاشق اللہ اور رسول ﷺ پر بہتان تک باندھنے سے گریز نہیں کرتے ۔اقبالؒ کی اللہ اور رسولِ مقبول ﷺ سے وابستگی اظہر من الشمس ہے اور اب اس ضمن میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی مگر بد طینت اب بھی اپنی سی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں ۔یا پھر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی ذات کا سہارا لے کر شعائرِ اسلام کا مذاق اڑانے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ ''روزگارِ فقیر'' میں شامل اس واقعہ کا اگر صرف عنوان ہی دیکھا جائے تو اس کا عجیب احساس ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو اپنے آپ کو فقیر اور سید جیسے القابات سے متعارف کرواتا ہے خود ہی اس عظیم مذہب اور نابغہ روزگار ہستی کا (نعوذ باللہ۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد) مذاق اڑانے کے درپے ہے جس کی وجہ سے ہی اس کو یہ مقام حاصل ہوا ہے۔ اقبال کا یہ فرمان شاید اس قسم کے لوگوں کے لیے ہی ہے ۔

شب پرہ می طلبد بدر تمامت نقصان   او نداند کہ ابد نورِ تو ظاہر باشد

ہر کہ از روئے جدل بر تو سخن میراند   بمثل شد اگر ش بو علیؔ کافر باشد

اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اپنی پوری زندگی حج بیت اللہ اور زیارتِ روضہ رسول ﷺ کے لیے تڑپتے رہے اور زندگی کے آخری ایام میں تو یہ خواہش اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ انہیں ہر وقت بس اسی کی لگن تھی ۔یہاں تک کہ جب ۱۹۳۷ء میں ان کی نظر تقریباً بند ہو چکی تھی' ایک دن ان کی چھوٹی ہمشیرہ محترمہ زینب بی بی نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ ''عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھ میں موتیا بھی تو اتر رہا ہے۔ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں ...... اللہ خیر سے رکھے' اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جائیے گا''۔ اس پر بڑے دردانگیز مگر پرشوق لہجے میں فرمایا ......

''میری آنکھوں کا کیا ہے' آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں''

اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔ گویا کہ ایک ایک آنسو مولانا جامیؒ کے انداز میں زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ۔

نسیما! جانب بطحا گزر کن

حج بیت اللہ اور زیارتِ روضہ رسول مقبول ﷺ کی شدید خواہش کے باوجود آدابِ محبت کا بھی انہیں بے حد خیال تھا۔ ''مظلوم اقبال'' میں شیخ اعجاز احمد صاحب اس سلسلہ میں ایک واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں:

''۱۹۳۱ء کے آخر میں دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان سے واپس آتے ہوئے وہ موتمرِ عالمِ اسلامی کے جلسے میں شمولیت کے لیے فلسطین گئے۔ واپس آئے تو ایک دن ابا جان نے ان سے کہا ''اقبال فلسطین گئے تھے لگے ہاتھوں روضہ رسول نبویؐ پر بھی حاضری دے آتے''۔ اس کے جواب میں فرمایا:

''بھائی صاحب! میں کس منہ سے روضہ اقدس پر حاضری دیتا'' پھر فرمایا کہ ''انگلستان کا سفر حکومت ہند کے خرچہ پر کیا گیا تھا۔ انگلستان سے واپسی میں موتمرِ اسلامی کے جلسہ میں شمولیت کے لیے فلسطین جانا ہوا۔ وہاں خیال تو آیا کہ دربارِ حبیب ﷺ قریب ہے' زیارت کرتا چلوں۔ لیکن یہ احساس سدِّ راہ ہوا کہ حضور ﷺ کے در پر حاضری کے لیے گھر سے صرف اسی نیت سے اور اپنے خرچ پر سفر کرنا چاہئے۔ دنیوی مقصد کے سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لگے ہاتھوں حضور ﷺ کے روضہ پر حاضری کے لیے جانا مجھے آدابِ محبت کے خلاف محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو حج کی نیت بھی ہے اور زیارتِ روضہ رسول ﷺ کی بھی''۔!

اس سلسلہ میں ''تفسیر ابنِ کثیر'' کے مصنف حافظ عماد الدین ابوالفداء ابنِ کثیرؒ کے حج وعمرہ کے مسائل کے بیان کا مندرجہ ذیل اقتباس دیکھئے:

''حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ پورا کرنا یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ان کا تمام کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو۔ تمہارا سفر صرف حج وعمرے کی غرض سے ہو۔ میقات پہنچ کر لبیک پکارنا شروع کر دو۔ تمہارا ارادہ تجارت یعنی کسی اور دنیوی غرض کا نہ ہو' کہ نکلے تو اپنے کام کو اور مکہ کے قریب پہنچ کر خیال آ گیا کہ آؤ حج وعمرہ بھی کرتا چلوں۔ گو اس طرح بھی حج وعمرہ ادا ہو جائے گا لیکن یہ پورا کرنا نہیں' پورا کرنا یہ ہے کہ صرف اسی ارادے سے گھر سے نکلو''۔ (تفسیر ابنِ کثیر جلد اول۔ سورۃ البقرۃ۔ آیت ۱۹۶۔ صفحہ ۲۷۳)

یقیناً حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اس سے آگاہ تھے' اسی لیے اتنا قریب پہنچ کر بھی اس سے فائدہ اٹھانے کی مطلقاً کوشش نہیں فرمائی حالانکہ فی زمانہ ادھر سے ادھر جاتے ہوئے حج وعمرہ سے بھی سبکدوش ہو لینا اب ایک عام سی بات ہو گئی

ہے۔

۱۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو سر راس مسعود کو ایک خط میں اپنے سفرِ حج کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

''انشاء اللہ امید کہ سال (آئندہ) حج بھی کروں گا اور دربارِ رسالت ؐ میں حاضری بھی دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانانِ ہند یاد کریں گے''۔[۲]

اس تحفے کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں انکشاف کرتے ہیں:

''یہ تحفہ کیا ہونا تھا؟ ان کی کتاب ''ارمغانِ حجاز'' جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کی اور جو ان کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے چوہدری محمد حسین تحریر کرتے ہیں''۔[۳]

''دیارِ حبیب ﷺ اور روضہ حبیب ﷺ کی زیارت کا شوق برسوں سے روحِ اقبال کو جذب کیے ہوئے تھا۔ دن بھر بہت کم لمحے ایسے گزرتے ہوں گے کہ محمد ﷺ (فداہ روحی) کی باتوں سے وہ دل غافل ہوتا ہو۔ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں آ کر یہ شوق اس مقام پر پہنچا جسے عشق و شغف کی انتہائی منازل کہنا چاہئے۔ عقل و فلسفہ سب عشقِ محمد ﷺ کے تابع ہو چکے تھے ...... کئی سال حج کے موقعہ پر حجاز جانے کی تیاریاں ہوئیں' لیکن طویل علالت کی وجہ سے حالات نے مساعدت نہ کی''۔[۱]

''ارمغانِ حجاز'' کی ایک رباعی ہے:

حرمْ جز قبلہ قلب و نظر نیست
طوافِ اوْ طوافِ بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبریلِ امیں را ہم خبر نیست

خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ تعلقِ خاطر کا اس سے بڑھ کر کیا اظہار ہو سکتا ہے۔

باوجود شدید علالت اور معذوری کے حج پر جانے کی خواہش روز بروز فزوں تر ہو رہی تھی۔ ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کو سر اکبر حیدری کے نام ایک خط میں یوں اظہار فرماتے ہیں:

''ایک خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کی تربت پر حاضری دوں جس کا ذاتِ الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمہ الہام رہا ہے۔ میری جذباتی زندگی کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی انسانی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ یہ یقین مجھے پیغمبر اسلامؐ کی ذاتِ گرامی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ذرہ ذرہ آنحضور ﷺ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری روح ایک ایسے بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آنحضور ﷺ کے روضہ اقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی''۔[۲]

اسی طرح ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کو ہی ایک دوسرے مراسلے میں عبداللہ چغتائی کو تحریر کیا:

''اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں۔ اب مجھ گنہگار کے لیے آستانِ رسالتؐ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے''۔[۱]

ایک اور خط جو ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کو مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کو لکھا گیا' میں پیر صاحب کے حج بیت اللہ پر روانگی کا ذکر کرتے ہوئے اس سفر کی مبارکباد اور دلی دعائیں اور دربار نبوت میں اپنے لیے دعا کی التجا کی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف۔ خدا تعالیٰ آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریکِ حال ہوں۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت اور برکت سے مستفیض ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور ﷺ کے روضہ مبارک پر یاد بھی کیا جا سکوں۔ تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے۔ ''الطالح لی'' یعنی گنہگار میرے لیے ہے۔ امید ہے آپ اس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہ فرمائیں گے''۔[۲]

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی حج بیت اللہ کے لیے تڑپ کا برملا اظہار ہو رہا ہے اور روضہ اقدس پر حاضری زندگی کا حاصل بنی ہوئی ہے۔ ان کو تمام عمر اور خاص طور پر اپنی حیاتِ مستعار کے آخری حصہ میں بس یہی ایک لگن رہی کہ کس طرح وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک پہنچ جائیں اور اپنی معروضات حضورِ حق و رسالت

ﷺ میں بہ نفسِ نفیس پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں۔ آخری دنوں میں تو یہ معروضات جوان کی وفات کے بعد ''ارمغانِ حجاز'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئیں' بڑی سرعت اور اضطراری طور پر ترتیب وتحریر ہوتی رہیں مگر ان کو سرزمین حجاز جانے کی مہلت نہ مل سکی ...... کیونکہ جب تک جناب الٰہی سے توفیق عطا نہ ہو' حج بیت اللہ کی حاضری ممکن نہیں ...... یعنی جس روح نے ندائے ابراہیمی پر لبیک نہیں کہا وہ حج کی سعادت حاصل نہیں کرسکتی۔ آپ کے پاس ہر قسم کی استطاعت موجود ہو' دولت' صحت' وسائل مگر جب تک وہاں سے منظوری نہیں آتی' کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس میں اس ذاتِ باری کی کون سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں' ان کو وہ ہی جانتا ہے۔ کس کی مجال ہے کہ وہاں دم مار سکے۔ راضی بہ رضا رہنا ہی انسان کے بس میں ہے۔

یہاں ایک پوشیدہ حقیقت سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں جو شاید بہت کم لوگوں کے علم میں ہے۔ حج بیت اللہ سے محرومی صرف حضرت علامہ علیہ الرحمۃ پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ محرومی تو اجتماعی ہے۔ پورا خاندان اس میں مبتلا رہا ہے اور اب تک ہے ...... جدِ اعلیٰ بابا صالح نے یہ سعادت اتنی بار حاصل کی کہ ان کا عرف ''بابالول حج'' پڑ گیا یعنی ''عاشقِ حج'' ...... انہیں حج کی توفیق اتنی زیادہ ہوئی کہ پورے خاندان کے لیے کافی قرار پائی اور کئی پشتوں تک باوجود استطاعت کے کسی دوسرے کو یہ سعادت نصیب نہ ہوسکی ...... صرف علامہ علیہ الرحمۃ ہی نہیں' نہ جانے کون کون اس کے لیے تڑپا مگر منظوری نہ ملی۔ جہاں تک میرے علم میں ہے کتنی ہی پشتوں کے بعد (خاص طور پر مردوں میں) راقم الحروف! کو خاندان کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوا اور حج بیت اللہ شریف اور روضہ رسول مقبول ﷺ پر حاضری کا اذن ارزاں ہوا۔ الحمد للہ خاندان پر جو پابندی لگی تھی وہ ختم ہوئی۔ خاص طور پر یہ سختی مرد حضرات پر زیادہ ہے کہ باوجود استطاعت رکھنے کے توفیق نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ لطفِ خاص تو اس کی جناب سے ملتا ہے۔ یہ چیزیں دولت کے زور پر حاصل نہیں ہوا کرتیں۔

حال ہی میں ایک ابلیسی ذہن کی پیداوار کتابچہ ''علامہ اقبال ...... غارت گرِ ملت'' نظر سے گزرا۔ اس میں اور بہت سی باتیں جواب طلب ہیں جن کا مدلل جواب انشاء اللہ علیحدہ عرض کیا جائے گا۔ یہاں اس قدر ذکر ضروری ہے کہ اس کے ''فاضل'' مصنف نے علامہ علیہ الرحمۃ کے حج پر نہ جاسکنے پر تنقید فرماتے ہوئے لکھا ہے:

''صاحبِ استطاعت ہونے کے باوجود بھی انہیں دیارِ محبوب پر حاضری دینے کی سعادت نصیب نہ ہوئی''۔[۲]

حیرت ہوتی ہے کہ اس قبیل کے شیطان صفت مصنفین جو خواہ مخواہ کے خدائی فوجدار بن جاتے ہیں اور دوسروں پر طعن وتنقید کے سوا کوئی دوسرا جوہر ان میں موجود نہیں ہوتا۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہوا صاحبِ استطاعت ہوتے ہوئے حج بیت اللہ میں شامل ہونا اور دیارِ حبیب ﷺ کی حاضری کسی کے بس کی بات نہیں۔ جب تک اس کی توفیق جنابِ الٰہی سے نہیں ملتی' استطاعت کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں اس قسم کے لوگوں کو جانتا ہوں جو ساری عمر جدہ میں گزار چکے ہیں مگر حج تو ایک طرف کبھی نماز جمعہ بھی انہیں حرم پاک میں ادا کرنا نصیب نہیں ہوئی۔ خاندانِ اقبال کی بدنصیبی کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس میں نہ تو استطاعت کا دخل ہے اور شاید نہ ہی توفیق کا بلکہ دراصل یہاں تو معاملہ ''کوٹے'' کا ہے کہ پورے خاندان کا حصہ فردِ واحد نے ہی ختم کر دیا' اس لیے جب تک مزید منظوری نہیں آتی ہم سب بے بس ہیں اور سوائے دعا و انتظار کے کچھ نہیں کر سکتے۔ اللہ کریم سب کے لیے آسانیاں اور اذنِ حضوری عطا فرمائے۔ آمین!

حجِ بیت اللہ سے گناہ معاف ہو جانے کے سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ حج کے بھی کچھ اصول ہیں' ایسا نہیں کہ آپ مکہ مکرمہ کا چکر لگا آئیں اور بس۔ اس کے لیے کچھ شرائط ہیں جن کو پورا کرنا لازم ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ ہے:

''سرورِ دو جہاں ﷺ نے آخری دور میں حج کے متعلق فرمایا کہ آخری زمانہ میں امیر لوگ سیر و تفریح کی غرض سے حج کریں گے۔ متوسط طبقہ کے لوگ تجارت کی غرض سے حج بیت اللہ کے لیے جائیں گے۔ علماء کرام دکھاوے کے لیے اور لوگوں پر رعب جمانے کے لیے حج کے لیے جائیں گے۔ غریب لوگ بھیک مانگنے کے لیے حج پر جائیں گے کہ وہاں خیرات خوب ملے گی۔ یعنی منتہائے نظر حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنا بالکل نہ ہوگا''۔

آج کے دور میں مندرجہ بالا چاروں اقسام کے حج موجود ہیں' کیونکہ زیادہ تر لوگ انہیں کے تحت حج کے لیے جا رہے ہیں...... صرف اور صرف خدا کی خوشنودی کے لیے حج پر جانے والے خوش نصیب تو اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ حج کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو اور صدقِ دل سے گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔ گناہ تو جب ہی معاف ہوں گے اور آپ نوزائیدہ بچے کی طرح گناہوں سے منزہ قرار پائیں گے' جب اس کی تمام شرائط پوری کریں گے۔ اگر آپ حج کو سیر و تفریح یا تجارت' دکھاوے یا خیرات کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا اجر بھی تو ویسا ہی ملے گا۔ اگر آپ کو اس کی جناب سے توفیق عطا ہوئی ہے تو یہ بھی آپ کا امتحان ہے کہ آپ کس

تیاری کے ساتھ وہاں حاضر ہوتے ہیں۔ اگر آپ پاک وصاف حاضری دیں گے تو یقیناً پاک صاف اجر کے حق دار قرار پائیں گے اور اگر آپ نجس اور غیر پسندیدہ چیزوں کے ساتھ وہاں پہنچیں گے تو بدلہ بھی تو آپ کو ویسا ہی ملے گا۔ سوچنے کی بات ہے کہ آپ اپنے لیے تو پاک صاف خوراک' لباس' ماحول اور سفر کی خواہش رکھتے ہیں مگر جس کے حضور حاضر ہو رہے ہیں' اس کی پسند کا کچھ خیال نہیں رکھتے۔ اس سے تو آپ بہترین اجر کی امید رکھیں اور اس کے حضور زمانے بھر کی نجاستیں پیش کریں تو سودا کس طرح طے ہو گا؟ کہتے ہیں کہ جب ایک بندۂ خدا حج کے لیے رختِ سفر باندھتا ہے تو وہ خدا کا مہمان ہو جاتا ہے اور جب سرزمین حجاز میں پہنچتا ہے تو وہ عظیم ہستی اس کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہاں ہر طرح کی آسانیاں خود بخود پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اگر آپ کی نیت صاف ہے اور آپ حج پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں تو مشکلات یوں حل ہوتی اور آسانیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک مشہور حدیثِ مبارک ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات

یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے...... چنانچہ وہاں تو نیتوں کا امتحان ہے۔ اگر آپ سیر و تفریح کی نیت سے وہاں جاتے ہیں تو ویسے ہی انتظامات آپ کو ملیں گے اور اگر تجارت' دکھاوے یا خیرات کے لیے اتنا طویل سفر اختیار کرتے ہیں تو آپ کا میزبان آپ کے لیے ویسے ہی ذرائع پیدا فرما دیتا ہے کیونکہ آپ اس ذاتِ باری کے مہمان ہیں جس کے قبضہ قدرت میں کل کائنات ہے' اس کے لیے کچھ بھی تو مشکل نہیں...... آپ جو خواہش کریں گے آپ کو ملے گا اور اگر آپ خالصتاً اس کی خوشنودی' اس کی رضا کے لیے وہاں حاضری دے رہے ہیں تو اس کا اجر اس کے مطابق ملے گا۔ البتہ قبولیت کا تعلق اس کی ذات سے ہے۔ جو اس کو پسند ہو گا' وہ قبول کرے گا۔ اس کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی جناب میں کون مقبول ہے اور کون نامقبول' یہ تو وہی جانتا ہے۔ البتہ ایک واضح نشانی اس کی ضرور ہے کہ جو انسان حجِ بیت اللہ کے بعد تبدیل ہو جائے...... نیک کاموں سے رغبت بڑھ جائے تو یقینی طور پر حج اس کا مقبول ہوا۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھے کہ پچھلے سب گناہ معاف ہوئے اور پھر سے شروع ہو جائے کہ اگلے برس پھر معاف کروا لیں گے تو وہ شاید خدا سے (نعوذ باللہ) مذاق کرنا چاہتا ہے۔ اول تو کس کے پاس اگلے سال تک کی مہلت ہے؟ دوسرے اگر دنیا

میں کسی سے ایسا مذاق کریں تو سزا کے حقدار قرار پاتے ہیں تو کیا وہ جو حاکم الحاکمین ہے وہ اتنا ہی بے بس ہے کہ آپ جو آپ کی مرضی ہو حرکاتِ ناپسندیدہ کا ارتکاب فرماتے رہیں اور وہ آپ کو بار بار معاف ہی کرتا چلا جائے ...... آخر کیوں ......؟ اگر دنیاوی غلطیوں کی سزا دی جا سکتی ہے تو اخروی سزا سے آپ کس طرح محفوظ رہیں گے؟ بات صرف سمجھ کی ہے اور یقیناً اس کی توفیق بھی اسی جناب سے ودیعت ہوتی ہے اور یہ اسی صورت عطا کی جاتی ہے جب آپ سچے دل سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں تب اس کی رحمت جوش میں آتی ہے اور تمام اصولوں تمام قاعدوں کو توڑ کر آپ کی دادرسی کو پہنچتی ہے۔ جب تک آپ ایک قدم نہیں بڑھائیں گے وہ کس طرح یا کس جانب دس قدم آپ کی طرف بڑھے گا۔ جب آپ کو جہانِ عمل میں بھیجا گیا تو آپ کے عمل کا ہی تو امتحان ہے ...... عمل برا ہے یا بھلا ...... یہی تو پرکھنا ہے کہ آپ کس جانب جاتے ہیں ...... پوری آزادی آپ کو دی گئی ہے اور اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کو نور پسند ہے یا نار ...... جو آپ پسند فرمائیں گے وہی آپ کو پیش کر دیا جائے گا یا آپ پر مسلط کر دیا جائے گا۔

عصیانِ ما و رحمت پروردگار ما
ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

(مولانا گرامی)

استطاعت اور توفیق کے سلسلے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ استطاعت تو دراصل رعایت کے لیے ہے کہ جب تک صاحبِ استطاعت نہیں اس رکنِ اعظم سے معافی ہے مگر یہ سوچنا کہ جیسے ہی کوئی صاحبِ استطاعت ہو جائے اپنی مرضی سے وہاں حاضر بھی ہو سکتا ہے تو یہ خام خیالی ہے کیونکہ یہ نیک عمل توفیقِ الٰہی کا پابند ہے اور خاص طور پر اذنِ حضوری کے بغیر ممکن نہیں۔ جن کے لیے توفیق کے در بند کر دیئے جاتے ہیں ان کے قلب و نظر پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ تمام عبادات جن کی توفیق ہمیں ہوتی ہے کس کے فائدے کے لیے ہیں؟ ان کا ثواب آخر کس کو ملے گا؟ کیا ہمارے اعمال کا کچھ فائدہ یا نقصان اس ذاتِ باری تعالیٰ کو ہو گا؟ یہ سب کچھ ہم اپنے لیے ہی تو کرتے ہیں۔ یہ تو اس ذاتِ اقدس کا لطفِ خاص ہے کہ وہ ہمارے فائدے کے لیے ہمیں اعمالِ صالح کی توفیق مرحمت فرماتا ہے تاکہ ان کی وجہ سے فوائدِ اخروی حاصل ہوں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے لطف و کرم کے سزاوار ٹھہریں۔ اسی لیے دیکھیے حضرت علامہؒ نے حجِ بیت اللہ پر جانے کا ذکر جہاں جہاں بھی کیا وہاں کبھی یہ نہیں لکھا کہ خدا

مجھے صاحبِ استطاعت کرے یا میں صاحبِ استطاعت ہوں بلکہ ہر بار یہی کہا کہ "اگر توفیقِ الٰہی شامل حال رہی" یا "اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی"۔ کیونکہ ہر مسلمان کا یہ ایمانِ واثق ہونا چاہیے کہ توفیقِ الٰہی کے بغیر کچھ ممکن نہیں ہو سکتا۔ کسی کے پاس دنیا جہان کی دولت ہو، طاقت ہو، وسائل ہوں مگر یہ سب ہیچ ہیں جب تک توفیقِ الٰہی اس کے شاملِ حال نہیں...... اس لیے کبھی اس زعم میں مت رہیے کہ آپ اپنے وسائل کے بل بوتے پر یہ کر سکتے ہیں اور وہ کر لیں گے...... جب توفیقِ الٰہی ہو گی تو باقی تمام وسائل کا پیدا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ جب وہ "قم" کہتا ہے تو ہر چیز حاضر ہو جاتی ہے۔ اس لیے صاحبِ استطاعت ہونے کے گھمنڈ میں رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، جب تک اذنِ حضوری نہیں ہو گا کچھ ممکن نہیں۔ اس لیے بڑے بڑے صاحبِ حیثیت یا استطاعت بیٹھے رہ جاتے ہیں اور توفیقِ الٰہی کی طفیل وہ وہاں جا حاضر ہوتے ہیں کہ جنہوں نے شاید کبھی ایسا سوچا بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیشہ توفیقِ الٰہی کا طلبگار رہنا چاہیے اور کبھی بھی صاحبِ استطاعت ہونے کا غرور دل میں نہیں لانا چاہیے کیونکہ وہاں مال و دولت یا عقل و دانش کو نہیں، دل کو جانچا جاتا ہے، نگاہ کو پرکھا جاتا ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(ضربِ کلیم)

باب ششم

براہینِ قاطع

۱۔ پہلا ردِعمل
مصنف ''مظلوم اقبال''
کی گل افشانیوں کے جواب میں

۲۔ جدِّ امجد
شیخ صالح محمد المعروف ''بابالول حجؒ''

۳۔ بوقتِ ہجرت
خاندانِ اقبال میں وجہِ زن؟

۴۔ دوسرا ردِعمل
فقیہانِ شہر آشوب بنام
''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول)

۵۔ تیسرا ردِعمل
آئینہ ادراک

ہر عمل کے لیے ہے ردِ عمل، دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسماں لیتا ہے انتقام شغال و اُشتر و میش

اس حقیقت سے مفر نہیں کہ ردِ عمل صرف اسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کسی عملِ بد سے واسطہ پڑتا ہے۔ اعمالِ صالح کبھی کسی ردِ عمل کو دعوت نہیں دیتے۔ مگر جیسے ہی کوئی ظلم روا رکھا جائے گا ردِ عمل فوراً ظاہر ہوگا کیونکہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا انسانی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔

پہلا ردِ عمل

مصنف ''مظلوم اقبال'' کی گل افشانیوں کے جواب میں

مصنف ''مظلوم اقبال'' نے کتاب کے آخر میں ایک علیحدہ باب ''شکوۂ جور و جفا'' کے عنوان کے تحت شامل کیا ہے جس میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ پر اپنوں اور بیگانوں کی جانب سے روا رکھے گئے مظالم کی تاریخ بیان فرمائی ہے اور بڑی ''صاف گوئی'' سے کام لیتے ہوئے اس فہرست میں اپنی طرف سے بھی ایک ''ناکردہ ظلم'' کو اس میں یوں شامل کیا ہے:

''راقم الحروف کے لیے ابھی تک یہ احساسِ ندامت سوہانِ روح ہے کہ اس کے لیے انہیں شادی لال ایسے شخص سے ''مومیائی'' مانگنا پڑی۔ راقم الحروف کو بھی علامہ پر ظلم کرنے والوں کی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے''۔!

مقامِ حیرت ہے کہ نادانستہ ظلم تو یاد رہ گیا مگر دانستہ جو ظلم عظیم سرزد ہوا اُسے فراموش کر دیا۔ مصنف ''مظلوم اقبال'' کو یقیناً اس کا احساس رہا ہوگا کہ ۱۹۳۱ء میں ان کے منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شامل ہو جانے کے بعد حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو کس قدر دکھ اور تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کے متعلق حقائق گزشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کسی طور بے جا نہ ہوگا کہ سب سے بڑا ظلم تو خود انہوں نے ہی اپنے عمِ محترم پر روا رکھا۔ اس میں یقیناً کچھ مبالغہ آرائی نہیں کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا کیونکہ یہ کسی طور ممکن نہیں کہ جب مصنف ''مظلوم اقبال'' نے منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شمولیت اختیار کی تو انہیں یہ ادراک نہیں تھا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اس سلسلے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت انجام دیا گیا اور لازماً یہ اپنے عظیم چچا کے خلاف اس گھناؤنی سازش میں برابر کے شریک تھے۔ یہ بات کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ یہ سب کچھ لاعلمی میں ہوا یا انہوں نے قادیانیت سے متاثر ہو کر یہ انتہائی قدم اٹھایا' بلکہ یہ ایک بین الاقوامی سازش کا حصہ تھا جس میں ان کو محض استعمال نہیں کیا گیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پیش کیا۔ دنیاوی منفعت کے لیے انہوں نے اپنے دین کا سودا کیا اور

جب ایک انسان اپنا ایمان ہی بیچ ڈالے تو پھر بزرگوں اور عزیزوں کی کیا حیثیت؟ چنانچہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ پر سب سے بڑا ظلم تو خود مصنف ''مظلوم اقبال'' نے کیا اور آج دوسروں کے مظالم کی فہرست ترتیب فرما رہے ہیں یعنی دوسروں کی آنکھوں کے تنکے چن رہے ہیں مگر اپنی آنکھ کے شہتیر کی خبر نہیں......؟

اس عظیم ظلم کے علاوہ جو مصنف ''مظلوم اقبال'' نے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی حیات میں ہی ان پر مسلّط فرمایا' اب اپنی متذکرہ کتاب میں بھی کئی ایک مزید مظالم کا اضافہ فرمایا ہے جن کے ردِ عمل میں یہ تحریر قلم بند کی جا رہی ہے۔ یہاں عمل اور ردِ عمل کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں البتہ اس حقیقت سے بھی مفر نہیں کہ ردِ عمل صرف اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کسی عملِ بد سے واسطہ پڑتا ہے۔ اعمالِ صالح کبھی کسی ردِ عمل کو دعوت نہیں دیتے مگر کوئی ظلم روا رکھا جائے' ردِ عمل فوراً ظاہر ہوگا کیونکہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا انسانی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔

مصنف ''مظلوم اقبال'' نے سب سے پہلے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اپنے عمِ محترم کو'' کانوں کے کچے'' تک ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ ہر کس و ناکس کی بات کا یقین بلا تحقیق کر لیا کرتے تھے اور پھر ایسی باتوں کو بلا سوچے سمجھے آگے پھیلا دیا کرتے تھے۔ اور اس سلسلے میں چند بے سروپا باتوں کا تذکرہ فرما کر یہ تاثر پیدا کرنے کی سعی لاحاصل فرمائی ہے کہ علامہ صاحب افواہ سازی میں مصروف رہتے تھے اور ان کے احباب ان کو غلط سلط جو بتاتے تھے' وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرتے چلے جاتے تھے۔!

سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کی تلاوت علامہ صاحب کا روز کا معمول تھا اور وہ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت اس طرح کرتے تھے جیسے ان پر ہی اس کا نزول ہو رہا ہو' اس لیے یہ گمان کرنا کہ وہ عظیم شخصیت جو قرآن مجید فرقانِ حمید کی تلاوت اس قدر سمجھ کر فرماتی تھی' اس میں درج ان احکامات سے بالکل بے بہرہ رہی جو بڑی وضاحت کے ساتھ اس میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۶ سے کون واقف نہیں جس میں افواہوں اور بلا تحقیق باتوں پر یقین کرنے کی صاف الفاظ میں ممانعت فرمائی گئی ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

(ترجمہ): ''اے ایمان والو! اگر لے آئے تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی گروہ کو لاعلمی میں پھر تم اپنے کیے پر نادم ہو''۔ (سورۃ الحجرات آیت نمبر ۶)

مندرجہ بالا واضح حکم کی موجودگی میں ایک ایسی شخصیت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی پوری زندگی اس حکم کے خلاف عمل پیرا رہی اور کبھی بھی اس سلسلے میں تحقیق نہ فرمائی کہ آیا جو بات بیان کی گئی ہے اور جسے میں دوسروں کو بتانے جا رہا ہوں' درست بھی ہے یا نہیں' میرے خیال میں اس عظیم شخصیت پر بہتانِ عظیم کے مترادف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی پوری حیاتِ مستعار بس تحقیق کے لیے ہی وقف رہی۔ ان کا تو ہر سانس اور ہر ہر قدم نئی سے نئی تحقیق پر مبنی ہے...... ان کا تو شاید پورا علم ہی اس لفظ پر مرکوز رہا کہ انہوں نے ہر بات کی مکمل تحقیق فرمائی اور اپنے وقت کے عظیم محققین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جس شخص کا اوڑھنا بچھونا ہی تحقیق رہا ہو' کیا وہ کوئی بھی بات خواہ اس کا راوی کوئی بھی رہا ہو' بلا تحقیق قبول کر سکتا ہے؟

مصنف ''مظلوم اقبال'' نے یہاں تک لکھا ہے کہ ۱۹۳۵ء تک چچا جان کا رویہ قادیانی جماعت کے ساتھ بڑا دوستانہ تھا اور وہ اسے اسلام کی ایک جماعت تصور فرماتے تھے مگر پھر ایک دم ان کے خیالات تبدیل ہو گئے' جب مجلسِ احرار نے ان کے کان بھرے اور علامہ صاحب چونکہ کانوں کے بڑے کچے تھے اور بلا سوچے سمجھے اور بلا تحقیق ہر کس و ناکس کا یقین کر لیا کرتے تھے اس لیے خواہ مخواہ قادیانی جماعت کے خلاف ہو گئے۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ صاحب ان ہی دنوں ایک ذاتی محرومی کا شکار بھی ہوئے' اس لیے بھی انہیں قادیانی جماعت پر غصہ تھا۔ ''مظلوم اقبال'' کے اقتباسات اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں:

''ان دنوں تعصب کا دور دورہ ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت تو بقول علامہ اقبالؒ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی' ۱۹۳۵ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہو گئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انہیں معلوم ہو گا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی جس کے لیے شاید قلبِ ماہیت کا لفظ زیادہ موزوں ہو' کی وجہ کانگریسی احرار سازش کے تحت' احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک ذاتی معاملہ میں علامہ کا احساسِ محرومی بھی شامل ہو گیا جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی''۔[1]

''احساسِ محرومی'' کی تفصیل یوں بیان کی گئی:

''سلسلہ احمدیہ کے خلاف ۱۹۳۵ء کے بیانات میں اتنی شدت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی سلسلہ میں ان کا احساسِ محرومی کارفرما نہ ہوتا۔ اور اس مرتبہ تو ان کے احساسِ ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی کیونکہ دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا والا معاملہ ہوا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں سرفضل حسین، وائسرائے ہند کونسل کے رکن، چار ماہ کی رخصت پر گئے۔ ان کی جگہ علامہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا لیکن وزیرِ ہند نے چوہدری ظفر اللہ خان کو مقرر کر دیا۔ سر فضل حسین کی تقرری کی میعاد اپریل ۱۹۳۵ء میں ختم ہونے والی تھی، ان کی جگہ کون لے گا...... اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا، لیکن چونکہ چوہدری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ کام کر چکے تھے، اس لیے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلے میں لیا جا رہا تھا...... ممکن ہے احراریوں اور ''زمیندار'' کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لارڈ ولنگڈن نے وزیرِ ہند سے علامہ کے تقرر کی سفارش کی ہو اور انہیں اپنی سفارش کے منظور ہو جانے کا یقین بھی رہا ہو۔ لیکن شاید وزیرِ ہند نے اتفاق نہ کیا ہو۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۳۴ء میں چوہدری ظفر اللہ خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی ۱۹۳۵ء میں انہوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر کیا تھا احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چوہدری ظفر اللہ خان کا تقرر وزیرِ ہند نے کیا۔ اس میں جماعت احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن نزلہ عضوِ ضعیف پر گرا''۔[2]

مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ بھی مصنف ''مظلوم اقبال'' نے متعدد مقامات پر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ پر کئی ایک بڑے عامیانہ قسم کے الزامات اور اعتراضات بھی کیے ہیں اور محسن کشی کے بڑے بھرپور انداز میں مرتکب ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں خاندان کے بزرگوں خاص طور پر اپنے دادا شیخ نور محمد مرحوم و مغفور اور اپنے والدِ محترم شیخ عطا محمد مرحوم کو قادیانی مذہب کو ماننے والے تک ثابت کرنے کی پرزور کوشش فرمائی ہے ...... میں ان الزامات کا علیحدہ علیحدہ ذکر اور ان پر مزید بحث کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کر رہا کیونکہ کتاب زیرِ نظر کے گزشتہ صفحات میں ان کے شافی جوابات عرض کیے جا چکے ہیں۔ البتہ انہی کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی ''زندہ رود'' میں بڑی مدلل بحث فرمائی ہے۔ اس لیے یہاں ''زندہ رود'' سے چند اقتباسات دینا دلچسپی کا باعث ہوگا:

''زندہ رود'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال مصنف ''مظلوم اقبال'' کی طرف سے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ حضرت علامہؒ نے کبھی قادیانی بیعت نہیں کی تھی:

''اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد' احمدی تھے''۔[1]

اسی طرح ڈاکٹر جاوید اقبال' وصیت نامہ میں شیخ اعجاز احمد کے تقرر کے متعلق یوں اظہار خیال فرماتے ہیں:

''اقبال نے وصیت نامہ میں ان کا نام برادر زادہ ہونے کی حیثیت سے اور ان کی صالحیت کی بنا پر اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ یہ وصیت نامہ انہوں نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان دینے کے پانچ ماہ بعد لکھا۔ لیکن تقریباً دو سال بعد وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ان کے خط مورخہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء بنام سر راس مسعود سے ظاہر ہے۔ دیگر اولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں؟''[2]

آگے چل کر جاوید اقبال صاحب' شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انہوں نے آج تک کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی لہذا ان کی اولاد جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے' میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں' بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا مؤقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا مؤقف ہے''۔[1]

قصہ مختصر یہ کہ جاوید ماموں نے بڑی تفصیل سے اعجاز ماموں کے اس نوٹ[2] کا جواب ''زندہ رود'' میں دیا ہے لیکن امید نہیں کہ ان کی پوری طرح تسلی اس سلسلے میں ہوئی ہو۔ کیونکہ ۱۹۹۴ء میں اپنی وفات سے قبل انہوں نے ''زندہ رود'' کو پوری تفصیل سے پڑھا ضرور ہے' جس کا برملا اظہار انہوں نے ''مظلوم اقبال'' میں ایک علیحدہ باب ''زندہ رود...... علامہ اقبال کے سوانح حیات'' کے عنوان کے تحت کیا ہے مگر اس کے بعد اپنی متذکرہ کتاب ''مظلوم اقبال'' میں ان تمام بہتانوں اور الزامات کا اعادہ بھی فرمایا ہے یعنی وہ میں نہ مانوں کے مصداق اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور انہوں

نے کسی بات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا یعنی وہ بضد ہیں کہ جو وہ فرما رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ ان کا اس طرح غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں سے کام لینا اور کھلم کھلا افترا پردازیوں اور سراسر جھوٹ کا سہارا لینا قابلِ صد مذمت ہے۔

سب سے پہلے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں قبلہ نانا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) کے متعلق اس مفروضے کا جواب دیا گیا تھا کہ وہ کبھی قادیانیت سے وابستہ رہے اور ان کے حنفی العقیدہ مسلمان ہونے کے متعلق ثبوت کے طور پر ان کے جنازے کے متعلق یوں حقیقت بیان کی گئی تھی:

''یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ علامہ صاحب کے والدِ گرامی اور بڑے بھائی کبھی بھی ختمِ نبوت کے منکرین میں شامل نہیں رہے۔ وہ ہمیشہ ختمِ نبوت کے ماننے والے اور پکے حنفی المذہب مسلمان تھے۔ شیخ عطا محمد صاحب کا جنازہ ان کی وصیت کے مطابق' جو انہوں نے میرے والدِ گرامی کو کی تھی' اقبال منزل (سیالکوٹ) کے بالمقابل واقع مسجد کے امام مولوی سکندر خان صاحب نے' جو حنفی المذہب تھے' پڑھایا تھا۔ اس کے علاوہ بیگم شیخ عطا محمد صاحب کا جنازہ بھی مولوی صاحب مذکور نے ہی پڑھایا تھا۔[1]

''زندہ رود'' میں مندرجہ بالا حقائق کی مزید تائید ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے ان الفاظ میں فرمائی:

''شیخ عطا محمد' اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انہیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ نمازِ جنازہ شہر کے ایک سنّی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیشِ نظر علیحدہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں''۔[2]

مگر ''مظلوم اقبال'' میں شیخ اعجاز احمد صاحب نے جاوید اقبال صاحب کے متذکرہ بیان کو یہ کہہ کر مسترد فرما دیا کہ ''جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا' اس لیے انہیں یاد نہیں رہا''۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

''اس سلسلے میں ''زندہ رود'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابا جان (شیخ عطا محمد) کی نمازِ جنازہ شہر کے ایک سنّی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی' جس میں مصنف (جاوید اقبال) بھی شامل تھے۔ اگرچہ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ میں (شیخ اعجاز احمد) نے اور احمدی احباب نے بقول مصنف (جاوید اقبال) غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیشِ نظر علیحدہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ یہ درست ہے کہ ابا جان کے جنازہ کے ساتھ ہماری برادری کے کئی اشخاص اور ابا جان کے

کئی ذاتی دوست تھے۔ جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا اس لیے انہوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انہیں یاد نہ رہی ہو کہ میرے چھوٹے بھائی امتیاز مرحوم نے مجھے کہا کہ یہ لوگ ابا جان کا جنازہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے امام کے پیچھے۔ کیا اس میں آپ کو کوئی اعتراض ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی اور میں نے بہ خوشی اجازت دی بلکہ کہا کہ وہ لوگ پہلے جنازہ پڑھ لیں بعد میں ہم پڑھ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا''۔[1]

یہاں سب سے پہلے اعجاز صاحب کا یہ بیان قابلِ غور ہے کہ'' جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا اس لیے انہوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انہیں یاد نہ رہی ہو''۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے اور دسمبر ۱۹۴۰ء میں ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور میٹرک پاس کر کے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ یعنی اتنے بچے بھی نہیں تھے کہ اپنے سامنے ہونے والے واقعات کو فراموش کر دیں۔ حالانکہ شیخ اعجاز صاحب کا ہی اصرار ہے کہ ان کے عمِ محترم یعنی حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی پہلی شادی سولہ برس سے بھی کم عمر میں ہو چکی تھی۔ ''مظلوم اقبال'' میں آپ فرماتے ہیں:

''ان کی (علامہ اقبالؒ) پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی جب ان کی عمر ابھی پورے سولہ برس بھی نہ تھی۔ انہوں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا ہوا تھا''۔[2]

حیران کن بات ہے کہ سولہ برس سے بھی کم عمر میں باپ (علامہ اقبالؒ) کی تو شادی خانہ آبادی بھی ہو چکی تھی مگر سولہ برس سے زیادہ عمر میں انہی کا بیٹا (جاوید اقبال) بقول شیخ اعجاز احمد صاحب ابھی ''بچہ'' تھا اس لیے اس کی گواہی قابلِ قبول نہیں ...... ایں چہ بوالعجبی است؟

ویسے دیکھا جائے تو شیخ اعجاز احمد صاحب نے یہ قاعدہ کلیہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے ہی مستعار لیا ہے کہ ہمیشہ عمر میں جو بڑے ہوتے ہیں وہی درست اور سچ فرماتے ہیں اور کم عمر ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاوید ماموں کو یہاں یاد دہانی کروادوں کہ انہوں نے میرے والدِ گرامی ڈاکٹر نظیر احمد صوفی مرحوم و مغفور کے بیانات[3] اسی بنا پر مسترد فرمائے تھے کہ وہ چونکہ شیخ اعجاز احمد صاحب اور شیخ مختار صاحب سے کم عمر ہیں اس لیے ان کی بیان کردہ روایات[4] قابلِ قبول نہیں۔ اب جب کہ جاوید صاحب کو اس کا ذاتی تجربہ ہو چکا ہے کہ شیخ اعجاز صاحب نے بھی کم عمری ہی کی بنیاد پر ان کی روایات مسترد فرما دی ہیں تو یقیناً اب ان کے لیے درست فیصلہ فرمانا زیادہ آسان ہو

جائے گا کہ کیا واقعی کم عمر ہمیشہ غلط بیانی ہی کیا کرتے ہیں؟

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ اعجاز صاحب نے ''ان لوگوں'' کو پہلے نمازِ جنازہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے خود بعد میں ادائیگی کا کیا خوب جواز پیدا فرمایا ہے ..... جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہوگی مگر جن کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہو ان کے لیے اس قسم کے چھوٹے موٹے جھوٹ سچ کی کیا حیثیت ..... یعنی تمام بزرگ اور دوسرے لوگ جن میں شیخ عطا محمد صاحب کے برادرِ نسبتی یعنی ان کی چھوٹی ہمشیرہ زینب بی بی کے خاوند شیخ غلام رسول صاحب، شیخ عطا محمد صاحب کے برادرِ نسبتی یعنی ان کی بیگم کے بھائی بابو غلام نبی صاحب، بابو غلام نبی صاحب کے صاحبزادے عبد الغنی راٹھور صاحب، شیخ عطا محمد صاحب کے چھوٹے داماد ڈاکٹر نظیر احمد صوفی (جن کو شیخ صاحب نے آخری وصیت فرمائی تھی کہ ان کا جنازہ حنفی العقیدہ طریق پر پڑھایا جائے) اور ڈاکٹر جاوید اقبال شامل تھے۔ اس کے علاوہ خاندان کے دوسرے بزرگ اور افراد، ہمسائے، محلّہ دار، دوست احباب اور شہر کے دوسرے اکابرین سب ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے رہے اور صرف ایک فرد یعنی شیخ اعجاز احمد صاحب سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ جس طرح بھی ہوا انہوں نے اپنے مرحوم باپ کے خلاف سازش تیار کی اور انہیں ۳۱۳[1] کی فہرست میں شامل فرما دیا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ جس شخصیت کو اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ۳۱۳[2] دوستوں کی فہرست میں ۲۲۴ویں[3] نمبر پر تھے، کو بہشتی مقبرہ (قادیان) میں دفن ہونے کے لیے کوئی خصوصی جگہ عطا نہیں کی گئی ..... حالانکہ اصولاً بانی سلسلہ قادیانی کو اپنی زندگی میں ہی اپنے اتنے قریبی ساتھی کے لیے یہ اہتمام کر دینا چاہئے تھا۔ دوسرے جب شیخ اعجاز احمد صاحب نے مسلمانوں سے علیحدہ اپنے والدِ مرحوم کی نمازِ جنازہ ادا کر دی تو اس کے بعد بھی وہاں پر موجود مسلمانوں میں سے کسی نے شیخ عطا محمد صاحب کے سنّی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیے جانے پر کیوں اعتراض نہ کیا؟ اس زمانے میں تو اس بات پر اتنا سخت ردِ عمل ہوا کرتا تھا کہ اگر غلطی سے کوئی قادیانی کسی طرح مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا تو بعد میں اس کی قبر کو اکھاڑ دیتے تھے۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل ہی برعکس تھا کہ شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی میں ہی اپنے لیے پختہ قبر تعمیر کروا رکھی تھی اور سنّی مسلمانوں نے پورے احترام سے ان کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد ان کو پہلے سے تعمیر شدہ قبر میں دفن بھی کیا اور آج تک وہ وہیں موجود ہیں۔ کبھی کسی کو ان کے خلاف کوئی ایسا انتہائی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس سے کیا حقیقت سامنے آتی ہے؟ یہی کہ وہ بفضلِ تعالیٰ حنفی العقیدہ مسلمان

تھے اور ان کا منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے خیال میں اگر شیخ اعجاز صاحب کا بس چلتا تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے والد صاحب کو قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کرنے سے کبھی باز نہ رہتے مگر یہ تو جبھی ممکن ہوتا کہ ان کی جماعت بھی اس سے متفق ہوتی اور اس اتفاق کے لیے بے حد ضروری تھا کہ شیخ عطا محمد مرحوم کا تعلق قادیانی جماعت سے ثابت ہو۔ میرے والدِ گرامی کا بیان ہے کہ شیخ عطا محمد صاحب کے جنازے کے لیے شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی جماعت کی سیالکوٹ شاخ کے ممبران کو اطلاع[1] بھی بھجوائی کہ فلاں وقت جنازے میں شمولیت فرمائیں، مگر سوائے چند ایک ان (شیخ اعجاز) کے قریبی دوستوں کے کوئی نہ آیا اور جب شیخ اعجاز صاحب علیحدہ نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تو کوئی بھی ان کے ساتھ موجود نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ بھی شاید راستے ہی سے غائب ہو گئے تھے یا انہوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ہی جنازہ پڑھ لیا تھا۔ امام کے پیچھے جب شیخ اعجاز صاحب اکیلے کھڑے ہوئے تو ان کے ایک دوست جو پہلے جنازہ پڑھ چکے تھے، جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے تاکہ جماعت مکمل ہو جائے۔ یہاں یہ حقیقت بھی مدِنظر رہے کہ شیخ عطا محمد نے دوبار اپنے لیے قبرستان امام صاحب میں پختہ قبر تعمیر کروائی ...... پہلی دفعہ جب اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پختہ کروائی تو اس کے ساتھ دو مزید قبریں تعمیر کروائیں۔ ایک اپنے والد شیخ نور محمد صاحب کے لیے اور دوسری اپنے لیے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی بڑی صاحبزادی معراج خالہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے تایا جان سے یہ آخری خواہش ظاہر کی کہ انہیں دادی اماں اور دادا ابو کے پہلو میں اس جگہ آسودۂ خاک کیا جائے جو جگہ آپ نے اپنے لیے مخصوص کی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کی آخری خواہش کے احترام میں ایسا ہی کیا گیا اور شیخ عطا محمد صاحب نے اپنے والدین کے ساتھ اپنی بھتیجی[2] کو دفن کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے اور اپنی زوجہ محترمہ کے لیے دوبارہ پختہ قبریں تعمیر کروائیں اور خود ۱۹۴۰ء میں وہاں دفن ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں بھابھی جی کو اس مخصوص جگہ دفن کیا گیا۔ کہیں سے کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ شیخ عطا محمد اور ان کی زوجہ محترمہ دونوں پکے حنفی العقیدہ مسلمان تھے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ شیخ عطا محمد مرحوم "سابقون"[3] میں سے تھے اور ۳۱۳ دوستوں میں ان کا نمبر ۲۲۴ تھا تو کیا انہیں خود ہی قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن ہونے کے انتظامات نہیں کرنا چاہیے تھے۔ آخر وہ

کیوں بار بار اپنے لیے یہاں سیالکوٹ میں اور وہ بھی کٹر سنّی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کا اہتمام فرما رہے تھے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہیں کسی طور اپنا تعلق قادیانی جماعت سے ثابت ہونا قبول نہیں تھا؟ اور ان کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر انہوں نے اس کی پیش بندی نہ کی تو ان کی وفات کے بعد جب وہ بے بس ہو جائیں گے تو ان کے صاحبزادے شیخ اعجاز کے ذریعہ قادیانی جماعت اپنی سی کوشش ضرور کرے گی تاکہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو پریشان کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں گزشتہ صفحات میں یہ ذکر تفصیلاً ہو چکا ہے کہ کس طرح شیخ اعجاز صاحب نے اپنے والدِ مرحوم کو آخری وقت میں قادیانی مذہب قبول کر لینے پر مجبور کیا تھا اور کس طرح شیخ عطا محمد صاحب نے ثابت قدمی دکھائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی میں یہ بالکل درست اقدام کیا کیونکہ قادیانی بیٹے کے ذریعہ قادیانی جماعت کے شر سے محفوظ رہنے کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ یقیناً نہیں تھا۔ اب شیخ اعجاز یا قادیانی جماعت جو ان کے جی میں آئے کہتی رہے ان کی کوئی بات کسی طور قابلِ قبول نہیں کیونکہ شیخ نور محمد مرحوم و مغفور اور شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور اپنے عمل سے یہ ثابت کر گئے ہیں کہ وہ پکے حنفی العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا قادیانی جماعت یا سلسلہ احمدیت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ کبھی بھی منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شامل نہیں رہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ مصنف ''مظلوم اقبال'' کو یقیناً اپنی جماعت کی طرف سے یہ حکم ملا ہوگا کہ ایک ایسی کتاب ترتیب دیں جو خاندانِ اقبال یعنی اپنے ہی خاندان اور اپنے ہی بزرگوں کا مقام (Image) اس قدر برباد کر دے کہ پھر کوئی راہ ان کے لیے باقی نہ رہے کہ کوئی اس جال سے باہر نکال سکے...... چنانچہ انہوں نے اس حکمِ حاکم پر لبیک کہنا عین ''سعادتِ دارین'' جانتے ہوئے اس کو عملی شکل دے ڈالی' حالانکہ اس سے پیشتر ان کا کسی قسم کی کوئی کتاب وغیرہ لکھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میرے پاس ان کی تحریر موجود ہے جس میں انہوں نے مجھے جب میں نے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے سلسلے میں کچھ مواد فراہم کرنے کے لیے لکھا تو انہوں نے صاف صاف جواب دیا کہ...... ''میرے پاس اب کچھ باقی نہیں ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا' میں فقیر وحید الدین کو دے چکا ہوں اور انہوں نے ''روزگارِ فقیر'' میں شامل کر دیا ہے''۔ یہ اواخر ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ گو انہوں نے اس وقت غلط بیانی سے ہی کام لیا کیونکہ ان کے پاس کم از کم ۱۰۳ خطوط تو ضرور موجود تھے جواب ''مظلوم اقبال'' میں شامل ہیں۔ اعجاز ماموں کے متذکرہ بالا خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

کراچی ۲۳ نومبر ۱۹۶۷ء

عزیزم خالد

بعد دعا واضح ہو تمہارا ۱۵ نومبر کا لکھا خط ملا۔ چچا جان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتابوں میں اور اخبارات اور رسالوں میں۔ بعض کتابیں اور مضامین تو بڑے فاضلانہ اور معلوماتی ہیں بعض رطب ویابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق اگر کسی نے کچھ مزید لکھنا ہو بالخصوص گھریلو زندگی کے متعلق تو اسی صورت میں لکھنا چاہئے جب کوئی نئی بات کہنے کو ہو۔ ورنہ پہلے سے بیان کردہ باتوں کو دوسرے پیرایہ میں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے جو کچھ چچا جان کے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق معلوم تھا' وہ میں نے فقیر وحیدالدین صاحب کو لکھ کر دے دیا تھا۔ ان کی کتاب روزگارِ فقیر کے دونوں حصوں میں وہ معلومات درج ہیں۔ اور کوئی نئی بات مجھے یاد نہیں۔ تم اس کتاب کے دونوں حصے پڑھ لو' اور بھی جو کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ہے اس کو دیکھ لو' اس کے بعد جو کتاب تم ترتیب دے رہے ہو' اس کو دیکھ لو کہ اس میں گھریلو زندگی کے متعلق کوئی نئی بات بیان کی گئی ہے۔ اگر نئی باتیں ہیں تو ضرور کتاب کو شائع کرو۔ مسودہ پہلے مجھے بھیجو گے تو میں پڑھ کر رائے دے سکوں گا۔

یہاں سب طرح خیریت ہے۔ اپنے والد اور والدہ کو سب کی طرف سے سلام کہہ دینا۔

خیر طلب

اعجاز احمد

علاوہ ازیں جب ۱۹۶۷ء میں ہی ''علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی'' اشاعت پذیر ہوئی تو میں نے انہیں لکھا کہ اس کا جواب لکھا جانا چاہئے مگر ان کا جواب آیا کہ ''نہیں یہ مناسب نہ ہوگا ...... ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہئے ......'' مگر اب ایک دم انہیں عمر کے آخری حصے میں کتاب لکھنے اور پھر خود ہی اسے شائع فرمانے کا خیال کیوں آیا اور وہ بھی اس طرح کہ جس میں انہوں نے ''مخصوص'' سمتوں میں کام کیا۔

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ اپنے برادر بزرگ جناب عطا محمد مرحوم و مغفور کا ہمیشہ بے حد احترام فرماتے تھے اور اکثر و بیشتر اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بڑے بھائی صاحب نے ان کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ ''بانگِ درا'' کی ایک مشہور نظم ''التجائے مسافر'' میں جس محبت اور عزت سے ان کا ذکر فرمایا ہے' پڑھ کر رشک آتا ہے:

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق	ہوئی ہے جس کی اخوت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو	ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں	کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

چنانچہ یورپ سے مراجعت کے بعد انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی مقدور بھر خدمت کی۔ بڑے بھائی کے بچوں کی تعلیم میں ہر طرح مدد کی اور خاص طور پر شیخ اعجاز احمد جو شیخ عطا محمد مرحوم کے سب سے بڑے فرزند تھے، کی ہر طرح رہنمائی فرمائی اور انہیں ہر اونچ نیچ سمجھا کر قانون کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا، جو آئندہ زندگی میں قدم قدم پر ان کے کام آئی۔ وہ ''مظلوم اقبال'' میں یوں اعتراف کرتے ہیں:

''یہاں مجھے ان کی اصابتِ رائے کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے جو فوائد انہوں نے بیان فرمائے۔ وہ سب صحیح ثابت ہوئے۔ میرے کیریئر کے ہر مرحلہ پر قانون کی ڈگری جو میں نے لاء کالج میں داخل ہو کر حاصل کر لی، بڑے کام آئی''۔[1]

اس طرح شیخ اعجاز احمد صاحب کی درست سمت میں رہنمائی کے بعد پھر ان کے لیے اپنی فطرت کے خلاف سفارش تک کی اور انہیں ملازمت دلوائی جس کی وجہ سے بعد میں بہت بڑا نقصان بھی برداشت کیا۔ اس کے بعد حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنی وصیت میں ان کو اپنے نابالغ بچوں کا سرپرست مقرر فرمایا، لیکن ان کے لیے اتنا کچھ کرنے کے باوجود جب ۱۹۳۱ء میں اعجاز صاحب دنیاوی منفعت کی خاطر اپنے اس عظیم چچا کو جو قدم قدم پر ان کے ممد و معاون ثابت ہوئے چھوڑ کر منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شامل ہو گئے تو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو دلی دکھ اور رنج ہوا۔ درحقیقت قادیانی جماعت ایک طویل عرصہ سے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو نیچا دکھانے کے لیے کوشاں تھی کہ ان کے خاندان کے کسی فرد کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خان کے ذریعے شیخ اعجاز احمد صاحب کو شکار کیا گیا۔ ان کے اس عمل نے علامہ صاحب کو ان سے بے حد بددل کر دیا اور وہ شیخ اعجاز سے بہت مایوس ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنے عزیز دوست سر راس مسعود کو خط میں لکھا کہ وہ اعجاز کے قادیانی ہو جانے سے بڑے پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی وصیت میں اس کی جگہ سر راس مسعود کو نامزد کر دیں۔

حال ہی میں آنٹی ڈورس (مسز ڈورس احمد) نے بھی اپنی کتاب

میں اس سلسلے میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ' شیخ اعجاز احمد کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے اپنے بچوں کے سرپرست کی حیثیت سے اپنی وصیت میں شامل کر لینے پر پریشان تھے اور ان کی جگہ کسی دوسرے کو نامزد کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کتاب سے اقتباس ملاحظہ ہو:

(ترجمہ) "شیخ اعجاز احمد' شیخ عطا محمد کے بڑے صاحبزادے تھے اور بڑے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا ان کے بارے میں بہت اچھا نظریہ تھا۔ اس لیے انہوں نے انہیں اپنے نابالغ بچوں کا سرپرست مقرر کیا اور اپنے برادر بزرگ شیخ عطا محمد پر انہیں ترجیح دی۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میری خواہش ہے کہ کوئی اور فرد شیخ اعجاز احمد کی جگہ بچوں کا گارڈین (سرپرست) مقرر ہوتا کیونکہ وہ (شیخ اعجاز احمد) قادیانی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب (علامہ صاحب) نے اپنی اس رائے کا کئی بار مجھ سے اظہار کیا"۔[1]

مندرجہ بالا اظہارِ حقیقت کے بعد یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ اعجاز کے قادیانی جماعت میں شامل ہو جانے سے علامہ صاحب کس قدر رنجیدہ تھے۔ اس طرح شیخ صاحب نے دنیا تو بہت کمائی مگر وہ "محسن کشی" کے مرتکب بھی ہوئے اور محسن بھی کون وہ عمِ محترم جس نے قدم قدم پر رہنمائی اور دستگیری کا حق ادا کر دیا۔ اپنی زندگی میں جو کامیابیاں انہیں حاصل ہوئیں اور جس جس طرح انہوں نے فوائد حاصل کیے' ان کی بنیاد اسی عظیم چچا نے تو رکھی تھی ورنہ وہ خود تو صرف ایم۔ اے[2] کر کے زیادہ سے زیادہ کسی کالج کے پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہونا چاہتے تھے مگر حضرت علامہؒ نے انہیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا اور ہر قدم پر ان کے لیے اپنی فطرت کے خلاف سفارشوں اور رعایتوں کے پل باندھے' تب کہیں وہ (شیخ اعجاز) اس قابل ہوئے کہ اس عظیم ہستی پر بے بنیاد بہتان تراشیں اور ان کی تکذیب کے مرتکب ہوں۔

چوں قلم در دستِ غدارے بود
لا جرم منصور بردارے بود

(اقبالؒ)

بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے کسی دوست نے انہیں بتایا کہ فلاں فلاں شخص آپ کو ہر محفل

میں برا بھلا کہتا ہے اور آپ کے ہر کام میں کیڑے نکالتا ہے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ بڑے حیران ہوئے اور فرمایا ...... ''یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے۔ میں نے تو کبھی اس سے کوئی فیض نہیں کیا؟'' یعنی یہ اس جہان کی ریت ہے کہ آپ جس سے فیض کریں گے' وہی آپ کے خلاف ہو جائے گا ...... کہتے ہیں کہ فیض اور بے فیضی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں ''فیض'' ہوگا ''بے فیضی'' کا وہاں ہونا لازم ہے۔ یہاں مجھے حضرت علیؓ کا ایک مشہور قول یاد آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ:

''جس پر احسان کرو' اس سے محتاط رہو''

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ سے یہیں احتیاط نہیں ہوئی اور انہوں نے جس جس کے ساتھ احسان کیا' اسی نے احسان فراموشی دکھائی۔ جس کے ساتھ فیض کیا بدلے میں ''بے فیضی'' ملی۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ اس جہانِ فانی سے رخصت سے پہلے ہی یہ ان کا قرض اتار گئے' ورنہ بعد میں کون اس چکر میں پڑتا۔

مرا کشتی و تکبیرے نہ گفتی
عجب سنگیں دلے اللہ اکبر!

جدِّ امجد

شیخ صالح محمد المعروف ''بابا لول حج'' ''

خاندانِ اقبال کے جدِّ امجد جن کے متعلق سب سے پہلے قبولیت اسلام کا ذکر ملتا ہے ''بابا لول حج'' یا ''بابا لو لی حج'' کے عرفِ عام سے مشہور رہتا ئے جاتے ہیں۔ ''ذکرِ اقبال'' ''از مولانا عبد المجید سالک میں میرے والدِ گرامی ڈاکٹر نظیر احمد صوفی'' کی روایت سے ایک دوسرے بزرگ شیخ صالح محمد[1] کا ذکر ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر نظیر احمد صوفی صاحب نے اپنی کتاب ''حیات و پیامِ اقبال'' ''میں جو شجرۂ نسب دیا ہے' اس میں جدِّ امجد کا نام ''شیخ صالح محمد عرف بابا لول حج'' ''تحریر کیا ہے اور ان کا تعارف ان الفاظ میں کروایا ہے:

''یکے از مشائخ کشمیر۔ مزار شریف درلوجر' کشمیر''[2]

لیکن اعجاز احمد صاحب نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں کسی شیخ صالح محمد کے وجود ہی سے انکار کیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں انہوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی کسی بابا صالح کا نام نہیں سنا۔[3] البتہ وہ ''ذکرِ اقبال'' میں ڈاکٹر نظیر احمد صوفی کے بیان کردہ واقعہ کی صحت کا اقرار ضرور فرماتے ہیں مگر اس کو اپنے اجداد میں سے ایک شیخ اکبر[4] سے منسلک بتاتے ہیں۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ سب سے پہلے کون مشرف بہ اسلام ہوا بلکہ موضوعِ بحث یہ ہے کہ جدِّ امجد جن کا عرف ''بابا لول حج'' یا لولی حاجی'' تھا' کا اصل نام کیا تھا۔ یہ بات اب طے ہے کہ بابا لول حج نے ہی سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور وہی خاندانِ اقبال کے جدِّ امجد تھے مگر ''لول حج'' یا ''لولی حاجی'' ان کا نام نہیں بلکہ ''عرف''[5] یا ''لقب''[6] تھا۔ جس سے وہ پہچانے جاتے تھے۔

''زندہ رود'' میں ان کا تعارف کرواتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال رقمطراز ہوتے ہیں:

"بابا کول حج کا تذکرہ دیدہ مری سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ابو محمد حاجی محی الدین مسکین کی تالیف "تحائف الابرار فی ذکر الاولیاء الاخیار (تاریخ کبیر کشمیر) ۱۹۰۳ء" کے ریشیوں کے باب میں بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتا ہے:

"ولادتش در موضع چکو جلند پرگنہ آدون بود۔ ہر دو چشم و پایش کج بودند۔ پس وی را داعیہ تزویج ظہور آمد و بازنی عقد نکاح بر بست چوں منکوحہ اش صورت وی را بدید و بخندید۔ دل بابا از وی متنفر گردید۔ پس کمر ہمت بربستہ برآمد۔ سفر زیارت حرمین شریفین نمود و پس از تشریف یابی بزیارت مبارک چوں مراجعت بجانب کشمیر کرد"۔[1]

اسی طرح آگے چل کر "زندہ رود" میں دوبارہ تحریر کرتے ہیں:

"دیدہ مری اور مسکین دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے بیوی سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ ہو سکتا ہے (جیسے مسکین بیان کرتے ہیں) بیوی بوجہ ان کی بھینگی آنکھوں اور ٹیڑھے پاؤں ان پر ہنسا کرتی ہو جس کے سبب بابا صاحب بالآخر دل برداشتہ ہو کر نہ صرف اہل و عیال کو چھوڑ گئے بلکہ تارک الدنیا ہو گئے۔ کشمیر کو خیرباد کہہ کر حرمین الشریفین کا رخ کیا اور بارہ سال تک سیاحت کرتے رہے"۔[2]

قابلِ غور بات یہ ہے کہ:

مندرجہ بالا اقتباسات میں بابا صاحب کے جن جسمانی نقائص کا تذکرہ ہے کیا ان کا عرف "لولی" اسی کی نشاندہی نہیں کرتا؟ یہ لفظ پنجابی میں اسی قسم کے جسمانی نقائص کے لیے مستعمل ہے۔ شاید زمانہ قدیم میں کشمیری زبان میں بھی یہ لفظ انہی معنی میں موجود رہا ہو اور پھر پنجاب اور کشمیر کا ساتھ تو بہت پرانا ہے اور ایسا ہونا ممکن ہے۔ اگر اس کا مطلب عاشقِ حج مانا جائے تو یہ لقب یا عرف ان کو کوئی ایک حج ادا کرنے کے بعد دیا گیا اور یہ حج انہوں نے اپنی شادی کے بعد کیے جب وہ گھر سے ناراض ہو کر چلے گئے بلکہ تارک الدنیا ہو جانے کے بعد کیے یعنی اس سے پیشتر ان کا لازماً کوئی دوسرا نام رہا ہو گا جس سے ان کو پکارا اور پہچانا جاتا ہو گا۔ جب ان کا نکاح ہوا تو کسی نام کے تحت ہی یہ فرض ادا کیا گیا ہو گا۔ اس وقت یقیناً وہ "کولی حاجی" یا "کول حج" کا عرف یا لقب نہیں رکھتے ہوں گے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کشمیر کے بیشتر لوگ ایران سے ہجرت کر کے کشمیر میں آباد ہوئے۔ ان کا لباس، رہن سہن، رسم و رواج، کھانا پینا اور زبان کافی حد تک ایران سے مشابہ ہے شاید اسی لیے اس کو ایران صغیر بھی کہا جاتا ہے۔ فارسی میں "کول" پاپ کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس لیے اس کا بھی قوی امکان ہے کہ "بابا کول حج" یا "بابا کولی" کسی ایسے

پیشہ سے وابستہ رہے ہوں یا کوئی ایسا دستی کام کرتے ہوں جس میں پائپ کا بھی دخل رہا ہو۔ چنانچہ اسی مناسبت سے انہیں یہ عرفیت حاصل ہو گئی ہو۔ کیونکہ ایران میں پیشوں کی مناسبت سے اسی طرح ایک دوسرے کو پکارا اور پہچانا جاتا ہے۔ تیل کو "نفت" کہتے ہیں' اس لیے تیل کا کام کرنے والا "آقائی نفتی" کہلاتا ہے۔ جوتا بنانے والا "آقائی کفشی" کے نام سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ جوتے کو فارسی میں "کفش" کہتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی بائیسکل پر سوار ہے تو "آقائی دوچرخی" کہہ کر پکارا جائے گا کیونکہ بائیسکل کو ایران میں "دوچرخی" کہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ "پلمبر" کا کام کرتے ہیں یا کسی طرح بھی پائپ سے متعلقہ کسی کام سے منسلک ہوں' "لَول" کی مناسبت سے "آقائی لَولی" کے عرف سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ "بابا لَول حج" یا "لَولی حاجی" اپنے کسی اسی قسم کے پیشہ کی وجہ سے یہ عرف رکھتے ہوں۔

مندرجہ بالا تمام حقائق کے باوجود یہ سوال ابھی تک حل طلب ہے کہ خاندانِ اقبال کے جدِ امجد جن کا عرف عام "لَول حج" یا "لَولی حاجی" تھا' کا اصل نام کیا تھا۔ اسی سلسلے میں جو دوسری شخصیت ہمارے علم میں آئی ہے' ان کا نام نامی شیخ صالح محمد معلوم ہوا ہے۔ اس لیے اب یہ تحقیق ہونی چاہیے کہ کہیں یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی تو نہیں ہیں۔ یعنی "بابا لَول حج" یا "بابا لَولی حاجی" کا اصل نام ہی تو شیخ صالح محمد نہیں؟ کیونکہ ابھی تک عرفیت کو ہی نام کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے جو کسی صورت درست نہیں۔ یہ عرفیت یا لقب جو بھی اس کو کہا جائے یا تو بابا صاحب کی جسمانی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے یا پھر ان کے پیشہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے یا عمر کے آخری حصہ میں حج کی مناسبت سے وہ اس لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ شیخ صالح محمد یا "بابا صالح" اور "بابا لَول حج" ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ جن میں شیخ صالح محمد تو ان کا اصل نام اور دوسرا عرفیت کے ضمن میں آتا ہے۔ چنانچہ خاندانِ اقبال کے جدِ اعلیٰ جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا' شیخ صالح محمد المعروف "بابا لَول حج" یا "بابا لَولی حاجی" تھے۔ ہمیشہ ہی ان کی عرفیت کو ان کے اصل نام کی جگہ استعمال کیا جاتا رہا لیکن کسی نے یہ تحقیق کرنے کی کوشش نہ کی کہ ہر عرفیت یا لقب کے پیچھے ایک اصل نام بھی ضرور ہونا چاہیے۔ دنیا میں ہر جگہ عرفیت کا رواج ہے۔ بے شمار لوگ اپنے پیشوں یا کسی جسمانی نقص کی بنا پر یا پھر اپنے کسی اچھے کام کی نسبت سے کسی نہ کسی عرف یا لقب سے مشہور ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنا ایک اصل نام ضرور رکھتے ہیں۔ وہ نام جو والدین ہر بچے کو اس کی پیدائش کے وقت دیتے ہیں۔ اگر ہمارے لیے

شیخ صالح محمد کا نام "بابا لول حج" کے لیے قابلِ قبول نہیں تو پھر کوئی دوسرا نام تحقیق کرنا ہوگا مگر یہ کسی طور درست نہیں کہ شیخ صالح محمد کے نام کو مسترد کرتے ہوئے صرف "لول حج" یا "لولی حاجی" پر ہی اکتفا کرلیا جائے جوان بزرگ کا صرف "عرف" یا "لقب" تھا۔

چنانچہ ڈاکٹر نظیر احمد صوفی نے اپنی تصنیف "حیات و پیامِ اقبالؒ" میں خاندانِ اقبال کے شجرۂ نسب میں ان کے جدِّ امجد کا نام نامی شیخ صالح محمد المعروف بابا لول حج بالکل درست لکھا ہے کیونکہ یقینی طور پر بابا لول حج کا وہ نام جوان کی پیدائش پر ان کے والدین نے انہیں دیا' شیخ صالح محمد ہی تھا۔

چنانچہ کتاب زیرِ نظر میں بھی خاندانِ اقبال کا جو تفصیلی اور مکمل شجرۂ نسب شامل کیا گیا ہے' اس حقیقت کا خیال رکھتے ہوئے خاندانِ اقبال کے جدِّ امجد کا نام نامی "شیخ صالح محمد المعروف بابا لول حج" ہی لکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اصحابِ فکر و نظر آئندہ "بابا لول حج" کو ان کے حقیقی نام "شیخ صالح محمد" سے ہی پکاریں گے۔

بر نسب نازاں شدن نادانی است
حکمِ او اندر تن و تن فانی است

(رموزِ بے خودی)

بوقتِ ہجرت

خاندانِ اقبال میں وجودِ زن؟

تاریخِ ولادتِ اقبالؒ جس کا اندراج سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ میں دستیاب ہے یعنی ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے اطلاع کنندہ علی محمد کے متعلق باوثوق ذرائع کہتے ہیں کہ وہ شیخ نور محمد مرحوم کے پھوپھی زاد تھے۔ مگر کچھ احباب نے اسے غلط ثابت کرنے کے لیے عجیب و غریب دلائل کا سہارا لینے کی سعی لاحاصل فرمائی اور یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے پردادا شیخ جمال الدین صرف اپنے چار بیٹوں کے ساتھ ہجرت کر کے کشمیر سے واردِ پنجاب ہوئے کیونکہ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی' اس لیے کسی پھوپھی زاد کا وجود ممکن ہی نہیں۔ کچھ بزرگ ہر بات اتنی قطعیت سے فرماتے ہیں

کہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ آخر کس بنا پر خود کو عقلِ کل جانتے ہیں کہ ان کی فرمودہ پتھر پر لکیر کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعتاً شیخ جمال الدین صرف اپنے چار ہی بیٹوں کے ساتھ وارد پنجاب ہوئے تو یہ کس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ان کی کوئی بیٹی تھی ہی نہیں جو ہجرت کے وقت پیچھے کشمیر میں رہ گئی تھی۔ جس کی وہیں کشمیر میں شادی ہو چکی تھی اور وہ چونکہ اپنے سسرال میں تھی اس لیے ان کے ہمراہ ہجرت کرنا ان کے لیے کسی طور بھی ممکن نہیں ہوا۔ یا اگر وہ اس وقت اپنے والد اور بھائیوں کے ہمراہ ہجرت نہیں کر سکیں تو کیا بعد میں کسی وقت وارد پنجاب ہونے پر کوئی پابندی تھی؟ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جناب شیخ جمال الدین کی اپنی کوئی حقیقی بیٹی ہی نہیں تھی اور وہ اسی لیے صرف اپنے چار بیٹوں کے ساتھ ہی وارد پنجاب ہوئے تھے تو کیا اس طرح کشمیر سے ان کا تعلق ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ یعنی کشمیر سے اگر انہوں نے اپنے چار بیٹوں کے ساتھ ہجرت کی تو کیا پیچھے کشمیر میں ان کا کوئی دور یا نزدیک کا عزیز رشتہ دار قرابت دار کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ کیا ان کا قبیلہ انہی پانچ نفوس پر مشتمل تھا یعنی ایک باپ اور چار بیٹے؟ ددھیال، نھیال، سسرال وغیرہ وغیرہ یہ سب رشتے کیا ہوئے؟ پھوپھیاں، خالائیں، چچا، ماموں ...... آخر سب ہی تو موجود ہوں گے ...... اگر وہ ان کے ساتھ آ کر یہاں پنجاب میں آباد نہیں ہوئے تو کشمیر میں تو لازماً موجود رہے ہوں گے۔ یا یہاں پنجاب میں آباد ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے ان سب سے قطع تعلق کر لیا ...... کیا یہ ممکن ہے؟

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قومیں جب ہجرت کرتی ہیں تو کبھی بھی یہ نہیں ہوا کہ اس کے تمام کے تمام افراد یکبارگی نقلِ مکانی کر جائیں۔ کیونکہ یہ عمل ہمیشہ بتدریج ہوتا رہا ہے۔ کسی حادثہ یا ناقابلِ فراموش واقعہ کی بنا پر ان میں سے کچھ افراد جو زیادہ متاثر ہوتے ہیں، ترکِ وطن میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد جب کوئی دوسری افتاد پڑتی ہے تو چند مزید نفوس کسی پناہ گاہ کی تلاش میں وطن کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح پھر کسی نئی قیامت کے برپا ہونے پر باقی ماندہ لوگ بھی کوچ کر جاتے ہیں۔ یہی حال کشمیریوں کی ہجرت کا ہے جو مختلف مقامات اور حالات اور ادوار میں وقوع پذیر ہوتی رہی ...... مگر کیا اس کی وجہ سے کشمیر خالی ہو گیا؟ ماشاءاللہ آج بھی کروڑوں مسلمان وہاں آباد ہیں اور یہاں پنجاب میں بے شمار ایک دوسرے کے قرابت دار اور قبیلہ کے لوگ آباد ہیں جن کا آپس میں میل جول بھی ہے، رشتہ داریاں بھی ہوتی ہیں، آنا جانا بھی رہتا ہے۔ آپ دنیا کے دوسرے کنارے جا بسیں، کبھی نہ کبھی تو کوئی چاہنے والا عزیز ضرور مل جاتا ہے اور اس دور میں جب شیخ جمال الدین نے ہجرت کی، پنجاب اور کشمیر تو بالکل جڑواں حیثیت

کے مالک تھے۔ پہاڑی راستوں سے واقفیت رکھنے والے تو پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ اس لیے ان کا بھی کشمیر کے ساتھ تعلق اسی طرح رہا ہوگا۔ اگر وہ اپنے عزیزوں سے ملنے نہ جاسکتے ہوں تو کشمیر سے لوگ لازماً ان سے ملنے آتے ہوں گے۔ اس لیے یہ کہنا کہ علامہ علیہ الرحمۃ کے پر دادا شیخ جمال الدین صرف اپنے چار بیٹوں کے ساتھ واردِ پنجاب ہوئے' کسی صورت درست نہیں۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد بھی یقیناً ہجرت کا یہ عمل جاری رہا۔ اگر نہیں تو ان کا رابطہ لازماً کشمیر سے رہا اور اگر کسی وجہ سے انہوں نے کشمیر جانا چھوڑ دیا ہو' مگر کشمیر سے ان کے قبیلہ اور خاندان کے لوگ ضرور تجدید ملاقات کے لیے آتے رہتے ہوں گے۔ اسی قاعدہ کلیہ کے تحت ان کے خانوادہ کے کچھ مزید نفوس یہاں سیالکوٹ یا اردگرد موجود رہے ہوں گے۔

اس لیے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ صرف پانچ نفوس' ایک باپ اور چار بیٹے ہجرت کرکے واردِ پنجاب ہوئے اور ان سے پہلے یا بعد میں کوئی دوسرا ان کے خاندان یا قبیلہ سے واردِ پنجاب نہیں ہوا اور نہ ہی یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ شیخ جمال الدین کی اپنی کوئی حقیقی بیٹی نہیں تھی اس لیے ان کے چاروں صاحبزادوں کی نہ تو کوئی حقیقی بہن تھی اور نہ ہی کوئی پھوپھی زاد' خالہ زاد' ماموں زاد یا چچا زاد۔ میرے خیال میں اس قسم کے غیر فطری دعویٰ کرنے والے احمقوں کی جنت میں بستے ہیں کیونکہ اس دنیا میں رہتے ہوئے کوئی انسان مندرجہ بالا رشتوں سے نہ تو انکار کرسکتا ہے اور نہ ہی ان کے بغیر اس معاشرے میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کیونکہ انسانی بقا کا عمل ابتدائے آفرینش سے اسی قاعدہ کلیہ کا مرہونِ منت رہا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

(بانگِ درا)

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

(بالِ جبریل)

دوسرا ردِّعمل

فقیہانِ شہر آشوب بنام ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول)

پہلا ردِّعمل آپ نے دیکھا' یہ دوسرا ہے۔ حیرت ہے کہ دونوں ایک ہی ذاتِ شریف کے اعمال کے ردّ میں ظاہر ہو رہے ہیں۔نہیں کہا جا سکتا کہ اگر ایک ہی وجہ بار بار ردِّعمل کا باعث ہو تو اس کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جانا چاہئے جو اسے ایسے اعمالِ بد سے باز رکھ سکے جو بار بار کے ردِّعمل کے جوالا کا موجب بنے؟

کارِ شیطاں می کند نامش ولی
گر ولی ایں است لعنت بر ولی

(مولانا رومؒ)

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) ۱۹۷۱ء میں بزمِ اقبال لاہور کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی گھریلو زندگی کے نادر واقعات کے علاوہ ان کی بالکل درست تاریخِ ولادت جو سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ سے دستیاب ہوئی' بھی شامل تھی۔ اشاعت سے قبل مسودہ بزمِ اقبال لاہور کے اراکین مجلس نے ملاحظہ فرمایا جن میں ڈاکٹر جاوید اقبال' جسٹس ایس اے رحمٰن' سید عابد علی عابد' سید نذیر نیازی وغیرہم شامل تھے۔ علاوہ ازیں سب سے پہلے سید امتیاز علی تاج جو ان دنوں بزمِ اقبال اور مجلس ترقی و ادب کے معتمد اعزازی ہوا کرتے تھے' اس کو اشاعت کے لیے بصد شکریہ قبول کر چکے تھے۔ اس تمام کارروائی کے بعد مسودہ جناب مولانا غلام رسول مہرؔ کو بھجوا دیا گیا جنہوں نے ایک مفصل اور مدلل پیش لفظ اس پر تحریر کیا۔ ان تمام حضرات میں سے کسی نے بھی مندرجات پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ میری تحقیق کردہ تاریخِ ولادت کو بے حد سراہا گیا...... اس کا برملا اظہار مولانا مہرؔ نے پیش لفظ میں بھی کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مرحوم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک مجمل سی تحریر شیخ عطا محمد مرحوم نے روزنامہ ''انقلاب'' میں چھپوا دی' یعنی ۱۸۷۳ء یہی تاریخ عموماً مستند سمجھی جاتی رہی۔ پھر کہا گیا کہ ۱۸۷۶ء صحیح تاریخِ ولادت ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں پوری چھان بین کے بعد طے کر دیا گیا ہے کہ صحیح تاریخ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ عیسوی تھی (۲۸ ذیقعدہ ۱۲۹۰ ہجری' اور دن غالباً دوشنبہ)۔ اس مسئلے کے لیے بھی کتاب کا ایک مستقل باب وقف ہے جس میں ہر اعتبار سے محکم دلائل پیش کر دیئے گئے ہیں۔ یقین ہے کہ اس مسئلے پر مزید بحث یا گفتگو کی ضرورت پیش نہ آئے گی''۔ !

مولانا مہرؔ کا فاضلانہ پیش لفظ پورا پڑھنے کے قابل ہے اور ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں شامل ہر بات کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ان کا یہ فرمانا:

''میں کہہ نہیں سکتا کہ اقبال مرحوم و مغفور کے سوانح میں اب تک کتنی کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ اغلب ہے' ان کا خاصا بڑا حصہ میری نظر سے نہ گزرا ہو' لیکن جس وضع اور انداز کی کتاب کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں' ویسی تو شاید یہی کتاب مرتب ہوئی ہے جس کا مقدمہ لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ہر صفحے پر مرحوم و مغفور ابتدا سے آخری دور

تک کاملاً بے ساختہ انداز میں چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کی بیشتر حکایات و روایات خود علامہ مرحوم کے اہلِ خاندان کی زبان سے بیان کی گئی ہیں، جس سے زیادہ مستند شہادت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ان روایات میں بھی بڑا حصہ مرحوم کی برادرزادی کا ہے، جن کی زندگی بچپن سے شادی تک علامہ مرحوم اور ان کی بیگم یعنی والدہ مرحومہ عزیزی جاوید اقبال کے ظلِ عاطفت میں گزری۔ جس حد تک مجھے علم ہے، اقبال مرحوم کا برتاؤ اپنے بھائی کے بچوں کے ساتھ ویسا ہی تھا کہ جیسا کسی باپ کا برتاؤ اولاد کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ مرحوم کے نزدیک اپنے بچوں اور بھائی کے بچوں میں اصلاً امتیاز کی گنجائش ہی نہ تھی۔ برادرزادے علامہ مرحوم ہی کے زیرِ نگرانی تعلیم و تربیت پا کر ملازم ہوئے۔ اس برتاؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بھائی ہی نے علامہ مرحوم کی تعلیم خصوصاً ولایت کی تعلیم کے گراں قدر مصارف انتہائی خوش دلی سے برداشت کیے تھے، لیکن جس برادرزادی کی بیشتر روایات سے یہ کتاب مزیّن ہے، اسے مرحومہ بیگم اقبال نے بچپن ہی میں منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور برابر اپنے ساتھ رکھا۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان گراں بہا معلومات کو محفوظ رکھنا ممدوحہ کا کتنا عظیم القدر کارنامہ ہے، جسے علامہ مرحوم کے کروڑوں نیازمندوں کی گردن پر ایک دائمی احسان کی حیثیت حاصل رہے گی۔ پھر ممدوحہ کے صاحبزادے عزیزی خالد نظیر صوفی کا ہم سب کو سپاس گزار ہونا چاہیے جن کی سعی و کاوش سے یہ گنجینہ بے بہا مرتب ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے''۔!

مگر میرے سب سے بڑے ماموں جناب شیخ اعجاز احمد صاحب کو میری یہ جسارت بالکل پسند نہ آئی کہ فقیر سید وحید الدین کی کتاب ''روزگارِ فقیر'' کے ذریعے انہوں نے جو تاریخِ پیدائش تحقیق کروائی تھی، اس کے خلاف کوئی بات جائے۔ چنانچہ انہوں نے بہت شور و غوغا مچایا اور بزمِ اقبال والوں کو خوب رگیدا کہ آپ نے اس قسم کی کتاب شائع ہی کیوں کی۔ ان دنوں بے چارے پروفیسر عثمان بزم کے معتمد اعزازی تھے جو شاید یہ دباؤ برداشت نہ کر سکے اور شیخ اعجاز صاحب کے ہمنوا بن کر ایک بار پھر تاریخ ولادت اقبال کی تلاش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بزمِ اقبال کے زیرِ سایہ کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں تشکیل دے دی گئیں۔ اس سلسلے میں شیخ اعجاز صاحب سے ان کی طویل خط و کتابت رہی اور اعجاز صاحب نے بزم کے اجلاس میں شرکت فرما کر بڑے پرمغز اور زوردار مقالے بھی پڑھے۔ جن میں انہوں نے تاریخ ولادت اقبال پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ مجھ ناچیز اور میری کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' پر بھی نظرِ کرم فرمائی اور اپنے جلے دل کے پھپھولے خوب خوب پھوڑے۔ ان کی انہی تحریروں میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

(ترجمہ) ''میں جیسا کہ آپ کی قائم کردہ ذیلی کمیٹی جو علامہ اقبال کی درست تاریخِ ولادت مقرر کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے' کے سلسلے میں ''اقبال درونِ خانہ'' میں تاریخِ پیدائش کے متعلق درج حقائق تک اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہتا ہوں اور کسی دوسرے موضوع کے متعلق کچھ کہنا پسند نہیں کرتا۔ البتہ ریکارڈ کی درستگی کے لیے میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ اس میں شامل اکثر باتیں بالکل جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ کچھ شاید آدھی سچی ہو سکتی ہیں اور کچھ تو بالکل ''الف لیلوی کہانیوں'' کے زمرے میں آئیں گی۔ اگر میرے چچا جان کو کسی طرح اس کتاب کے مندرجات کے متعلق جنت الفردوس میں علم ہو جائے تو وہ بے چارے پکار اٹھیں گے ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''۔ مجھے تعجب ہے کہ بزمِ اقبال جیسے ادارے نے کس طرح اس قسم کی ''کہانیوں کی کتاب'' کو اپنی طرف سے شائع کرنا پسند کیا''۔!

جناب شیخ اعجاز احمد صاحب نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے اور ہر طرف شور مچا کر لوگوں کو جھنجھوڑتے رہے ہیں کہ خدارا کچھ کر لیں ورنہ غضب ہو جائے گا۔ مگر مقامِ حیرت ہے کہ اتنا کچھ زہر اگلنے کے باوجود شیخ صاحب نے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں درج کئی ایک واقعات معمولی رد و بدل کے ساتھ اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں شامل فرما لیے ہیں۔ گو ان میں کرداروں کے نام عمداً تبدیل کر دیے گئے ہیں مگر ان کی نشان دہی کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ دراصل شیخ صاحب قبلہ کو ہمیشہ ہی سے یہ اصرار رہا ہے کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے متعلق جو کچھ وہ بیان فرمائیں' وہی صدفی صد درست تسلیم کیا جانا چاہیے' کیونکہ وہ علامہ صاحب کے ''چہیتے'' بھتیجے رہ چکے ہیں۔ کوئی دوسرا خواہ وہ علامہ علیہ الرحمۃ سے کتنا قریب ہی کیوں نہ رہا ہو' جن میں میری والدہ مرحومہ جو علامہ علیہ الرحمۃ کی بھتیجی اور شیخ اعجاز احمد صاحب کی حقیقی ہمشیرہ ہیں' کچھ بیان کریں تو وہ بالکل جھوٹ کا پلندہ اور ''الف لیلوی کہانیوں'' کے زمرے میں آئے گا۔ یہ دوہرا معیار شاید ان کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی بات ''میرے والدِ محترم'' بیان کرتے ہیں تو وہ شیخ صاحب کو اس لیے پسند نہیں آتی کہ وہ ان کے ''دور کے رشتہ دار'' تھے۔ میرے والد مرحوم چونکہ علامہ صاحب کی بڑی ہمشیرہ محترمہ طالع بی بی خلد آشیانی کے پوتے ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں' اس لیے وہ شیخ اعجاز صاحب کے دور کے رشتہ دار ٹھہرے مگر جو رشتہ بعد میں قائم ہوا..... یعنی حقیقی بہنوئی کا..... وہ ان کو قبول نہیں حالانکہ میرے والدین کے نکاح نامہ پر انہی شیخ اعجاز احمد صاحب نے دلہن کے وکیل کی حیثیت میں دستخط ثبت فرمائے' اس کا اصل میرے پاس محفوظ ہے۔ اس قبیل کے لوگوں کی کسی بات کا اعتبار کرنا بڑا مشکل ہو جایا کرتا ہے' جو اپنی مطلب پرستی میں اپنے ماں

باپ کو بھی پہچاننے سے انکاری ہو جائیں۔

نیشِ عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

علاوہ ازیں ''مظلوم اقبال'' میں وہ تمام واقعات جو اس سے پیشتر مصنف ''مظلوم اقبال'' کی روایت کے ساتھ ''روزگارِ فقیر'' میں شائع ہو چکے تھے' شامل کیے گئے ہیں اور بعض تو بالکل دوہرانے کے زمرے میں آتے ہیں۔ حالانکہ میں نے جب ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے سلسلے میں ان سے کچھ اعانت چاہی تو مجھے جواب میں تحریر فرمایا کہ اگر تمہارے پاس نئے واقعات ہوں تو ضرور کتاب شائع کرو' ادھر ادھر سے شائع شدہ واقعات جمع کر کے ایک نئی کتاب کو شکل دینا چاہتے ہو تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے ان کی صائب رائے پر عمل کرتے ہوئے پوری پوری کوشش کی کہ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں بالکل غیر مطبوعہ واقعات جمع کروں اور اسی لیے اس کی ضخامت کافی کم رہی ...... حالانکہ کئی ایک کرم فرماؤں نے جن میں ''ادبی دنیا'' کے جناب محمد عبداللہ قریشی اور جناب نذیر نیازی شامل تھے' مشورہ دیا کہ اس میں کچھ حوالے ادھر ادھر سے بھی شامل کر لیں اور ضخامت کم از کم تین چار سو صفحات تک لے جائیں' مگر میں نے محض اس بنا پر انکار کر دیا کیونکہ میرا ارادہ صرف اور صرف نئے واقعات قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بزمِ اقبال کی طرف سے اشاعت کے لیے منتخب کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں غیر ضروری مواد شامل نہیں تھا اور یہ بالکل نئے انداز میں حیاتِ اقبال کے اندرونِ خانہ پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈال رہی تھی۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) جسے مصنف ''مظلوم اقبال'' نے ''کہانیوں کی کتاب'' اور ''جھوٹ کا پلندہ'' قرار دیا تو حکومتِ پاکستان کے ادارے بزمِ اقبال کی جانب سے نہ صرف شائع ہوئی[1] بلکہ اس کا دوسرا ایڈیشن[2] بھی چھپ چکا ہے' مگر ان کی اپنی کتاب یعنی

''مظلوم اقبال'' جس کے متعلق شاید انہیں ''حقائق'' سے مزین ہونے کا زعم رہا ہوگا' کوئی پرائیویٹ ادارے نے بھی شائع کرنے کی حامی نہیں بھری۔ چنانچہ انہیں خود اسے شائع فرمانا پڑا اور شاید ''مفت'' ہی تقسیم بھی کرنا پڑا کیونکہ کوئی قیمت اس پر درج نہیں۔ امید ہے اس طرح مصنف ''مظلوم اقبال'' پر ''مقبول'' اور ''غیر مقبول'' تحریروں کا فرق ضرور واضح ہو گیا ہوگا۔ بے چاروں کو یہی تو اعتراض تھا کہ آخر بزمِ اقبال لاہور جیسے ادارے نے کیوں ایک ایسی

''کہانیوں کی کتاب'' شائع کی۔

بانٹ دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تیری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

(مولانا شبلی نعمانی)

مصنف ''مظلوم اقبال'' کا یہ فرمانا کہ اگر ان کے چچا جان یعنی حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو کہیں جنت الفردوس میں اس کتاب یعنی ''درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے مندرجات کا علم ہو جائے تو وہ بے چارے پکار اٹھیں گے کہ...... ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ''۔ حیرت ہے کہ مصنف ''مظلوم اقبال'' کو ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے مندرجات کی وجہ سے اپنے ''مظلوم'' چچا جان کا اس قدر خیال رہا اور وہ ان کے غم میں اس قدر دبلے ہوتے رہے مگر خود انہوں نے کیا کیا؟ ''مظلوم اقبال'' میں انہوں نے جس جس طرح اپنے عمِ محترم پر ''ظلم'' روا رکھے اور جس جس طرح انہیں ''بدنام'' کرنے کی کوشش ناتمام فرمائی' ان سب کو دیکھ کر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اگر ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) کے مندرجات کو جان کر وہ اپنے دوستوں سے پناہ کے طلبگار ہوں گے تو یقیناً ''مظلوم اقبال'' میں ان پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات جن میں سرِفہرست ''منکرینِ ختمِ نبوت کا ساتھ دینے' ان کو اچھا سمجھنے اور ان سے مشاورت طلب کرنے والے''[1] تک ثابت کرنے کی سعی لاحاصل فرمائی ہے۔ مصنف ''مظلوم اقبال'' کا بس نہیں چلا اور اس کا انہوں نے اعتراف بھی کیا ہے[2] ورنہ وہ علامہ صاحب کو بھی اپنے ''ناکردہ گناہ'' والدِ مرحوم (شیخ عطا محمد مرحوم) کی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے خصوصی دوستوں اور ''سابقون'' میں شامل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ اس کے علاوہ ''مظلوم اقبال'' میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو ''کان کے کچے''[3]' ''حاسد''[4]' ''سر ظفر اللہ خان کی وجہ سے احساسِ محرومی و ناکامی کا شکار''[5] وغیرہ وغیرہ ثابت کرنا چاہا ہے تو یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد روحِ اقبال کا ردِ عمل کیا رہا ہوگا اور وہ کس کس طرح نہ تڑپی ہوگی۔ اس کا اندازہ شاید مصنف ''مظلوم اقبال'' کو نہیں ہوا یا وہ جانتے بوجھتے اس حقیقت سے چشم پوشی فرما رہے ہیں مگر انشاء اللہ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کو اس سب کا حساب دینا پڑے گا جس کی ابتدا تو یقیناً ہو چکی ہے۔

اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ راقم الحروف نے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں اس قسم کے بہتان اور الزام لگانے کی جسارت نہیں کی بلکہ ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ میں نے تو اپنے عظیم نانا جان (علامہ علیہ الرحمۃ) کی عظمت اور بزرگی کے قدم قدم پر گن گائے ہیں اور ان کی پیاری شخصیت کو مزید نکھارنے کی سعی ہی کی ہے اور حیاتِ اقبال کے ان پوشیدہ گوشوں کو منظرِ عام پر لایا ہوں جو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی مہربان شخصیت کو مزید دلنواز بنا دیتے ہیں۔ یہ سعادت بھی الحمدللہ میرے حصے ہی میں آئی کہ سب سے پہلے ''اقبال درونِ خانہ'' میں ''بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی'' کے تحت ان پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کو ان کے دامن سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں پوری طرح کامیاب رہا۔[6] مجھے امید واثق ہے کہ میری اس کامیاب کوشش کی وجہ سے یقیناً روحِ اقبال' جنت الفردوس میں شاداں اور فرحاں ہو گی کہ آخر خاندان میں سے کسی کو اس کی توفیق بھی ہوئی۔

''مظلوم اقبال'' کے مصنف نے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی تاریخ ولادت پر بحث فرماتے ہوئے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ میں نے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ ملازمت کے حصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے والدین نے ان کی تاریخِ پیدائش غلط لکھوائی تا کہ حصولِ تعلیم کے بعد عمر کم رہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مصنف ''اقبال درونِ خانہ'' نے اس طرح علامہ کے والدین اور خود علامہ کی بڑی اچھی تعریف کی ہے۔[1] اگر میں نے ایسا لکھا تو یقیناً اس لیے کہ عام طور پر ایسا ہو جاتا ہے اور لوگ اس طرح کرتے رہے ہیں بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔ میرے اپنے ساتھ یہی معاملہ ہے کہ میری اصل تاریخ پیدائش ۲۸ جون ۱۹۳۹ء ہے مگر جب میٹرک کا امتحان دیا اور سکول ریکارڈ سے تاریخ پیدائش حاصل کی تو وہاں ۲۵ دسمبر ۱۹۳۹ء درج پائی۔ چونکہ اس وقت ممکن نہیں تھا' اس لیے سکول ریکارڈ کے حساب سے چلنا پڑا اور اب یہی تاریخ پیدائش استعمال کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کس ضرورت کے تحت سکول میں داخلے کے وقت چھ ماہ کی کمی عمر میں کی گئی۔ اب اس میں میرے والدین کی نیت پر تو کوئی شک نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ کبھی کبھی یہ کام غیر ارادی طور پر بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ میری اس چھوٹی سی بات کو تو مصنف ''مظلوم اقبال'' نے بہت محسوس فرمایا' مگر خود کیا کیا یعنی ''خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت'' والا معاملہ ہے کہ خود تو اپنے بزرگوں کے ایمان پر حملہ آور ہونے میں گریز نہیں کیا اور انہیں منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شامل فرما کر ان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد کرنے کی پوری پوری سعی فرمائی ...... اور الزام اس ناچیز کو دیا جا رہا ہے ...... ''ایں چہ بوالعجبی

است.....؟'' میں سمجھتا ہوں اور مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ پر سب سے بڑا ظلم خود مصنف ''مظلوم اقبال'' نے روا رکھا..... اقبال اگر مظلوم ہیں تو ان کی وجہ سے۔ اگر دوسروں نے غلط بیانیاں کیں تو وہ تو غیر تھے مگر اپنوں کا ظلم تو زیادہ ناقابلِ برداشت ہوا کرتا ہے..... چنانچہ روحِ اقبال یقیناً اس ظلمِ عظیم پر بے طرح تڑپ رہی ہوگی اور پکار پکار کر کہہ رہی ہوگی ''مجھے میرے چہیتوں کے ظلم سے بچاؤ!''

میری والدہ مرحومہ جن کی یادداشتوں پر ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں درج زیادہ تر واقعات کا انحصار ہے' کی حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے پاس اپنے بچپن اور جوانی میں موجودگی کے لیے کسی حمایت کی ضرورت تو نہیں لیکن پھر بھی اتمامِ حجت کے طور پر میں جاوید ماموں کی تحقیق یہاں پیش کرنا چاہوں گا' جو میرے لیے باعثِ تقویت اور معترضین کے لیے یقیناً باعثِ ندامت ہے۔ ''زندہ رود'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''انارکلی والا مکان' جس میں اقبال صرف علی بخش کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ۱۹۱۳ء میں سیالکوٹ والے گھر کی طرح خاصا آباد ہو گیا۔ مختار بیگم اور سردار بیگم کے علاوہ' اقبال کی ایک غیر آباد بہن کریم بی بی بھی یہیں رہنے لگیں۔ نیز شیخ عطا محمد کی دو چھوٹی بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم کو سردار بیگم سیالکوٹ سے اپنے ساتھ لے آئیں۔ گھر میں چہل پہل ہو گئی۔ سب کے سب خوشی و مسرت سے دن گزارنے لگے۔ اقبال شام کو کاموں سے فراغت کے بعد اپنی بہن اور بیویوں کے ساتھ عموماً تاش یا لڈو کھیلتے' اپنی بھتیجیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے یا کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اڑاتے' بیویوں اور بہن کے اصرار پر اقبال نے اپنی پہلی بیوی کو بھی بلوا لیا۔ سو کریم بی بی (علامہ صاحب کی پہلی بیوی) ایک آدھ بار انارکلی والے مکان میں آ کر سب کے ساتھ رہیں' مگر صرف چند دنوں کے لیے۔ مردانے میں پہلے کی طرح اقبال کے احباب کی محفلیں لگتیں۔ گرامی آ جاتے تو کئی کئی دن قیام کرتے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سب سیالکوٹ چلے جاتے اور وہاں رونق لگتی۔''[1]

یہ ۱۹۱۳ء کی آخری سہ ماہی کا ذکر ہونا چاہیے' کیونکہ سردار چچی جان (والدہ جاوید) کی رخصتی اگست یا ستمبر ۱۹۱۳ء[2] میں ہوئی۔ میری والدہ ماجدہ کی پیدائش فروری ۱۹۱۲ء کی ہے یعنی وہ ابھی دو برس سے بھی کم عمر تھیں کہ ان کی سردار چچی ان کو اپنے ساتھ لاہور لے گئیں اور یوں وہ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۴ء تک یعنی اپنی شادی تک' اپنے چچا جان کی ''درونِ خانہ زندگی'' کی عینی شاہد بنیں۔ چنانچہ ''اقبال درونِ خانہ'' میں مندرج حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی گھریلو زندگی کی وہ

سرگرمیاں ہی پیش کرنے کی کوشش کی گئی' جن میں میری والدہ محترمہ وسیمہ بیگم کی شمولیت یقینی رہی۔ مصنف ''مظلوم اقبال'' اگر ان پر اعتراض فرما رہے ہیں تو ان سے دریافت کیا جانا چاہیۓ کہ آپ جب وہاں موجود ہی نہیں تھے تو پھر آپ کس بنیاد پر ان باتوں اور واقعات میں خود کو خواہ مخواہ منصف بنا رہے ہیں۔ ہر وقت گھر میں موجود فرد گھر میں لمحہ بہ لمحہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو زیادہ بہتر اور تفصیل سے جان سکتا ہے یا وہ شخص جو یا تو سیالکوٹ میں رہا اور جب لاہور میں پڑھتا بھی رہا تو ''ریواز ہاسٹل'' میں مقیم رہا[1]۔

''زندہ رود'' میں ایک دوسری جگہ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''انارکلی والے مکان یا میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں اقبال کی دو بھتیجیاں (عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم) بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں' جو یہیں جوان ہوئیں''۔[2]

ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''گھر بھر کا کھانا سردار بیگم پکاتیں اور ان کی مدد اقبال کی بھتیجیاں یا ایک ملازمہ کرتی تھیں''۔[3]

میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''کوٹھی کی پشت پر مصلّیوں (نومسلم) کا محلّہ تھا جن کی لڑکیاں سردار بیگم سے قرآن مجید پڑھنے آتیں' اقبال کی بھتیجیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم سے معمولی اردو پڑھنا لکھنا یا سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں''۔[4]

اسی طرح ایک جگہ اپنی میعادی بخار کی وجہ سے طویل علالت کے متعلق یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''جب راقم (جاوید اقبال) صحت یاب ہو کر بستر سے اٹھا تو بسبب کمزوری اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ سردار بیگم اور رتایا زاد بہن وسیمہ بیگم' جو ان دنوں یہیں مقیم تھیں' کا سہارا لے کر چلتا تھا۔ تب راقم کی عمر تقریباً ساڑھے سات برس اور منیرہ بیگم کی عمر تقریباً ڈیڑھ برس تھی''۔[5]

میری والدہ محترمہ وسیمہ بیگم کا کئی دوسرے واقعات میں ذکر کرنے کے بعد جاوید ماموں نے ان کے متعلق اپنی جو آخری یادداشت دہرائی ہے۔ وہ کچھ اس طرح سے ہے:

''وسیمہ بیگم بھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ سیالکوٹ میں رہنے لگیں''۔[6]

مندرجہ بالا اقتباسات کو یہاں پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میری والدہ واقعتاً ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۴ء تک لاہور میں اپنے عمِ محترم کے زیرِ سایہ پروان چڑھیں' گو میرے خیال میں اس کے لیے جناب جاوید اقبال کی کسی قسم کی تائید کی ضرورت تو نہ تھی کیونکہ میری والدہ، جاوید ماموں سے تقریباً بارہ برس بڑی تھیں اور جاوید کو انہوں نے گود وں کھلایا تھا مگر پھر بھی خواہ مخواہ کے اعتراض کرنے والوں کے لیے شاید یہ ایک تازیانۂ عبرت ثابت ہو۔ میری والدہ مرحومہ کی روایت کردہ باتوں اور واقعات کے لیے کسی کی کسی قسم کی منظوری وغیرہ کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اگر کوئی صاحب بزعم خود خاندانِ اقبال کے ''گاڈ فادر'' بننے کی سعی لاحاصل فرماتے رہے ہیں تو یہ ان کا انفرادی فعل ہے۔ ہمیں ان کی کسی قسم کی کسی تائید یا حمایت کی ضرورت تھی اور نہ ہے...... میری والدہ محترمہ یا میرے والدِ محترم نے جو کچھ اپنی یادداشتوں سے بیان فرمایا' وہ اس کی صحت کے خود ذمہ دار ہیں۔ کسی دوسرے کو اس سلسلے میں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہوں نے جو کچھ بیان کیا' بقائمی ہوش و حواس اور ہر طرح سمجھ سوچ کر کیا۔

اب آیئے ایک نگاہ اس طرف بھی ڈالی جائے کہ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں میری والدہ مرحومہ کے بیان کردہ واقعات کو مصنف ''مظلوم اقبال'' نے جو ''جھوٹ کا پلندہ'' اور ''الف لیلوی کہانیوں'' سے تشبیہ دینے کی کوشش فرمائی ہے' اس میں کس قدر صداقت ہے۔ میرے خیال میں اس طرح خود ان کا اپنا پول کھل گیا ہے کہ وہ جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے متعلق ان کی معلومات سب سے زیادہ مبنی بر صداقت ہیں اور ان کی چھوٹی ہمشیرہ غلط بیانیوں سے کام لے رہی ہیں۔ اگر اس کے جواب میں میری والدہ بھی ان پر یہی الزام لگاتیں کہ سب کچھ انہوں نے اپنے دل سے گھڑا ہے تو ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بالکل درست فرما رہے ہیں...... ان کی تو بنیاد ہی جھوٹ پر ہے' اس لیے ان سے کسی سچ کی توقع عبث ہے۔ اسی لیے تو انہوں نے دل کھول کر اور جی بھر کر دروغ گوئی فرمائی ہے اور اس طرح کے بے بنیاد الزامات لگائے ہیں کہ الامان والحفیظ...... انہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ ان کے عمِ محترم کا کیا مقام ہے اور وہ کس طرح ان کی شخصیت کو داغدار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میری والدہ مرحومہ کو دروغ گوئی سے آخر کیا فائدہ تھا...... مگر یہ تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ اس طرح اپنے ''پیر صاحب'' کا بدلہ عمِ محترم سے دل کھول کر لے رہے ہیں۔

اسی طرح میرے والدِ محترم کے متعلق ان کا جو رویہ رہا تو اس کی بھی کچھ ناگفتنی وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ

تھی کہ میرے والد مرحوم نے ان کی طرف سے بیعت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ تفصیل اس کی کچھ یوں ہے کہ جب میرے والدِ محترم اپنے خاندانی کاروبار کو ناگزیر وجوہات کی بنا پر خیر باد کہہ کر اپنا گھر بھی چھوڑ آئے تو انہوں نے ملازمت کے حصول کے لیے سب سے پہلے مصنف ''مظلوم اقبال'' سے ہی رابطہ کیا۔ چنانچہ انہیں دلّی آنے کے لیے کہا گیا کیونکہ موصوف ان دنوں وہیں مقیم تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر انہیں صرف ایک شرط پورا کرنے کا کہا گیا جس کے بعد ہر قسم کی مدد کا وعدہ کیا گیا اور وہ شرط کیا تھی ..... ایمان کی نیلامی ..... یعنی منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شمولیت ..... میرے والدِ محترم جو بچپن سے ہی ''صوفی صاحب'' کے لقب سے پہچانے جاتے تھے' ایک انتہائی کٹر قسم کے سنّی مسلمان' عاشقِ رسولِ مقبول ﷺ اور فنا فی اللہ کے لیے یہ شرط تو دشنام کے مترادف تھی' چنانچہ وہ اسی وقت واپس چلے آئے۔ شیخ صاحب کو اس ''گستاخی'' کی وجہ سے بے حد غصہ اور رنج ہوا۔ چنانچہ ساری عمر انہوں نے سگے بہنوئی سے دل پر خاش رکھی اور کبھی بھی کسی کام نہ آئے' بلکہ جب میرے والدِ محترم نے اللہ کے فضل سے خود ہی ملازمت تلاش کر لی تو اس میں بھی روڑے اٹکانے سے باز نہیں آئے۔ کیونکہ میرے والد محترم نے جو ملازمت پیر اشوٹ فیکٹری میں حاصل کی تھی' ان دنوں جنگِ عظیم دوم کا زمانہ تھا اور یہاں سیالکوٹ میں ایک بہت بڑی پیر اشوٹ فیکٹری کام کر رہی تھی' وہاں ان کے آفیسر انچارج نہ صرف شیخ صاحب کے دوست بلکہ ہم مذہب بھی تھے۔ دونوں ذاتِ شریف کی اس دوران ملاقات ہوئی تو انچارج صاحب نے شیخ صاحب کو اپنی طرف سے اچھی خبر دیتے ہوئے ان کے بہنوئی کی بڑی تعریف کی اور بتایا کہ عنقریب صوفی صاحب کی بڑی اچھی سی ترقی ہونے والی ہے۔ ان کے سینے پر تو سانپ لوٹ گیا کہ جو شخص ان کی پیشکش کو ٹھکرا آیا تھا' وہ یہاں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے پیر بھائی کو صورتِ حال سمجھا کر ان کو بھی وہی شرط عائد کرنے کا مشورہ دیا کہ پہلے منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شامل ہوں تو پھر ترقی ملے گی۔ مگر ایک دفعہ آزما لینے کے باوجود شاید شیخ صاحب ابھی تک یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ وہ صوفی صاحب کو دنیا کی جھلک دکھا کر رام کر لیں گے۔ مگر یہ ان کی بھول تھی۔ میرے والدِ محترم تو ایک صوفی منش انسان تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی دنیا کو دین پر فوقیت نہیں دی اور نہ کبھی اصولوں پر سمجھوتا کیا ..... اسی بنا پر تو وہ اپنے گھر سے بے گھر ہوئے اور کروڑوں کی جائیداد اور وسیع کاروبار کو جوتے کی نوک سے ٹھوکر ماردی ..... بے چارے شیخ صاحب کی کیا حیثیت تھی کہ چند ٹکوں کے لیے انہیں بہکانا چاہ رہے تھے ..... دنیا کے ایک معمولی سے

فائدے کے عوض ان کے ایمان کا سودا کرنا چاہتے تھے ...... اس عاشقِ رسول ﷺ کو مرتدین میں شامل کرنا چاہتے تھے ...... ان کی یہ مجال، یہ جرأت؟ چنانچہ جب میرے والدِ محترم کو ان کے آفیسر انچارج نے وہ شرط سنائی کہ اگر ترقی

چاہیے تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں، تو صوفی صاحب بتایا کرتے تھے کہ ..... "میرا پارہ ساتویں آسمان کی خبر لانے لگا اور میں نے ان صاحب کو صاف صاف بتا دیا کہ آپ کیا سمجھتے ہیں، اس معمولی سی دنیاوی ترقی کے لیے میں اپنا ایمان بیچ دوں گا اور اس ذاتِ اقدس ﷺ کے خلاف آپ لوگوں کا ہمنوا بن جاؤں گا جس کی خوشنودی کے لیے یہ معمولی سی ترقی کیا چیز ہے، میں تو اپنی پوری دنیا قربان کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں"۔ صوفی صاحب کہتے ہیں کہ "میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کس کے اشارے پر یہ سب کر رہے ہیں۔ میرا پیغام ان کو دے دیجئے کہ صوفی نظیر احمد اس قدر ارزاں اور راستے میں گری پڑی کسی چیز کا نام نہیں کہ جس کا جی چاہے اٹھا کر جیب میں رکھ لے"۔ چنانچہ اس کا اثر معکوس ہوا، ترقی کی بجائے تنزلی ملی مگر صوفی صاحب کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ اس دوسری شکست کے بعد شیخ صاحب تمام زندگی مار گزیدہ کی طرح تڑپتے رہے اور اپنے بہنوئی سے ہمیشہ خدا واسطے کا بیر رکھا اور جناب صوفی صاحب ہمیشہ ان کے لیے مندرجہ ذیل شعرِ اقبالؒ کی زندہ تفسیر بنے رہے۔

تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ!

(بالِ جبریل)

اب رہی یہ بات کہ بقول شیخ اعجاز احمد صاحب "اقبال درونِ خانہ" (حصہ اول) جھوٹ کا پلندہ ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں اس سے پیشتر کہ اس پر اظہارِ خیال کیا جائے بہتر ہوگا اگر "مظلوم اقبال" میں شیخ صاحب کی دو ایک عظیم غلط بیانیوں کا پول کھول دیا جائے تو نہ صرف مناسب رہے گا بلکہ اصلیت کو بے نقاب کرنے میں مدومعاون بھی ثابت ہوگا اور اس ملمع کو اتارنے اور تصنع کے اس پردہ کو سرکانے میں بھی کامیابی ہوگی جس کی آڑ میں یہ تمام مذموم کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ایسی کئی ایک دروغ گوئیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں خاص طور پر وہ واقعہ جو پھوپھی کریم بی بی مرحومہ سے متعلق ہے، جس میں بڑے غیر محسوس انداز میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اپنی دوسری باتوں کو درست ثابت

کرنے کے لیے انہوں نے پھوپھی جی کو ۱۹۶۴ء میں دوبارہ زندہ کر دیا اور ایسا واقعہ ان سے منسوب کر دیا جو اس لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ پھوپھی کریم بی بی صاحبہ ۱۹۵۸ء میں انتقال فرما چکی تھیں۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے:

''میاں جی کی اس خصوصیت کا ذکر میرے حوالے سے روزگارِ فقیر حصہ دوم جو ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا' میں بھی کیا ہے۔ ہماری پھوپھی کریم بی بی نے روزگارِ فقیر میں یہ ذکر پڑھا تو ایک دن مجھے بتلایا''۔[1]

گو مندرجہ بالا واقعہ بالکل بے ضرر سا ہے اور اپنے اندر شاید کوئی ایسی بات پوشیدہ نہیں رکھتا' جس کی بنا پر اسے اس قدر اہمیت دی جاتی کہ اس کا تذکرہ خصوصی طور پر کیا جاتا مگر اس میں جو اصل خواہش پوشیدہ ہے' وہ یہ ہے کہ اپنی دوسری باتوں اور واقعات کو درست ثابت کرنے کے لیے بنیاد فراہم کی جائے۔ اس میں غلطی صرف اتنی ہوئی ہے کہ وقت کے حساب کا دامن تھوڑا سا پھسل گیا اور ۱۹۵۸ء میں فوت شدہ پھوپھی کریم بی بی صاحبہ ۱۹۶۴ء میں ''روزگارِ فقیر'' حصہ دوم میں شامل واقعات پڑھ کر ان پر مہر تصدیق ثبت فرما رہی ہیں۔ اس قسم کے کئی ایک واقعات کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کو دوہرانا مناسب نہ ہو گا' البتہ اب جس دروغ گوئی کا ذکر کیا جا رہا ہے' وہ انتہائی درجہ کی ضرر رساں سازش کا حصہ ہے۔ اس کے پسِ منظر کو کھنگالنے کی شاید ضرورت نہ پڑے' کیونکہ سب کچھ پیش منظر میں ہی واضح ہے اور انتہائی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ کو اس صفائی سے پیش کیا گیا ہے کہ عام آدمی اس کو حرف بحرف سچ سمجھ لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کیونکہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا اپنا خون اس کا راوی ہے۔ انہوں نے علامہ صاحب کو چیلنج کیا کہ ان (علامہ صاحب) کی معلومات بالکل سطحی تھیں اور وہ اپنی عقل استعمال فرمانے کی بجائے دوسروں کے بہکاوے میں آسانی سے آ جایا کرتے تھے اور قادیانیت کے خلاف جو کچھ بھی انہوں نے لکھایا کہا' اُس میں ان کے اپنے مطالعہ یا علم کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ دوسروں نے ان کے کان میں ڈالا اور انہوں نے بغیر سوچے سمجھے دوسروں کے بہکاوے میں آ کر خواہ مخواہ بے چارے قادیانیوں پر چڑھائی کر دی۔ ''مظلوم اقبال'' کا یہ اقتباس قدرے طویل ہے مگر اس کو پورا دیکھنا اشد ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو:

''احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے دنوں میں اخبار کے ایک نمائندے نے ان (علامہ صاحب) کی ۱۹۱۰ء والی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان سے دریافت کیا کہ آپ تو اس فرقہ (قادیانی فرقہ) کو 'اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ' سمجھتے تھے۔ علامہ نے جواب میں اعتراف کیا کہ ۲۵ سال پہلے انہیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی

امیدیں تھیں' لیکن انہیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانی اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔
بانی سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا نہ کوئی احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دوعالم ﷺ سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قرآن کریم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انہیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزو ایمان ہے۔ حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں نے ان کے عشق رسول کو Exploit کرتے ہوئے ان کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی اور علامہ نے اسے درست باور کر لیا۔ اپنی خداداد عقل ودانش کے ساتھ ساتھ علامہ میں ایک ذرا بچوں والی معصومیت اور بھولپن بھی تھا۔ ان معنوں میں کہ وہ سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق یقین کر لیتے۔ اس کی ایک مثال جس نے انہیں ایک بڑی مشکل سے دوچار کیا' مولانا سالک کے ''ذکرِ اقبال'' میں بیان کی گئی ہے۔
۱۹۲۲ء میں کسی حاشیہ نشین نے گپ ہانکی کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد ستالین نام مقرر ہوا ہے۔ علامہ نے باور کر لیا اور بڑے شوق سے یہ ''خبر'' اپنے بڑے بھائی کو خط میں لکھی۔ ۱۹۲۶ء میں کسی ملنے والے سے سنا کہ البانیہ میں مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو کرنا غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ دوسرے نے ترکی میں نماز میں تبدیلیوں کی خبر سنائی۔ تیسرے نے کہا مصر میں بھی ایسی ہی تحریک جاری ہے۔ علامہ ان خبروں سے دل گرفتہ ہوئے اور بڑے افسوس سے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے جواباً اطمینان دلایا کہ خبریں غلط اور بے اصل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا ہوگا کہ احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو (نعوذ باللہ نعوذ باللہ) رسالت مآبؐ سے Superior (برتر) مانتے ہیں۔ علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی اور تحقیق کے لیے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح ایک معتقد نے جو آخری ایام میں ان کے بہت قریب تھے' غلط قصہ گھڑا کہ ''جماعت احمدیہ میں ہر کوئی شامل ہو سکتا ہے خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ احمدیوں کے خلیفہ کی بیعت کر لے''۔ غرضیکہ ان دنوں احمدیت کے خلاف ایسی ایسی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں ان کے حضور بیان کی جاتیں اور باور کر لی جاتیں۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا!"

اتنا طویل اقتباس پیش کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ جس دیدہ دلیری اور چابکدستی سے مرزا غلام احمد قادیانی کا دفاع کیا گیا ہے' وہ کھل کر سامنے آ جائے۔یعنی جو حقیقت ساری دنیا کے سامنے موجود ہے' وہ اس کو غلط ثابت کرنے پر کمربستہ ہیں اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی سعی لاحاصل فرمارہے ہیں۔کون نہیں جانتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی تحریروں اور بیانات میں اس سلسلے میں کیا کچھ نہیں کہا...... ہر بات لوگوں کے علم میں ہے اور اس سلسلے میں بے شمار طویل بحثیں اور مناظرے برپا ہو چکے ہیں لیکن شاید ان کا خیال ہے کہ لوگ ان باتوں کو فراموش کر چکے ہیں اور موجودہ نسل اس سے واقفیت نہیں رکھتی یا شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب متذکرہ تحریریں اور بیانات لوگوں کی دسترس میں نہیں رہے تو یہاں ایک بار پھر ان کے چند اقتباسات پیش کر دیے جاتے ہیں تاکہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ مسلمانوں کے حافظے اس قدر کمزور نہیں' جتنا ان کا خیال ہے۔

سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی اپنی کتاب "تذکرہ" (طبع چہارم) کے صفحہ ۶۴۳ پر خود کو تمام انبیاء کرام بشمول آنحضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے اعلیٰ وارفع ثابت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"آسمان سے کئی تخت اترے گئے مگر تیرا تخت سب سے اونچا بچھایا گیا"۔[1]

اسی طرح "اعجاز احمدی" کے صفحہ ۱۷ پر اپنے آپ کو "آنحضرتؐ سے افضل نبی" قرار دیا۔[2]

"ایک غلطی کا ازالہ" میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

"ایک بروز محمدی جمیع کمالاتِ محمدی کے ساتھ آخری زمانے کے لیے مقدر تھا سو وہ ظاہر ہو گیا۔اب بجز اس کھڑکی کے اور کوئی کھڑکی نبوت کے چشمے سے پانی لینے کے لیے باقی نہیں"۔[3]

مرزا غلام احمد قادیانی کے اس بنیادی نکتہ کی تشریح ان کے صاحبزادے اور خلیفہ ثانی میاں محمود نے مختلف مقامات پر کی ہے۔مثلاً ختم نبوت کے متعلق لکھتے ہیں:

"انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کے خزانے ختم ہو گئے...... ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی قدر کو ہی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ورنہ

ایک نبی کیا' میں تو کہتا ہوں' ہزاروں نبی ہوں گے''۔ (انوارِ خلافت صفحہ:۶۲) [4]

ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ جب آئندہ بھی نبیوں کا آنا ممکن ہے تو پھر آپ مرزا غلام احمد کو آخری زمانے کا نبی کس طرح کہتے ہیں۔ جواب دیا:

''آخری زمانے کا نبی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے توسط کے بغیر کسی کو نبوت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب کوئی نبی ایسا نہیں آ سکتا جو یہ کہے کہ رسول کریمؐ سے براہِ راست تعلق پیدا کر کے نبی بن سکا۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں۔ میری اتباع کے بغیر کسی کو قربِ الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس آئندہ خواہ کوئی نبی ہو' اس کے لیے حضرت مسیح موعودؑ پر ایمان لانا ضروری ہے''۔ (الفضل' قادیان' مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۳ء) [5]

ایک دوسرے مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب کوئی نبی آ جائے تو پہلے نبی کا علم بھی اس کے ذریعے سے ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا اور بعد میں آنے والا نبی پہلے نبی کے لیے بمنزلہ سوراخ ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعے دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں' سوائے اس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا اور کوئی حدیث نہیں سوائے اس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں پیش آئے اور کوئی نبی نہیں سوائے اس کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دکھائی دے۔ اسی طرح رسول کریمؐ کا وجود اس ذریعے سے نظر آئے گا کہ حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اگر کوئی چاہے کہ آپ سے علیحدہ ہو کر کچھ دیکھ سکے تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی قرآن کو بھی دیکھے گا تو وہ اس کے لیے یھدی من یشاء والا قرآن نہیں' یضل من یشاء والا قرآن ہو گا''۔

(خطبہ جمعہ میاں محمود احمد مندرجہ الفضل' بابت ۱۵ جولائی ۱۹۲۴ء) [1]

اس کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جبریلِ امین کے ذریعہ نزولِ وحی کا دعویٰ کیا ہے:

''ظاہر ہے کہ اگرچہ صرف ایک ہی دفعہ کا نزول فرض کر لیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبریل لائیں اور پھر چپ ہو جائیں تو یہ امر بھی ختمِ نبوت کا منافی ہے کیونکہ جب ختمیت کی مہر ہی ٹوٹ گئی اور وحی رسالت نازل ہونی شروع

ہوگئی تو پھر تھوڑا یا بہت نازل ہونا برابر ہے"۔

(ازالہ اوہام۔ صفحہ ۵۷۷)[۲]

مرزا غلام احمد قادیانی ہی نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے میاں محمود احمد بھی برملا ان کی برتری (Superiority) کا اظہار اور اعلان کر رہے ہیں' مگر شیخ اعجاز احمد صاحب پھر بھی اس پر مصر ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کبھی کسی قادیانی نے ارفع و اعلیٰ نہیں سمجھا بلکہ ہمارا ایمان تو ختمِ نبوت پر پکا ہے اور حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے کسی کے بہکاوے میں آ کر بلا تحقیق قادیانی جماعت اور اس کے بانی کو موردِ الزام ٹھہرا دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا تمام دعاوی جو مرزا غلام احمد قادیانی وقتاً فوقتاً فرماتے رہے' علامہ علیہ الرحمۃ کے علم میں نہیں تھے؟ کیا وہ کتابیں جن میں یہ تمام دعاوی اور ان کی تفصیل درج ہوئی ہے' حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی نظر سے کبھی نہیں گزریں؟ جب آج یہ سب دستیاب ہیں اور ہر کس و ناکس ان کے حوالہ جات کے ساتھ بات کرتا ہے تو کیا اس وقت علامہ صاحب نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہوگا اور قادیانیت کے خلاف ایسے ہی آنکھیں بند کر کے سب کچھ ضبطِ تحریر میں لے آئے ہوں گے کہ ان کو ان کے حاشیہ نشینوں نے جو بتا دیا' انہوں نے اس پر آمنا وصدقنا کہہ دیا ہوگا۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ حضرت علامہؒ کے وہ تمام بیانات' مضامین اور اشعار جو ردِ قادیانیت کے سلسلے میں ان سے منسوب ہیں' کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان میں شامل دلائل حیران کن ہیں۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اس قدر مدلل باتیں کی ہیں کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کے دلائل کا کوئی جواب آج تک کسی سے ممکن نہیں ہو سکا۔ علاوہ ازیں ان کے مندرجہ ذیل شعر۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ

نے اس الجھاؤ کو جو قادیانیت (احمدیت) نے پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث تمام مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے' ہر طرح اس کی مکمل تردید کر دی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختمِ نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا؟

"زندہ رود" میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے بھی بڑے مدلل انداز میں شیخ اعجاز صاحب کی جانب سے

اپنے عمِ محترم (علامہ صاحب) پر لگائے گئے بے سروپا الزامات جو انہوں (شیخ اعجاز) نے ایک ''نوٹ''[1] کی صورت میں انہیں (جاوید اقبال) کو بھجوائے تھے' جواب دیا ہے۔ ان الزامات میں اول تو یہ کہ قادیانیوں کے خلاف تحریک میں شدت احراریوں نے علامہ اقبالؒ کے ساتھ مل کر ایک سازش کے تحت کی اور مرزا بشیر الدین محمود کو اس سازش کے تحت کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کروادیا۔[2] اس کے علاوہ حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعویٰ کی تہمت' احراریوں اور علامہ اقبالؒ کے حاشیہ نشینوں نے انہیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی[3]۔

اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اقبال حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا مکمل بیان درج کر رہے ہیں۔ کیونکہ شیخ اعجاز جان بوجھ کر اس بیان کا اصل حصہ حذف کر گئے ہیں۔ ''زندہ رود'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس کے بعد شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور اقبال کے حاشیہ نشینوں نے انہیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی تھی' لیکن افسوس ہے شیخ اعجاز احمد نے اس ضمن میں اقبال کا پورا فقرہ درج نہیں کیا۔ اقبال فرماتے ہیں:

''ذاتی طور پر مجھے اس تحریک کے متعلق اس وقت شبہات پیدا ہوئے جب ایک نئی نبوت' جو بانی اسلام کی نبوت سے بھی برتر تھی' کا دعویٰ کیا گیا اور تمام عالمِ اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کیا گیا۔ بعد ازاں میرے شبہات نے اس وقت مکمل بغاوت کی صورت اختیار کر لی جب میں نے اپنے کانوں سے اس تحریک کے ایک رکن کو پیغمبر اسلام کے بارے میں نہایت نازیبا زبان استعمال کرتے ہوئے سنا''۔[1]

ڈاکٹر جاوید اقبال اسی سلسلے میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

''پس یہ محض احراریوں یا حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے کا نتیجہ نہیں تھا' اقبال کے اپنے کان بھی تھے جنہیں وہ سننے کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے' بقول شیخ اعجاز احمد' بانی سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب ﷺ کی نبوت سے برتر ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہو اور نہ کوئی احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دو عالم ﷺ سے برتر یقین کرتا ہو' مگر کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے میں یہی تو قباحت ہے کہ یوں بعد کی نئی نبوت کی برتری کے اظہار کی طرح ڈالی جا سکتی ہے یا ایسے منفی انداز فکر کے لیے دروازہ کھل جانے کا امکان ہے۔ عین ممکن

ہے کہ شیخ اعجاز احمد یا دیگر احمدیوں کا عقیدہ وہی ہو جو انہوں نے بیان کیا ہے' لیکن جس بد بخت کی باتوں کو اقبال نے اپنے کانوں سے سنا' وہ بھی تو اپنے آپ کو تحریکِ احمدیہ کا رکن ہی سمجھتا تھا''۔[۴]

جاوید اقبال صاحب' شیخ اعجاز احمد کے ان بے بنیاد الزامات کے جواب میں مزید دلائل پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں:

''شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ اقبال اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ بچوں کی طرح معصوم اور بھولے بھالے تھے۔ سنی سنائی بات کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیتے۔ اس ضمن میں انہوں نے اقبال کے بھولپن کی تین مثالیں پیش کی ہیں۔ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ تحریکِ احمدیہ کے عقائد کے متعلق بھی انہوں نے سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیا تھا۔ راقم (جاوید اقبال) کی رائے میں ایک ایسا شخص جو ہندو رہنماؤں یا انگریز حکمرانوں کی سیاسی چالوں کو پوری طرح سمجھتا ہو' جس کی یخ بستہ منطق نے واضح کیا ہو کہ مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ علیحدہ نیابت کے مطالبے کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑیں' جو ایک تجربہ کار وکیل کی حیثیت سے انفرادی یا اجتماعی لین دین کے معاملات میں اپنی فلسفہ دانی یا شاعرانہ تخیل کے باوجود عملی اور کاروباری قسم کا آدمی ہو' اس سے ایسی معصومیت یا بھولپن کی توقع رکھنا یا یہ سمجھنا کہ اس نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے احمدیت کے خلاف بلاوجہ شور مچا دیا' قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اعجاز احمد' اقبال کے تمام سوانح حیات میں غالباً یہی تین مثالیں ان کے بھولپن کی پیش کر سکتے تھے۔ مگر راقم (جاوید اقبال) کے نزدیک یہ مثالیں' اقبال کے بھولپن کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ مثلاً سردار بیگم (والدہ جاوید اقبال) کے ساتھ نکاح کے بعد بعض گمنام خطوں پر ان کا یقین کر لینا اور پھر اپنی غلطی پر پشیمان ہونا' ان کا بھولپن ظاہر نہیں کرتا بلکہ ذہنی اضطراب یا بے چینی کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ ان کی پہلی شادی ناکام رہی تھی اور وہ دوسری بار ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کرتے ہوئے انہوں نے یقین کر لیا کہ روس کا نیا صدر محمد استالین مسلمان ہے۔ اس سلسلہ میں بتا دینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انہیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کمیونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈہ کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈہ سرحدیں عبور کر کے برصغیر میں بھی پہنچا ہو۔ اقبال نے غالباً اسی پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بھائی کو یہ خوشخبری سنائی' لیکن بعد میں تحقیق پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ اسی طرح اس

زمانے میں مغربی پریس دنیائے اسلام میں اس قسم کی غلط خبروں کی تشہیر بطور پالیسی کیا کرتا تھا کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو اڑا دیا یا کسی مسلم ملک میں نماز میں تبدیلیاں کر دی گئیں یا ایسی تحریک دیگر ممالک میں بھی جاری ہے۔ اس پراپیگنڈہ کا مقصد دنیائے اسلام کے حصے بخرے کرنا یا اس میں انتشار پھیلانا تھا اور اس قسم کا طرزِ عمل آج بھی یہود نواز مغربی پریس اختیار کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے ایسی خبروں سے اقبال کا دل گرفتہ ہونا ان کا بھولپن یا معصومیت کا ثبوت فراہم نہیں کرتا' بلکہ ملتِ اسلامیہ کے متعلق ان کی فکرمندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کشمیر کمیٹی میں اقبال اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ احمدیوں کے مخالفین نے جن میں احراری بھی شامل تھے' اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال کو ان کے عقاید کے متعلق بے سروپا باتیں یا غلط قصے گھڑ کر سنائے ہوں'' [1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شیخ اعجاز احمد کس غیر محسوس طریقے سے اپنے اس عمِ محترم کو جس کی وجہ سے ان کو اعلیٰ عہدہ اور مقام ملا' مطعون کرنے کے درپے ہیں اور کس کس طرح ان پر بے بنیاد بہتان تراشتے رہے ہیں۔ ''اقبال درونِ خانہ'' میں مندرج ان بے ضرر واقعات میں جو میری والدہ مرحومہ نے انتہائی معصومیت سے بیان فرمائے اور اپنے بلند منزلت عمِ محترم کے پاس قیام کے دنوں میں جو کچھ دیکھا' من و عن بیان کرنے کی سعی فرمائی' میں تو جھوٹ کی آمیزش نظر آئی اور الف لیلوی قصوں کا گمان گزرا مگر اپنی دروغ گوئیوں اور افترا پردازیوں کا احساس نہیں ہو سکا۔ اس قبیل کے لوگ دوسروں کی آنکھ کے تنکوں کی خبر تو ضرور لیتے ہیں مگر اپنے آنکھ کے شہتیر بھی ان سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ ؎

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر لذتِ گناہ کے لیے

(ضربِ کلیم)

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود

قلبِ خویش از لا تخف محکم کند

(رموزِ بےخودی)

آئینہ ادراک

تیسرا ردِ عمل

نوبت بہ انیجا رسید؟

امید نہیں تھی کہ تیسری بار بھی ردِ عمل کا سامنا کرنا ہوگا۔ مگر کیا کیا جائے ان دشمنانِ قرطاس وقلم کا، جو بلا سوچے سمجھے انکشافاتِ بے بنیاد کا سہارا لینے سے نہیں چوکتے ......؟

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

(بالِ جبریل)

حال ہی میں ایک کتاب ''اگر اب بھی نہ جاگے تو .....'' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا شمس نوید عثمانی کے اس نتیجہ فکر کو جسیم بکڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی نے فروری ۱۹۸۹ء میں مشتہر کیا ہے۔ اپنے مندرجات کی بنا پر یہ خاصی عجیب و غریب حیثیت کی حامل کتاب ہے اور مولانا عثمانی نے بڑے چونکا دینے والے اور ایمان افروز انکشافات اس میں کیے ہیں۔ دورانِ مطالعہ ایک ایسا تاریخی واقعہ بھی پڑھنے کو ملا جس کے پسِ منظر کو اگر بالواسطہ دیکھا جائے تو اس کے واقعات و حقائق کچھ اس انداز سے انہی دنوں میں وقوع پذیر ہونے والے ایک دوسرے واقعہ سے اس طرح منسلک نظر آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو اپنی فکر کی طاقت سے ان تمام واقعات کا ادراک رکھتے ہوئے اور اسرارِ حیات و کائنات کا پردہ چاک کرتے ہوئے ان حقائق کا ذکر اپنے ایک مراسلے میں فرماتی ہے تو کم نظر اور کج فہم لوگ اس کو ایک ''اخباری گپ'' سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس زمانہ ساز اور عظیم شخصیت پر ''بلا تحقیق'' ہر بات کا یقین کر لینے کا بہتان دھرتے ہیں۔ مگر اس تاریخی واقعہ کے تناظر میں جب متعلقہ تحریروں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ چونکا دیتی ہیں بلکہ بصیرت افروز بھی نظر آتی ہیں۔

صورتِ حال کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے تھوڑا سا پس منظر میں جانا پڑے گا۔ گزشتہ صفحات میں حضرت علامہ اقبالؒ کے متعلق ''مظلوم اقبال'' کے حوالے سے یہ بہتان آپ کی نظر سے شاید گزرے ہوں کہ علامہ صاحب سنی سنائی باتوں[۱] پر بلا تحقیق[۲] یقین کر لیا کرتے تھے اور جو بھی کچھ ان کے حاشیہ نشین[۳] ان کے کان میں ڈال دیا کرتے تھے، وہ آنکھیں بند کر کے اس پر آمنا و صدقنا کہہ دیا کرتے تھے[۴] اور ان سب کے ثبوت میں ایک ایسے واقعہ کا سہارا لیا گیا ہے جو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کو ۱۹۲۲ء میں ایک مراسلے میں تحریر کیا تھا۔ بہتر ہو اگر یہاں متذکرہ مراسلہ کا متن دیکھ لیا جائے:

''لاہور ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء

برادرِ مکرم السلام علیکم

اعجاز کے خط سے معلوم ہوا کہ مسہل کے بعد بخار رک گیا ہے۔ الحمد للہ۔ میں آپ کے لیے دعا کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ

آپ کی صحت ضرور اچھی ہو جائے گی۔ میں نے جو نسخہ آپ کو بتایا تھا اس پر ضرور عمل کیے جائیے۔ اس کی بنا محض فلسفیانہ خیالات پر نہیں بلکہ اس انکشاف پر ہے جو خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے قلبِ انسانی کے متعلق مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ اگر بعض خیالات آپ کو افسردہ کر رہے ہیں تو ان کو یک قلم دل سے نکال دینا چاہئے۔ خدا تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات رفع کر دے گا اور برکت نازل کرے گا۔ اگر آپ زندگی سے دل برداشتہ بھی ہوں تو محض اس خیال سے کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے' اپنی صحت کی طرف توجہ کیجئے تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے اس زمانے کا کچھ حصہ دیکھ لیں۔ آج چودہ یا شاید سولہ سال ہو گئے جب مجھ کو اس زمانے کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بار الٰہی اس وقت تک مجھے زندہ رکھ۔ یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی میں نے شاذ ہی دعا مانگی ہو گی۔

آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا ہو گا کہ ترکوں کا قبضہ بغیر جنگ کے اپنے تمام ممالک پر ہو گیا ہے۔ آبناؤں پر ان کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا ہے البتہ یہ اقتدار بعض شرائط کا پابند ہو گا جس کا فیصلہ مجلسِ اقوام کرے گی۔ ترکستان کی جمہوریت کو بھی روس کی گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اسکے صدر غازی انور پاشا ہوں گے۔ اس سے بھی زیادہ معنی خیز خبر یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد ستالین نام ہے۔ لینن جو پہلے صدر تھا' بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا وزیرِ خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے جس کا نام ''قرہ خان'' ہے۔ ان تمام واقعات سے انگریزی پولیٹکل حلقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور ان سب باتوں پر طرہ یہ ہے کہ ایشیا میں ایک لیگ اقوام کی قائم ہونے والی ہے جس کے متعلق افغانی اور روسی گورنمنٹ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت ان سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً اب مسلمانانِ ایشیا کا فرض ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں چندہ کر کے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دیا جائے اور یہ ریل ان تمام ریاستوں سے ہو کر گزرے جو روس کے انقلاب سے آزاد ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز ضرور عمل میں آئے گی۔ باقی خدا کا فضل و کرم ہے جو واقعات رونما ہوئے ہیں' انہوں نے قرآنی حقائق پر مہر لگا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کمزور یا طاقتور نہیں' جس کو اللہ چاہتا ہے طاقتور بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے آن کی آن میں تباہ کر دیتا ہے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال لاہور'' !

اس خط کا تعارف کراتے ہوئے شیخ اعجاز صاحب مصنف ''مظلوم اقبال'' بڑی دور کی کوڑیاں لائے ہیں:

''اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر خط سے ۱۶ سال قبل قیامِ انگلستان کے زمانے میں انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسلام پر اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ ان کے اس بیان کی تائید ان کی ''زمانہ آیا ہے بے حجابی کا'' والی غزل سے بھی ہوتی ہے جو قیامِ انگلستان کے دوران ۱۹۰۷ء میں کہی گئی جو ''بانگِ درا'' میں شائع ہو چکی ہے۔ اسلام کی نصرت اور سربلندی کے لیے ان کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ ''اخباری گپ'' پر بھی یقین فرما لیتے۔ اخباری خبر کہ روس کا صدر ستالین مسلمان ہے اور اس کا نام ''محمد ستالین'' ہے' ''اخباری گپ'' ہی تھی ورنہ واقعتاً یہ بات درست نہ تھی۔ بہر حال ''اسلام پر جلد بہت اچھا زمانہ آنے'' کا ان کا احساس اپنی جگہ درست تھا۔ ان کی حیات میں تو ان کے ''آئینہ افکار میں آنے والے دور کی تصویر دھندلی'' سی تھی لیکن ان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد اس تصویر کے نقوش ابھرنے لگے۔ اسلامی دنیا میں سیاسی انقلاب برپا ہوا۔ ان کا پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں اسلامی ممالک غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہوئے۔ انقلاب کا یہ عمل ابھی جاری ہے۔ سیاسی انقلاب کے علاوہ ایک روحانی انقلاب بھی برپا ہے جس کی طرف ابھی سیاسی دنیا کی توجہ نہیں۔ لیکن قرآن کریم کی پیشن گوئی ''هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ'' پوری ہو کر رہے گی۔ انشاء اللہ۔ !

اس سیر حاصل تبصرے سے یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ شیخ اعجاز احمد صاحب کو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی روشن ضمیری اور اسلام کی سربلندی کے لیے ان کی تڑپ سے کوئی انکار نہیں۔ بلکہ مندرجہ بالا مراسلے میں درج ان تمام پیشن گوئیوں کے وہ دل سے معترف ہیں جو حرف بحرف سچ ثابت ہوئیں مگر انہیں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف ایک بات سے جو ان کے خیال میں ایک ''اخباری گپ'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اتنی مختصر سی تحریر میں حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اس قدر سچی باتیں لکھ دی ہیں۔ اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک بات غلط کیسے ہو سکتی ہے' جسے بنیاد بنا کر ان پر بلا تحقیق ہر بات پر یقین کر لینے کا بہتان لگایا گیا۔ میرے خیال میں یہ صرف اس لیے کیا گیا کہ اس طرح اس قبیل کے افراد اس ایک بات کو زیادہ سے زیادہ اچھال کر اس کے حوالے سے اپنے مطلب کی باتوں میں زیادہ آسانی سے

کامیابی حاصل کر سکتے تھے؟ وگرنہ ان کو بھی یہ احساس یقیناً رہا ہو گا کہ اس قدر روشن ضمیر شخصیت جس کی ہر بات سولہ آنے یعنی حرف بحرف درست ثابت ہو رہی ہے آخر کس طرح 'بلا تحقیق' کوئی بات خود سے منسوب ہونے کی اجازت دے سکتی ہے۔ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کا درج ذیل فرمان اس پر مہر تصدیق کا حکم رکھتا ہے:

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از ناز او ہائے عالم است

(اسرارِ خودی)

اسی پر بس نہیں بلکہ اسی ایک واقعہ کو بنیاد بناتے ہوئے شیخ اعجاز احمد نے اپنی متذکرہ کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اس بہتان کا اعادہ فرمایا ہے اور ''علامہ اقبال اور احمدیت'' کے تحت دلائل جمع فرماتے ہوئے' جس میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ''معصوم'' ثابت کرنے کے لیے بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں اور متذکرہ بالا مراسلے میں درج روسی صدر کے مسلمان ہونے کے واقعہ کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ چونکہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ تحقیق کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے' اس لیے مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق بھی انہوں نے کوئی تحقیق نہیں فرمائی اور جو کچھ ادھر ادھر سے سنا' یا ان کے حاشیہ نشینوں نے زبردستی ان کے کان میں ڈال دیا' اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا اور خواہ مخواہ قادیانیت کے خلاف ہو گئے اور بلا جواز ہی اس کے پرزے اڑا ڈالے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مصنف ''مظلوم اقبال'' کو یہ حسرت بھی رہی کہ علامہ علیہ الرحمۃ نے دوسروں کی بے سروپا باتوں پر یقین کر لیا مگر گھر میں موجود ''عالِم بے بدل'' سے مشورہ نہ فرمایا۔ اس سلسلے میں بے چارے یوں رقمطراز ہو رہے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا ہو گا کہ احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو (نعوذ باللہ' نعوذ باللہ) حضور رسالت مآبؐ سے Superior (برتر) مانتے ہیں۔ علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا' حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی اور تحقیق کے لیے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی''۔[1]

یہی نہیں بلکہ مصنف ''مظلوم اقبال'' حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کو مخاطب کرتے ہوئے شعر کی زبان میں یہاں تک فرما رہے ہیں:

''غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا''۲

حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ کس طرح اپنے متعلق اس قدر خوش گمانی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ ''ردِ قادیانیت'' میں حضرت علامہؒ کے دلائل سے کون آگاہ نہیں۔ صرف اس ایک موضوع پر اب تک بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور علامہ صاحب نے ردِ قادیانیت کے سلسلے میں جو دلائل عالمِ اسلام کے سامنے رکھے تھے' ان کا کوئی جواب آج تک کسی قادیانی سے ممکن نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اب ایک دوسرے طریق سے حضرت علامہؒ کے دلائل کا اثر زائل کرنے کا وطیرہ اختیار کیا گیا ہے کہ علامہ صاحب کو تو درحقیقت ''قادیانیت'' سے کوئی بیر نہیں تھا بلکہ یہ تو ان کے حاشیہ نشینوں نے ان کو خواہ مخواہ قادیانیوں کے خلاف اکسایا اور علامہ صاحب نے ''بلا تحقیق'' اپنے ان حاشیہ نشینوں کی ''بے سروپا'' اور ''لغو'' باتوں کا یقین کر لیا اور بلا جواز دردِ سری مول لے کر انتہائی عرق ریزی فرمائی اور ''ردِ قادیانیت'' میں دلائل اور براہین جمع فرما کر مشتہر کر دیئے کیونکہ ان کی عادت ''بلا تحقیق'' ہر بات پر یقین فرما لینے کی تھی۔ اگر وہ تھوڑی سی تحقیق اس سلسلے میں صرف مصنف ''مظلوم اقبال'' سے فرما لیتے جو گھر میں ہی موجود تھے اور حقیقی بھتیجے کے ناطے ہر وقت ان کی تسلی و تشفی کے لیے بسروچشم حاضر تھے' تو صورتِ حال یقیناً مختلف ہوتی۔

بیا نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نزادے

(ارمغانِ حجاز)

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' میں مصنف ''مظلوم اقبال'' کے متذکرہ بالا الزام کا جس انداز میں جواب دیا ہے' اسے بھی یہاں ایک نظر دیکھ لینا مناسب رہے گا۔

''پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کر کے انہوں نے یقین کر لیا کہ روس کا نیا صدر محمد ستالین مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انہیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کمیونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈہ کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈہ سرحدیں عبور کر کے برصغیر میں بھی پہنچا

ہوئے!

ممکن ہے ڈاکٹر جاوید اقبال کی مندرجہ بالا توجیہ بھی کسی حد تک درست رہی ہو مگر جو اقتباس "اگر اب بھی نہ جاگے تو ......" نامی کتاب، جس کا ذکر شروع میں ہوا، سے یہاں پیش کیا جا رہا ہے، وہ شاید اس سے قبل کبھی بھی اس سلسلے میں دستیاب نہیں ہو سکا کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے اب تک ڈاکٹر جاوید اقبال کے علاوہ شاید ہی کسی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور مصنف "مظلوم اقبال" کے اس بہتان کا اس قدر تفصیلی جواب دیا ہو اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے، کسی نے بھی، بشمول ڈاکٹر جاوید اقبال، اب تک یہ نہیں کہا کہ جس واقعہ کو شیخ اعجاز (مصنف "مظلوم اقبال") ایک "اخباری گپ" قرار دے رہے ہیں، وہ درحقیقت بالکل سچ ہے اور اگر حضرت علامہؒ نے اس کا ذکر اپنے برادر بزرگ کے نام خط میں کیا، تو وہ محض ایک اخباری خبر کی وجہ سے نہیں تھا، گو انہوں نے خود بھی اس کا ذکر اجمالاً انہی الفاظ میں کیا، بلکہ وہ اس کے مکمل سیاق و سباق کا علم رکھتے تھے اور ان دنوں جو کچھ اس سلسلے میں دنیا کے اس حصہ یعنی کمیونسٹ روس میں وقوع پذیر ہو رہا تھا اور عنقریب منصۂ شہود پر آنے والا تھا، کا پورا پورا ادراک یقیناً انہیں اپنے علمِ باطنی کی بنا پر ہو چکا تھا اور وہ محض ایک "اخباری خبر" پر تکیہ کرتے ہوئے اتنی بڑی بات نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اپنے متذکرہ خط میں تحریر کردہ دوسری سچائیوں کے ساتھ ساتھ ایشیا کے ایک عظیم ملک یعنی روس کے مستقبل کے متعلق بھی بالکل صحیح پیش گوئی فرما رہے تھے۔

راز دانِ خیر و شر گشتم ز فقر
زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر

(مسافر)

"اگر اب بھی نہ جاگے تو ......" کا اقتباس جس کا ذکر گزشتہ سطور میں متعدد بار کیا گیا ہے، کو دیکھ لینا اب سود مند رہے گا۔ اقتباس گو خاصا طویل ہے مگر اس کو مکمل دیکھنا بے حد ضروری ہے تا کہ اس کے پس منظر اور پیش منظر سے پوری طرح آگہی حاصل ہو سکے:

"دو زبردست حادثے ا"

تبلیغ میں حکمت کی اتنی زبردست اہمیت قرآن نے کیوں رکھی ہے، اس کے واضح ثبوت تاریخی واقعات میں ہمیں ملتے

ہیں۔اسی صدی میں دو موڑ تاریخ میں ایسے آچکے ہیں جب مسلمانوں کے حکمتِ عملی سے کام نہ لینے سے غیر مسلمین کی حکمتِ عملی کامیاب ہوئی اور دونوں مرتبہ کروڑوں کی تعداد میں پوری پوری قومیں اسلام میں داخل ہوتے ہوتے لوٹ گئیں۔ان دونوں زبردست حادثوں میں سے ایک کا تعلق روس سے اور دوسرے * کا ہمارے ملک ہندوستان سے۔

روسی کمیونسٹ انقلاب کے رہنما کامریڈ لینن تمام مذاہب عالم کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام سے بہت متاثر ہوئے تھے اور روسی عوام کے قبولِ اسلام کی خواہش رکھتے تھے۔ان کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ ان کی اسلام سے دلچسپی ایک بزرگ ''بقرا خان''[۲] سے ملاقات کا نتیجہ تھی جن سے وہ کافی متاثر ہوئے تھے اور جن کے فیضِ صحبت کا لینن پر بہت اثر تھا۔بہر حال لینن نے کوشش کی لیکن علمائے مصر کی لاعلمی و غیر دانش مندی اور برطانوی حکومت کی حکمتِ عملی سے یہ زریں موقع ضائع ہو گیا۔

اس سانحے کی تفصیلات ایک ہندوستانی کمیونسٹ لیڈر نے بیان کی ہیں' جن کے لینن سے ذاتی تعلقات تھے۔محمد عبداللہ ریٹائرڈ آئی۔اے۔ایس کی زبان میں سنیے:

''ایم این رائے (M. N. Roy) ہندوستان کے معروف لیڈر تھے اور ۲۸۔۱۹۲۱ء کے درمیان وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل روس کے فعال کارکن تھے۔جرمنی' فرانس اور چین کے مزدوروں کی تحریک میں انہوں نے اہم خدمات انجام دیں۔لینن سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور انہیں کے ایک ساتھی اور ہندوستانی نے اس وقت کے سیاسی حالات کے تحت ہندوستان چھوڑ کر روس میں پناہ لی تھی۔ان سے بھی لینن کے ذاتی تعلقات تھے۔انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لینن کی اسلام سے دلچسپی اور عقیدت کے بارے میں جو صراحت کی' وہ قابلِ ملاحظہ ہے:

''زارِ روس کے دور کے خاتمے پر جب لینن برسرِ اقتدار آئے اور انہوں نے کمیونسٹ حکومت قائم کر لی تو ایک دن اپنے قریبی دوستوں کی میٹنگ طلب کی اور اس میں انہوں نے فرمایا:

''ہم اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اس کو برقرار رکھنے اور اس کو چلانے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہم ایسے نظریہ حیات کو اپنائیں جو انسانی فطرت کے مطابق ہو' اس لیے کہ انسان کو اپنی بقا کے لیے صرف روٹی نہیں چاہیے بلکہ اس کی روح کی تسکین کے لیے ایک مذہب کی بھی ضرورت ہے۔میں نے تمام مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔میرے نزدیک سوائے ایک مذہب کے کسی اور میں یہ صلاحیت نہیں ہے جو ہمارے نظریہ کمیونزم کا

ساتھ دے سکے۔ اس لیے میں ابھی اس مذہب کا نام ہی بتلاؤں گا۔ اس بارے میں رائے قائم کرنے میں آپ جلدی نہ فرمائیں اس لیے کہ یہ سوال کمیونزم کی موت اور حیات کا ہے۔ آپ وقت لیں اور غور کریں۔ ہوسکتا ہے میں غلطی پر ہوں لیکن ہمیں اپنے تصفیہ کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ "اسلام" ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے مادّی رجحانات میں کمیونزم پر پورا اترتا ہے"۔

یہ سن کر مجمع میں شور ہونے لگا تو لینن نے ٹھنڈے دل سے پھر غور کرنے کی ہدایت دی کہ آج سے پورے ایک سال کے بعد ہم پھر ملیں گے اور اس وقت طے کریں گے کہ کمیونسٹ کو کوئی مذہب اختیار کرنا چاہئے! اور کون سا؟"

برطانوی حکومت کے محکمہ خارجہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے اس میں برطانوی سلطنت کے لیے بڑا خطرہ محسوس کیا کہ اگر کمیونزم اور اسلام مل جائیں تو روس کو برطانیہ پر ایک ناقابلِ تسخیر قوت اور فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ فوری انہوں نے ایک مسئلہ کھڑا کیا.....

(کیا) "اسلام کے لیے مارکسزم جیسا خدا سے منحرف اور ملحدانہ نظریہ قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟"

علمائے ازہر نے جو اس سوال کے پس منظر سے واقف نہ تھے' ایسا فتویٰ صادر کر دیا جو برطانوی حکومت چاہتی تھی۔ یہ فتویٰ طبع کروا کر دنیا کے کونے کونے میں تقسیم کروا دیا گیا۔ حتیٰ کہ روس کے اسلامی علاقوں میں اس فتوے کی کاپیاں ابھی تک بعض مسلمانوں کے پاس ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا علم لینن کو ہوگیا۔ انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا اور کہا......

"میں سمجھتا تھا کہ مسلمان سمجھدار ہوں گے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ بھی اور مذاہب کی طرح بڑے کٹر اور دقیانوسی ہیں"۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکیم دھری کی دھری رہ گئی اور اس کے مخالفین نے اطمینان کا سانس لیا"۔!

آپ نے حیران کن مماثلت ملاحظہ فرمائی کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے ۱۹۲۲ء میں جب روس کے صدر کے متعلق اطلاع اپنے برادرِ بزرگ کو پہنچائی تو اس وقت یا تو یہ تمام واقعات کمیونسٹ روس میں وقوع پذیر ہو چکے تھے یا بہت جلد منظر عام پر آنے والے تھے اور یقیناً علامہ علیہ الرحمۃ اچھی طرح ان کے نتائج سے آگہی رکھتے تھے۔ اسلام اور کمیونزم میں جو نیا تعلق پیدا ہونے والا تھا' وہ ان کی دوررس نگاہوں میں تھا۔ مصنف "مظلوم اقبال" اور دوسرے "اکابرین"

نے اگر اپنی عقلِ ناقص کی بنا پر اس کو محض ایک ''اخباری گپ'' سے تعبیر کیا تو یہ ان کا اپنا قصور تھا' ورنہ اقبالؒ نے تو برملا فرمادیا۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

(بال جبریل)

کمیونسٹ روس کے من حیث القوم قبولِ اسلام کے متذکرہ واقعہ پر کسی اظہار خیال کا شاید یہ مناسب وقت اور موقع نہیں کیونکہ اس کے فوائد و علل پر بحث اب محض ''لکیر پیٹنے'' کے زمرے میں آئے گی۔ مندرجہ بالا طویل اقتباس کو یہاں پیش کرنے کا واحد مقصد حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی اس بہتان سے بریّت ہے جس کے ذریعے انہیں ''بلا تحقیق'' ہر بات کا یقین کر لینے والا ثابت کیا جا تا رہا ہے۔ اب یہاں دلچسپ صورتِ حال یہ پیدا ہو چکی ہے کہ مندرجہ بالا بہتان کو ہوا دینے والوں' جن میں مصنف ''مظلوم اقبال'' پیش پیش نظر آتے ہیں' نے خود کسی تحقیق کی کوشش نہیں فرمائی اور ''بلا تحقیق'' ایک اظہر من الشمس حقیقت کو ''اخباری گپ'' قرار دیتے ہوئے حضرت علامہ علیہ الرحمۃ جیسی ہستی پر بے بنیاد بہتان تراشی کے مرتکب ہوئے ہیں تاکہ قادیانی جماعت اور اس کے بانی کے حق میں زمین ہموار کر سکیں اور یہ ثابت کرنے کی سعی لا حاصل فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ علامہ علیہ الرحمۃ نے ''قادیانیت'' کے خلاف جو تحقیق فرمائی اور جو دلائل امتِ مسلمہ کے سامنے رکھے' وہ سب بلا جواز تھے کیونکہ انہوں نے ''بلا تحقیق'' محض اپنے چند ''حاشیہ نشینوں'' کی بے سروپا باتوں پر یقین کر لیا اور خوامخواہ قادیانیت کے ڈھول کا پول کھول دیا جس کی وجہ سے بے چارے قادیانیوں کے بہت سے رازہائے درونِ خانہ طشت ازبام ہو گئے ورنہ اگر علامہ علیہ الرحمۃ تھوڑی سی تحقیق فرمانے کے عادی ہوتے تو ایسی صورتِ حال کبھی پیدا نہ ہوتی؟ یا عجب!

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ جو ایک اعلیٰ پائے کے قانون دان اور محقق تھے' شاید ہی کوئی بات بلا تحقیق کہنے' سننے یا لکھنے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اپنی پوری حیاتِ مستعار میں انہوں نے صرف ایک کام ہی تو کیا اور وہ تھا ''تحقیق'' ...... علم کی تحقیق' قانون کی تحقیق' مذہب کی تحقیق' سیاست کی تحقیق' زبان کی تحقیق آخر کس کس کا ذکر کیا جائے ...... اگر ان کی پوری زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی جائے تو ان کا تو اوڑھنا بچھونا ہی یہی تھا۔ اس لیے اگر

ان کی سیاسی، سماجی، ادبی یہاں تک کہ انفرادی حیثیت کا تصور کیا جائے تو ان سے کسی قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا احتمال عبث ہے۔ میرے خیال میں ان کے متعلق اس قسم کے سطحی اور بے جا الزامات کا سہارا لے کر ان کی عظیم شخصیت کو داغدار بنانا کسی طور ممکن نہیں اور اب جب کہ ان عاقبت نا اندیشوں کی سازش بے نقاب ہو چکی ہے تو یہ کہنا کسی طور بے جا نہ ہوگا کہ حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنی حیات میں کبھی بھی کوئی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کہی بلکہ ہمیشہ ہی اپنی ہر بات اور عمل کے لیے پورے پورے دلائل فراہم فرمائے۔ جو اصحاب فراست صرف ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر ان کی شخصیت کو متنازعہ بنانے کے درپے تھے، اب اس واقع کے بالکل سچ ثابت ہو جانے کے بعد یقیناً مستقبل میں اس قسم کی قبیح حرکت سے گریز کریں گے۔ خداوند کریم عقل کے ان اندھوں کو "عقلِ سلیم" سے نوازے اور آئندہ محتاط رہنے کی توفیق ارزاں فرمائے۔

کیا یہ تمام حقائق علامہ علیہ الرحمۃ کی فراست اور روشن ضمیری کی ایک زندہ مثال کے ساتھ ساتھ ان کے اس فرمان کی تفسیر ثابت نہیں ہو رہے۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

(بانگِ درا)

"دوسرا حادثہ"

گزشتہ صفحات پر دو حادثوں میں سے پہلے کا تفصیلی ذکر آپ نے دیکھا۔ آیئے اب دوسرے حادثے کی عبرت نشانی ملاحظہ کریں:

متذکرہ کتاب "اگر اب بھی نہ جاگے تو......" کے مصنف مولانا شمس نوید عثمانی رقمطراز ہوتے ہیں:

"اب غیر مسلمین کی کامیاب حکمتِ عملی کی ایک دوسری مثال دیکھیے جس کا تعلق ہندوستان سے ہے:

یقین کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر جو ہریجنوں اور ہندو پس ماندہ ذاتوں کے سب سے مقبول رہنما تھے، ہندوستان کی پوری ہریجن آبادی کے ساتھ اسلام قبول کرنے کے خواہش مند تھے۔ گاندھی جی کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر امبیڈکر سے پوچھا کہ تم کون سا اسلام قبول کرنا چاہتے ہو۔ شیعہ مسلمان والا یا سنّی مسلمان والا۔ اگر شیعہ ہونا چاہو تو

ان میں بہت سے مذہبی فرقے ہیں۔ کس فرقے کا اسلام قبول کرو گے؟ اور اگر سنّی ہونا چاہتے ہو تو ان میں بھی بہت سے مذہبی فرقے ہیں۔ دیوبندی، بریلوی، وہابی وغیرہ اور ان سب میں آپس میں ایسی ہی نفرت ہے کہ ایک دوسرے کو داخلِ اسلام نہیں مانتے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اس گفتگو کے بعد اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور کہا کہ میں سمجھتا تھا کہ اسلام میں ذات پات نہیں ہوتی اور اسی لیے میں اس مذہب کو پسند کرتا تھا۔

یہ وہ عبرت کی داستانیں ہیں جن کی سیاہی ابھی تاریخ کے صفحات میں خشک بھی نہیں ہونے پائی ہے"۔!

باب ہفتم

نوادر

۱۔ فہرست کتب

علامہ اقبال کی استعمال کردہ درسی کتب

۲۔ دیگر اشیاء

جو علامہ اقبالؒ کے استعمال میں رہیں

۳۔ دیباچہ مثنوی رموزِ بے خودی

۴۔ دیباچہ تاریخِ سیالکوٹ از محمد دین فوق

فہرست کتب

علامہ اقبالؒ کی استعمال کردہ درسی کتب

حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے سکول اور کالج کے زمانے میں جو درسی کتب استعمال فرمائیں' ان میں چند ابھی تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے اکثر پر انہوں نے اپنا نام اور نوٹ وغیرہ درج کیے ہیں۔ ان کا ذکر اس سے قبل ''درونِ خانہ'' (حصہ اول) میں اجمالاً کیا جا چکا ہے۔ مگر اس وقت ان کی مکمل فہرست شامل کتاب نہ کی جا سکی۔ یہاں ان کی ایک تفصیلی فہرست شامل کی جا رہی ہے۔ یہ کل ۲۱ کتابیں ہیں جن میں ماسوا دو کے باقی تمام انگریزی زبان میں ہیں۔

Name Of The Book	Author's Name	Year Of Publication
1. Lectures of the Origin and Growth of Religion.	F. Max Muller, K. M.	1891
2. Life And Time Of Oliver Goldsmith	John Forster	1890
3. Longman's School Composition.	David Salmon	1892
4. English Composition	William Davidson & Joseph Crosby Allock	1885
5. Children's Treasury of Lyrical Poetry	Francis Turner Palgrave	1888

6. Learned Men's Part I & II.	G. Washington Moon	1892
7. Lord Lawrence	Sir Richard Temple	1892
8. The Rise of The British Dominion In India	Sir Alfred Lyall	1898
9. The Tragedy of King Richard II	Shakespeare	1893
10. Lives of Indian Officers	Sir J. N. Kaye	1889
11. Summary of Ransome's Short History of England		1899
12. A Grammar of the English Language	T. D. Morell	-
13. Euripides Vol.I	Rev. R. Potter	1832
14. Euripides Vol. III	Rev. R. Potter	1832
15. Reading In Poetry	-	1881
16.Selection From Tennyson	F. J. Rowe & W. T. Webb	1876
17. The Royal Readers		1886

18.	Theory Of Morals	Paul Janet	1884
19.	The Euphrates And The Tigres		1884
20.	احسن القواعد		1893
21.	کلیاتِ سودا		-

مندرجہ بالا تمام کتابوں پر حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے اپنے دستخط مع رول نمبر' کلاس' سکول اور تاریخ ثبت فرمائے ہیں۔یہ کتابیں نویں جماعت سے لے کر سولھویں جماعت (M. A.) تک آپ کے زیرِ مطالعہ رہیں۔کئی ایک کتابوں کے حاشیوں پر بے حد باریک پنسل سے نوٹس بھی لکھے گئے ہیں۔ان میں سب سے پرانی کتاب ۱۸۳۲ء اور سب سے نئی ۱۸۹۹ء کی شائع شدہ ہے۔

چند دیگر اشیاء

جو علامہ اقبالؒ کے استعمال میں رہیں

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کی استعمال کردہ چند اشیاء جو ابھی تک محفوظ ہیں، کی تفصیل درج ذیل ہے:

لیمپ

یہ لیمپ مٹی کے تیل سے جلتا ہے اور دوہری چمنی والا ہے۔ گلوب نما چمنی رات کو سوتے وقت تیز روشنی کو ڈھانپنے کے کام آتی ہے۔ اس میں دو بتیاں ہیں۔ تیل ڈالنے کی جگہ بھی شیشے کی بنی ہوئی ہے۔ سیاہ رنگ کا خوبصورت سٹینڈ اس کی روشنی خاصی بلندی تک لے جانے میں معاونت کرتا ہے۔

ڈیسک

یہ ڈیسک زمین پر بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کے لیے ہے۔ بڑی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ پائے بڑے خوبصورت ہیں۔ کتابیں وغیرہ رکھنے کے لیے دراز بھی موجود ہے۔

برتن

دو عدد برتن جن میں ایک خوبصورت چینی کا بڑا پیالہ اور دوسرا بھی چینی کا بنا ہوا امرتبان۔

دیباچہ رموزِ بے خودی

''مثنوی رموزِ بیخودی'' ۱۹۱۸ء میں شائع کی گئی ۔ یہ حضرت علامہؒ کے فارسی کلام کی دوسری کتاب تھی۔ اس سے پہلے ۱۹۱۵ء میں ''مثنوی اسرارِ خودی'' شائع ہو چکی تھی ...... جو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے فارسی کلام کا اولیں مجموعہ تھا۔ ''مثنوی رموزِ بیخودی'' کا یہ پہلا ایڈیشن چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحات پر مشتمل تھا اور ۱۴۰۰ کی تعداد میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ ایڈیشن اب تقریباً نایاب ہے۔ اس اولیں ایڈیشن کا یہ نسخہ جو راقم الحروف کی تحویل میں ہے۔ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے میاں جی ! کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اس پر شیخ عطا محمد مرحوم (برادر بزرگ اقبال) نے دو تین جگہ دستخط ثبت فرمائے ہیں اور کئی ایک مقامات پر اغلاط لگائی ہوئی ہیں۔

اس مثنوی کا دیباچہ بھی حضرت علامہ کا لکھا ہوا ہے جو صرف دو صفحات پر مشتمل ہے۔ ''مثنوی اسرارِ خودی'' میں تو احساسِ نفس کے نشوونما پر زور تھا مگر ''مثنوی رموزِ بیخودی'' میں قومی و ملی انا کو قائم رکھنے کے اسرار و رموز کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیباچہ گو انتہائی مختصر ہے مگر کوزے میں دریا بند کرنے کے مترادف ہے جس میں انتہائی مؤثر انداز میں قوم کو راہ مستقیم دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس دیباچے کا مکمل متن تبرکاً درج ذیل ہے:

دیباچہ مثنوی رموزِ بیخودی

از ڈاکٹر محمد اقبال

یہ مثنوی کسی طویل الذیل دیباچے کی محتاج نہیں، تاہم اس کے مقاصد کی ایک مختصر تشریح ضروری ہے۔ جس طرح حیاتِ افراد میں جلبِ منفعت دفع مضرت تعیین عمل و ذوق حقائق عالیہ احساس نفس کے تدریجی نشوونما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے، اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حیات و اعمال کو مربوط کر کے ''قومی انا'' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے۔ علم الحیات و عمرانیات کے اسی نکتے کو مدِنظر رکھ کر میں نے ملّتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مختلف اجزاء و عناصر پر نظر ڈالی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امّتِ مسلمہ کی حیات کا صحیح ادراک اسی نقطۂ نگاہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسی مختص الہئیت جماعت کا انحطاط زائل کرنے اور اس کی زندگی مضبوط و محکم کرنے کے عملی اصول کیا ہیں؟ اس سوال کا مجمل جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آ چکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہئے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ اسی سوال کا تفصیلی جواب ہو گا۔

استاذی حضرت قبلہ مولانا مولوی سید میر حسن صاحب دام فیضہم پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اور مولانا شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ و اجلالہ میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں بزرگوں سے بعض اشعار کی زبان اور طرزِ بیان کے متعلق قابلِ قدر مشورہ ملا۔ علیٰ ہٰذا القیاس اپنے احباب میر نیرنگ، میرزا اعجاز اور مولانا عمادی کا بھی سپاس گزار ہوں کہ بعض مطالب کی تحقیق میں ان سے بھی مدد ملی۔

محمد اقبال

دیباچہ تاریخِ سیالکوٹ

تاریخ سیالکوٹ کا یہ قدیم ترین نسخہ جو ۱۹۲۴ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا میرے دیرینہ دوست جناب ریاست علی چوہدری کی تحویل میں ہے۔ اس کا دیباچہ حضرت علامہ اقبالؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور علامہ عبد الحکیم سیالکوٹیؒ علیہ الرحمۃ کو اس میں علامہ مرحوم نے بڑے شاندار الفاظ میں ہدیہ تبریک پیش کیا ہے۔ چوہدری صاحب نے متذکرہ دیباچہ کی ایک کاپی اپنے وضاحتی نوٹ کے ساتھ بھجوائی ہے جسے شکریہ کے ساتھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

''علامہ عبد الحکیم علیہ الرحمۃ

عہدِ مغلیہ میں کشمیر سے دو بھائی ملا کمال الدین کشمیری اور ملا جمال الدین کشمیری سیالکوٹ تشریف لائے اور یہاں درس و تدریس کا سلسلہ ایک مسجد میں شروع کیا۔ ملا کمال الدین کشمیری بہت بڑے عالم تھے۔ ان کے بے شمار شاگردوں نے بڑا نام پیدا کیا جن میں:

۱۔ سعد اللہ چنیوٹی۔ یہ شہنشاہ شاہجہان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

۲۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ۔ شہرہ آفاق شخصیت۔

۳۔ ملا عبد الحکیم سیالکوٹیؒ۔

یہ تینوں ہم جماعت تھے اور انہوں نے ایک ساتھ ملا کمال الدین کشمیری سے فیض حاصل کیا۔ علامہ اقبالؒ علماء؛ مشائخ کرام اور مجذوبوں سے مل کر روحانی تسکین حاصل کرتے تھے۔ ان ملاقاتوں کا ذکر علامہ اقبالؒ نے اپنے دوستوں سے خطوط میں بھی کیا ہے۔ ملا عبد الحکیمؒ سیالکوٹیؒ کے مزار پر انوار پر علامہ اقبالؒ کی حاضری کا ذکر کسی بھی مصنف نے نہیں کیا۔ حالانکہ علامہ اقبالؒ کو اس برگزیدہ ہستی سے بے پناہ عقیدت تھی۔ وہ قیامِ سیالکوٹ کے دوران ان کے مزارِ اقدس پر حاضری دیتے رہے اور بعد میں جب کبھی لاہور سے سیالکوٹ آنا ہوتا تو لازماً حاضری دیتے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے عزیز دوست محمد دین فوقؔ، جو سیالکوٹ ہی کے رہنے والے تھے، کی کتاب ''سوانحات علامہ

عبدالحکیمؒ سیالکوٹی وتواریخ سیالکوٹ'' جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی' کا دیباچہ تحریر کیا جس میں مولانا عبدالحکیم کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

دیباچہ

(از ڈاکٹر سر محمد اقبال)

مولوی عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے جو شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں اسلامی علوم کی ایک مشہور درسگاہ تھی۔ ان کی عالمگیر شہرت آخر شاجہان تک پہنچی جس نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ دربار دہلی میں بادشاہ کے اشارہ سے بڑے بڑے معرکتہ الآراء مذہبی اور فلسفیانہ مباحث ہوا کرتے تھے جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نکتہ آفرینیاں اور موشگافیاں وسطِ ایشیا اور ایران کے حکماء کو محوِ حیرت کیا کرتی تھیں۔

ان کی فلسفیانہ تصانیف میں "سیلکوتی علی التصورات'' ایک مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی کتابیں ہیں جو اسلامی ممالک میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ توحیدِ باری تعالیٰ پر بھی ان کا ایک خاص رسالہ جو شاجہان کی فرمائش سے لکھا گیا تھا' میری نظر سے گزرا ہے۔ مگر غالباً آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصہ اب تقویم پارینہ ہے لیکن اسلامی فلسفہ کا مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب اب تک ان کی یادگار ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کا مزار جو تالاب کے قریب ہی واقع ہے' نہایت کسمپرسی کی حالت میں اہل سیالکوٹ کی بے حسی اور مردہ دلی کا گلہ گزار ہے۔

منشی محمد الدین صاحب فوقؔ نے جن کی تاریخی کرید مشہور ہے' مولانا مرحوم کے حالات زندگی لکھ کر ملک وقوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔

اس رسالہ میں ضمناً سیالکوٹ شہر کے تاریخی حالات بھی ہیں جو نہایت تجسس اور تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں۔ اہلِ سیالکوٹ کو ان حالات سے بالخصوص دلچسپی ہو گی۔

۳ دسمبر ۱۹۲۴ء   محمد اقبال

حضرت علامہ علیہ الرحمۃ کے قلم سے نکلی ہوئی اس منفرد تحریر کو جس میں انہوں نے سیالکوٹ کے عالم بے بدل مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے' کو یہاں من و عن شامل کرنے کا اصل مقصد اس کو محفوظ کرنا ہے کیونکہ شاید ہی کتاب مذکورہ بالا یعنی ''سوانحاتِ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی و تواریخِ سیالکوٹ'' کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں دستیاب ہو سکے۔

اشاریہ

مآخذ